تحدیثِ نعمت

آپ بیتی

حضرت مولانا محمد منظور نعمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ

ترتیب
عتیق الرحمٰن سنبھلی نعمانی

ناشر
قریشی پبلشرز ۱۰ الکریم مارکیٹ اردو بازار لاہور

کتابت ——— ظہیر احمد کاکوروی مرحوم و خلیل احمد لکھنؤ
طباعت ——— اشتیاق پریس
صفحات ——— ۳۵۲
ناشر ——— قریشی پبلشرز

قیمت -/

فہرست مضامین وعنوانات

عرضِ مُرتب

(طبع اول اپریل ۱۹۹۰ء)

والد ماجد (حضرت مولانا محمد منظور نعمانی) مدظلہ نے آج سے کوئی بائیس سال پہلے ایک سلسلۂ مضامین "تحدیثِ نعمت" کے عنوان سے الفرقان میں شروع فرمایا تھا۔ یہ کتاب کچھ اضافے کے ساتھ اُنہی مضامین کا مجموعہ ہے۔

مضامین کا یہ سلسلہ بیشتر اُن اہم دینی شخصیتوں کے تذکروں پر مشتمل تھا جنکو حضرت مصنف مدظلہ نے پایا اور جن سے مخلص عقیدت کے ساتھ انکی وہ شفقتیں اور عنایتیں بھی آپکے حصے میں آئیں جنہیں آپنے اللہ کی خاص خاص نعمتیں جانا۔ شخصی تذکرے عموماً دلچسپی سے پڑھے ہی جاتے ہیں۔ خاص کر جبکہ یہ اشخاص اپنے وقت کے مشاہیر اور دینی وعلمی یا سیاسی اعتبار سے اہمیتوں کے مالک ہوں۔ اور جنکے تذکروں سے ایک گزرے ہوئے دور کی تاریخ سامنے آجاتی ہو۔ یہ تذکرے اسی نوعیت کے تھے۔ اور اسی لئے بڑی دلچسپی سے پڑھے جاتے رہے بعض تذکروں میں اتفاق سے اس صدی کی ہماری سیاسی تاریخ کے کچھ ایسے صفحات بھی قلمبند ہوگئے۔ جو اس سے پہلے کسی سیاسی تاریخ یا تذکرے میں نہ پڑھے گئے ہوں گے۔

غرض یہ سلسلۂ مضامین اپنے مختلف پہلوؤں سے ایسا تھا کہ تکمیل کے بعد جلد از جلد کتابی شکل میں شائع ہوتا۔ مگر اب جبکہ پورے پندرہ سال ہوچکے ہیں۔ تب کہیں نوبت آرہی ہے کہ انکی کتابی شکل سامنے آئے۔ لیکن یہ کتابی شکل جن اضافوں کے ساتھ انشاء اللہ سامنے آرہی ہے اُن سے امید ہے کہ اس تاخیر کی تلافی ہوجائیں گے۔

تاخیر کا سبب یہ سلسلۂ مضامین ربیع الاول ۱۳۹۳ھ [illegible] ۱۹۷۳ء کے الفرقان سے شروع ہوا تھا۔ اور بالعموم لمبے لمبے ناغوں کے بعد نکلتا ہوا شوال ۱۳۹[illegible]

اگست ۱۹۸۱ء پر رک گیا۔ حالانکہ ابھی بعض شخصیتیں باقی تھیں جنکا تذکرہ حضرت مصنف مدظلہٗ کرنا چاہتے تھے۔ لیکن دوسرے زیادہ اہم تقاضوں نیز عوارض و حالات کے زیرِ اثر یہ ممکن نہیں ہو سکا۔ اور انھیں حالات و عوارض اور زیادہ اہم تقاضوں نے اس کا بھی موقع نہیں دیا کہ جتنا کچھ لکھا جا چکا تھا اسی کو کتابی شکل میں لانے کی طرف توجہ کی جاتی حتیٰ کہ صحت کے عوارض و اعذار کی بنا پر جب ایک جبری فرصت کی کیفیت مشیتِ الٰہی سے ہو گئی تو (کوئی چار سال قبل) اس طرف توجہ ہوئی کہ تحدیثِ نعمت کا یہ سلسلہ مضامین کتابی شکل میں آ جائے۔ اور اسکا کچھ ابتدائی حصہ روک کر باقی کو کتابت کیلئے بھی دیدیا گیا۔

ابتدائی حصہ اسلئے روکا گیا تھا کہ اس میں کچھ اضافہ کی ضرورت محسوس ہوئی تھی۔ اور باوجود باقی تمام حصے کی کتابت ہو جانیکے بعد بس یہ اضافے کا مسئلہ ہی تاخیر کا باعث بن گیا۔ اسلئے کہ صحت کے عوارض اس درجہ پر پہنچ گئے تھے کہ یہ کام خود کرنا ممکن نہیں رہا تھا اور کوئی موزوں معاون دستیاب نہیں تھا۔

اب سے دو سال قبل نومبر ۱۹۹۰ء میں راقم السطور کا آپ کی خدمت میں کچھ وقت گزارنے کیلئے لندن سے آنا ہوا تو اس کام کی ضرورت سامنے آئی۔ اور بنام خدا آپکی ہدایات اور ارشادات کی روشنی میں اسکی انجام دہی کا سلسلہ شروع کیا۔

اپنے خیال کی حد تک اس کام کو تکمیل تک پہنچا دیا گیا تھا۔ اتنی کسر بس رہ گئی تھی کہ حضرت مصنف مدظلہٗ اپنی کمزوری کی وجہ سے راقم السطور کی موجودگی میں نگاہ نہیں ڈال سکے تھے۔ تاہم یہ امید تھی کہ انشاء اللہ آئندہ حاضری سے پہلے یہ کتاب طبع ہو جائے گی۔ مگر یہ نہیں ہو سکا۔ اسلئے کہ بعض جگہوں پر آپ نے بات کی ادائیگی اپنی مرضی کے مطابق نہیں پائی تھی۔ اور مرضی کے مطابق ترمیم کی کوئی کوشش اگر اس دوران میں کسی اور ذریعہ سے ہوئی تو وہ آپ کیلئے اطمینان بخش نہ ہو سکی۔ اسلئے کہ ضعف اور خاص طور سے گویائی کے ضعف کیوجہ سے آپ اپنی مطلوبہ شکل و اظہار پوری طرح نہیں فرما سکتے تھے۔

بہر حال یہ کام معلق ہی رہا حتی کہ اب جنوری ۱۹۷۱ء میں دوبارہ حاضری ہوئی۔ تو پھر خود غور کر کے آپکی مرضی کو سمجھنے کی کوشش کی۔ اور الحمد للہ کہ اب جس شکل میں وہ ترمیم طلب مقامات لکھ کر سامنے رکھے تو وہ آپکی مرضی پر اس درجے میں بہر حال پورے اترآئے کہ کتابت کی اجازت دیدیں۔ چنانچہ جس وقت یہ سطریں لکھی جارہی ہیں اس وقت کم از کم اس کی بھی نصف کے قریب کتابت ہو چکی ہے

اضافہ والد ماجد مد ظلہ کو اپنے اس سلسلۂ مضامین میں جس اضافے کا خیال پیدا ہوا وہ اللہ کی اُس عنایت و نعمت کے سلسلے میں تھا جو انکو الفرقان جاری کرنے کی توفیق کی شکل میں اب سے چونتیس سال قبل عطا ہوئی تھی اور جس کا اتنے طویل عرصے تک سلسل جاری رہنا ان کی نظر میں بجز اللہ کی عنایتِ خاص کے اور کچھ نہ تھا۔

مجھ سے جب فرمایا گیا کہ یہ اضافہ مطلوب ہے تو میں نے گذارش کی اگر تحدیث نعمت (یعنی اللہ کے احسانات و انعامات کے بیان) کی مناسبت سے الفرقان کے اجرا اور اسکے استقرار و تسلسل والی نعمت کے بیان کا تقاضہ ہے۔ تو پھر کر انکی اسی نوعیت کی دوسری نعمتوں کے ساتھ تفریق و امتیاز کا معاملہ کیوں ہو؟ انکا بھی ذکر کیوں نہ اسی بیانِ نعمت میں آجائے؟ اور آپ اجازت دیں تو یہ کام اسلئے مشکل نہ ہوگا کہ الفرقان کے فائلوں میں ایسی سبھی چیزوں کا مجمل یا مفصل تذکرہ موجود ہے۔ کہیں کہیں مزید ضرورت ہوگی تو آپ رہنمائی کے لئے موجود ہیں۔ اور اسکا فائدہ یہ ہوگا کہ آپکی جو زندگی الفرقان کے کم از کم پچاس سالہ فائلوں میں پھیلی ہوئی ہے اسکے اہم نقوش و عنوانات ایک کتاب میں جمع ہو جائیں گے جو بجائے خود ایک تاریخی قدر و قیمت کی چیز تو ہوگی ہی ہم جیسے کتنوں ہی کیلئے اس میں کتنے سبق بھی ہوں گے۔ میری اس گذارش کو پسند فرمایا گیا، اور پھر الحمد للہ اسی نہج پر یہ کام الفرقان کے فائلوں میں جا بجا بین طور پر والد ماجد کے مزید برآں ارشادات و بیانات کی مدد سے تین چار ماہ میں اپنی بساط کے مطابق انجام پاگیا بس اب یہ کتاب صاحب الفرقان کی زندگی کے تمام قابل ذکر ادوار

تاریخی افادیت والے نقوش کا مرقع بن گئی ہے۔ بلکہ اسی کے ساتھ یہ الفرقان کے بارے میں بھی ایک حد تک ایک رہنما شاریہ اور آئینے کا کام ان شاء اللہ دے سکے گی۔[1]

کتاب کی تقسیم والد ماجد مدظلہ نے اپنے اس سلسلۂ مضامین کی اولین قسط میں تحریر فرمایا تھا، جیسا کہ آپ آئندہ صفحات میں خود پڑھیں گے کہ

"اس وقت میں نے بالخصوص دو قسم کے انعامات خداوندی کا تذکرہ کرنے کا ارادہ کیا ہے۔ ایک وہ دینی وایمانی نعمتیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار بندے کو نوازا، اور دوسرے اپنے ان مقبول بندوں کی عنایتیں اور شفقتیں جن کو اس سیہ کار نے پایا۔"

لیکن پہلی قسم کی نعمتوں کا تذکرہ نہ معلوم کیوں بالکل نہ ہونے کے برابر رہا تھا تقریباً پورا سلسلہ انہی مضامین پر مشتمل ہو گیا تھا جن میں دوسری قسم کے انعامات الٰہیہ کا بیان تھا۔ البتہ اب یہ سلسلہ جن اضافی مضامین کے ساتھ کتابی شکل میں آ رہا ہے انکی بنا پر اسے واضح طور سے دو حصوں میں تقسیم کرنا آسان ہو گیا ہے۔ پہلے حصے میں اللہ تبارک وتعالیٰ کے ان انعامات واحسانات کا بیان ہے جن کا تعلق مصنف مدظلہ کی ذات اور ذاتی اعمال واشتغال اور عادات سے ہے اور دوسرے میں وہ انعامات وافضال جو اللہ کے مقبول بندوں سے محبت وتعلق اور انکی شفقتوں اور عنایتوں کی شکل میں حاصل رہے۔

دونوں حصوں کا قابل لحاظ فرق لیکن یہ فرق ملحوظ رہے کہ دوسرا حصہ تمام تر حضرت مصنف مدظلہ کے اپنے قلم کا ہے۔ اور پہلے کا بڑا حصہ اس کم سواد کے قلم سے تیار ہوا ہے ہر چند کہ بہت کوشش قلم سے قلم ملانے کی کی گئی ہے اور چاہا گیا ہے آپ کی زبان کی طرف منسوب کر کے لکھے گئے الفاظ حتی الامکان وہی ہوں

---

[1] الفرقان کا اجراء ۱۳۵۲ھ ۱۹۳۴ء میں ہوا تھا اور اب ۱۳۹۵ھ ۱۹۷۵ء ہے۔

جن سے آپکا طرز ادا اور طرزِ بیان مانوس رہا ہے۔ لیکن ظاہر ہے کہ عادت سے اور سلف مختلف۔ دونوں میں یک رنگی اور یکسانیت کوئی آسان کام نہیں۔ البتہ چونکہ سب کچھ نظر سے گزار دیا گیا ہے اور آپ نے آخر آخر تک ضروری ترمیم و تنقیح کرائی ہے اسلئے اسکا پورا اطمینان ہے کہ گو کہیں طرزِ ادا میں فرق ہو جائے مگر بات یونہی طرح آپ ہی کی رہی ہوگی۔

ایک مزید انعام و کرم حضرت مصنف مدظلہ نے اپنے اوپر اللہ کے جو احسانات اور افضال و انعامات اس کتاب میں از راہِ شکر گزاری بیان کئے ہیں، ان پر ایک اضافہ یہ خاکسار مرتب کتاب اپنی طرف سے اس امید پر کر رہا ہے کہ اسے بلاشبہ پسند فرمایا جائے گا۔ اور وہ اللہ کا یہ عظیم احسان و کرم آپ پر اور پھر طبعاً آپکی تمام آل و اولاد اور خدام و متعلقین پر ہے کہ گو کئی سال سے تمام قویٰ میں انحطاط اور ضعف کا وہ عالم ہے کہ بات ایک معذور محض کے درجے پر آ پہنچی ہے۔ اٹھنا بیٹھنا، کروٹ لینا سب کچھ دوسروں ہی کے ہاتھوں ہوتا ہے۔ زبان سے الفاظ کا نکلنا آسان نہیں رہ دو حرفِ کے الفاظ سننا۔ مگر دماغ کو اللہ نے ایسا صحیح و سالم اور برقرار رکھا ہے کہ اگر کمزوری حائل نہ ہو تو پھر جیسے آج ہیں ویسے ہی بیس سال قبل میں کوئی فرق ہی نہیں۔ فَلِلّٰهِ الْحَمْدُ

يُحْيِيْ وَيُمِيْتُ وَهُوَ حَيٌّ لَّا يَمُوْتُ وَهُوَ عَلٰى كُلِّ شَيْءٍ قَدِيْرٌ۔

عتیق الرحمٰن (سنبھلی) نعمانی

لکھنؤ ۳ر شوال ۱۴۱۰ھ، ۲۸ر اپریل ۱۹۹۰ء

عرضِ مُرتّب

(طبع دوم)

اپریل ۱۹۹۳ء میں اولین ایڈیشن کیلئے "عرض مرتب" لکھی گئی تو حضرت مصنف (والد ماجد حضرت مولانا نعمانی رحمۃ اللہ تعالیٰ) بحمد اللہ تعالیٰ حیات تھے، اور نام کے ساتھ "مدظلہ" لکھنے کی سعادت ملی تھی۔ آج چھ ماہ کے بعد دوسرے ایڈیشن کیلئے یہ سطریں لکھنا پڑرہی ہیں تو مدظلہ کی جگہ رحمۃ اللہ تعالیٰ نے لے لی ہے۔ دعا ہے کہ اللہ کی جن عنایات کے ساتھ دنیا میں اُن کی بسر ہوتی رہی تھی عقبیٰ میں اُن سے بہتر عنایات اُن کو میسر آرہی ہوں۔ آمین یا ارحم الراحمین۔

دوسرے ایڈیشن کی امید بہت جلدی ہی تھی۔ مگر اتنی جلدی کی بھی نہ تھی۔ اور اسلئے بعض پہلوؤں سے نظرثانی کا جو کام مرتب کو دوسرے ایڈیشن کیلئے کرنا تھا وہ ابھی تکمیل طلب ہی ہے جبکہ کتاب کی طلب نے ایکدم سے بلا تاخیر دوسرے ایڈیشن کا تقاضا پیدا کردیا ہے۔ پس فی الحال صرف کتابت کی غلطیوں کی تصحیح اور حصۂ دوم کے مضامین کی ترتیب کی درستی کے ساتھ یہ دوسرا ایڈیشن حاضر ہے۔ مکمل نظرثانی کی صورت ان شاء اللہ اب اگلے ایڈیشن میں سامنے آسکے گی۔ والسلام

عتیق الرحمٰن سنبھلی نعمانی

لندن ۱۰ اکتوبر ۱۹۹۳ء

حرفِ آغاز

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

اَلْحَمْدُ لِلّٰہِ وَسَلَامٌ عَلٰی عِبَادِہِ الَّذِیْنَ اصْطَفٰی

امّا بعد!

اس عاجز کی عمر کا ساٹھ واں[له] سال چل رہا ہے۔ گزری ہوئی اس طویل زندگی پر نگاہ ڈالتا ہوں تو نظر آتا ہے کہ رب کریم کے انعامات واحسانات اور اپنی تقصیرات ومعصیات کی کوئی حد وانتہا نہیں ہے۔ سورۂ ابراہیم میں گویا مجھ جیسوں ہی کے لئے فرمایا گیا ہے۔

وَاِنْ تَعُدُّوْا نِعْمَةَ اللّٰہِ لَا تُحْصُوْهَا	اور تم اگر اللہ کی نعمتوں کو شمار کرنا چاہو
اِنَّ الْاِنْسَانَ لَظَلُوْمٌ كَفَّارٌ	تو کر نہیں سکتے یقیناً انسان بڑا مجرم
سورۂ ابراہیم آیت ۳۴	اور ناشکرا ہے۔

جب اپنی بداعمالیوں اور خطا کاریوں کو نظر کے سامنے رکھ کر اللہ تعالیٰ کے بے حساب الطاف وعنایات پر غور کرتا ہوں تو شبہ ہوتا ہے کہ کہیں یہ استدراج نہ ہو لیکن پھر دل کو سمجھاتا ہوں کہ اپنے اس رحیم وکریم پروردگار کے ساتھ جس نے محض اپنے کرم سے وجود بخشا اور ایک مسلمان دیندار گھرانے میں پیدا فرما کر پیدائشی مسلمان بنایا اور کسی درجہ میں دین سے تعلق اور اس کا کچھ علم اور

له یہ تحریر ربیع الاول ۱۴۰۳ھ کی ہے۔ ۔ سه ذعیل.

ٹوٹا پھوٹا عمل بھی نصیب فرمایا ہے کریم پروردگار کے ساتھ کیوں بدگمانی کی جائے! کیوں نہ سمجھا جائے کہ یہ جو کچھ ہے اُس کی رحمت و بخشش ہے جس سے گنہگار و خطاکار بندے بھی محروم نہیں کیے جاتے!

سورۂ نحل میں فرمایا گیا ہے۔

وان تعدوا نعمۃ اللہ لا تحصوھا ان اللہ لغفور رحیم	اور اگر تم اللہ کی نعمتوں کو گننا چاہو گے تو گن نہیں سکو گے یقیناً اللہ تعالیٰ بہت بخشش کرنے والا اور بڑا مہربان ہے اسکی نعمتیں اس صفت مغفرت و رحمت کا ظہور ہیں
سورۂ نحل آیت ۱۸	

اللہ تعالیٰ تقصیرات و معصیات سے سچی توبہ و استغفار کی اور خداوندی انعامات و احسانات پر روح و قلب اور قول و عمل سے شکر کی توفیق دے۔

شکرِ نعمت ہائے تو چندانکہ نعمت ہائے تو
عذرِ تقصیراتِ ما چندانکہ تقصیراتِ ما

کچھ دن پہلے ایک ضرورت سے شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ[1] کی کتاب المنن کا مطالعہ کرنا پڑا۔ شیخ موصوف نے اپنی اس کتاب میں بڑی تفصیل اور استیعاب کے ساتھ اپنے پر ہونے والے اللہ تعالیٰ کے انعامات و احسانات کا ذکر فرمایا ہے یہی کتاب کا خاص موضوع ہے۔ جن اہل علم کو ان عارفین کے علوم و معارف سے مناسبت ہو۔ بلاشبہ انکے لئے بڑی ہی مفید تصنیف ہے۔ بڑے کتابی سائز پر پہلے زمانے کے باریک مصری ٹائپ سے چھپے ہوئے تقریباً ۶ سو صفحات کی ضخیم کتاب ہے۔ اسکے مقدمہ میں امام شعرانیؒ نے پہلے وہ آیات و احادیث اور انکے

---

[1] شیخ عبدالوہاب شعرانیؒ دسویں صدی ہجری کے اکابر تابعین میں ہیں مصر آپکا وطن مالوف ہے۔ متعدد اہم تصانیف یادگار ہیں۔ نہایت کثیر التالیف تھے۔ ۹۷۳ھ میں وفات پائی۔

بعد ائمہ اکابر امت کے وہ ارشادات درج کئے ہیں جنھوں نے انکو اس کتاب کی تالیف اور بڑے استیعاب و استقصا کے ساتھ نعمائے الٰہیہ کے اظہار و بیان پر آمادہ کیا ۔ سب سے پہلے قرآن مجید کی وہ آیات درج کی گئی ہیں جن میں اللہ تعالیٰ کے الطاف و عنایات پر انبیاء علیہم السلام کے تشکر و احسان کا ذکر کیا گیا ہے ۔ اسکے بعد کتب حدیث سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اسی طرح کے بعض ارشادات نقل کئے ہیں ۔ اس کے بعد کہتے ہیں ۔

قد امرنا الله تعالىٰ بالتأسي برسول الله صلى الله عليه وسلم في كل امر لم يكن خاصا به ومن التأسي به التحدث بكل نعمة انعمها علينا ولا نكتمها ولا نتحدث في سر اخرنا بها بل نعلن بها على رؤس الاشهاد.

اللہ تعالیٰ نے ہمیں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی پیروی کا حکم دیا ہے ان چیزوں میں جو آپ کے خصائص میں سے نہیں ہیں اور آپ کی پیروی میں یہ بات بھی شامل ہے کہ اللہ تعالیٰ کی طرف سے ہونے والی ہر نعمت و عنایت کو ہم بیان کریں اور اسکو چھپائیں نہیں اور مخفی خاص مجالس ہی میں بیان نہ کریں بلکہ بالاعلان سب کے سامنے اظہار کریں ۔

اسکے بعد طبرانی اور بیہقی کی تخریج سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے

التحدث بالنعمة شكر وتركه كفر.

اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا اسکے بندوں کے سامنے ذکر کرنا شکر نعمت ہے اور ذکر نہ کرنا کفران نعمت ہے ۔

پھر اسی سلسلے میں ائمہ اور اکابر امت کے ارشادات ذکر کرتے ہوئے

حضرت سفیان ثوریؒ سے نقل فرمایا ہے کہ وہ ارشاد فرماتے ہیں کہ

من لم یتحدث بالنعمۃ	جس نے اللہ تعالیٰ کی طرف سے ملنے
فقد عرضہا للزوال	والی نعمتوں کا چرچا نہیں کیا اس نے
	زوالِ نعمت کا سامان فراہم کردیا۔

پھر عارف ربانی شیخ ابوالمواہب شاذلیؒ سے نقل فرمایا ہے۔

لایکفی الانسان ان یشکر	آدمی کے لئے یہ کافی نہیں ہے کہ وہ
ربہ فی نفسہ من غیر	اپنے جی میں اللہ تعالیٰ کی نعمتوں کا شکر
لفظ وانما علیہ ان یشیع	ادا کرے اور زبان سے کچھ نہ بولے بلکہ
ذلک بین العباد حتی یعلم	ادائے شکر کیلئے لازم ہے کہ اللہ کے
بہ الخاص والعام فانہ	بندوں میں اسکی نعمتوں کا خوب چرچا
تعالیٰ یحب من عبادہ	کرے تاکہ عوام و خواص سب کے علم میں
ان یشکروہ ویذکروا	آجائے اللہ تعالیٰ اسکو پسند فرماتا ہے
فضلہ واحسانہ علیہم	کہ اسکے بندے اسکی نعمتوں پر اسکا
بین عبادہ ویصفون	شکر کریں اور اسکے فضل و کرم، احسان و
بالجود والکرم والفضل	عنایت اور کرم و بخشش کا دوسروں کے
	سامنے چرچا کریں۔

پھر سب سے آخر میں اپنے مرشد کامل سید علی خواصؒ کا یہ ارشاد درج کیا ہے۔

علیکم بالاعلان بما	تم پر اللہ تعالیٰ جو فضل و احسان فرمائے
تفضل اللہ بہ علیکم فان	تمہیں چاہئے کہ اسکو خوب بیان کرو
اللہ تعالیٰ یستحی من عبدہ	اللہ کا بندہ جب دوسرے لوگوں کے

اذا قال اعطانی اللّٰہ کذا	سامنے بیان کرتا ہے کہ میرے رب کریم
وکذا ان یسلب منہ	نے مجھے یہ عطا فرمایا تو اللہ تعالیٰ
ذالک لئلا یخجلہ بین	سے ہرگز یہ نہ ہوگا کہ اس بندے سے وہ
عبادہ۔	نعمت سلب کرکے مخلوق کے سامنے اسکو
کتاب اللمن صفحہ ۲۹۱	شرمندہ اور رسوا کیا جائے۔

اسی کے ساتھ یہ حضرات یہ بھی فرماتے ہیں کہ بندہ کو اسکا وہم بھی نہ ہونا چاہئے کہ میں اللہ تعالیٰ کے اس لطف وکرم کے لائق ہوں اور یہ میرے کسی حسن عمل کا ثمرہ ہے بلکہ اپنے کو قطعاً غیر مستحق سمجھتے ہوئے یقین کرے کہ یہ صرف مالک کا فضل اور اسکی بخشش ہے ۔ چنانچہ اسی سلسلہ کلام میں شیخ شعرانیؒ نے سید الطائفہ حضرت جنید بغدادی قدس سرہٗ کا یہ ارشاد نقل فرمایا ہے ۔

لایکمل احد فی مقام الشکر	کوئی بندہ مقام شکر میں کمال کو نہیں
للہ تعالیٰ حتی یری نفسہ	پہنچ سکتا جبتک کہ وہ اپنے بارہ میں
انہ لیس باھل ان تنالہ	یقین کے ساتھ نہ سمجھ لے کہ میں قطعاً
رحمۃ اللہ عزوجل وانما	اس لائق نہیں ہوں کہ میرے ساتھ رحمت
رحمۃ اللہ من باب المنۃ	کا معاملہ ہو، میرے پروردگار کا رحمت
والفضل صـ ۲۷	وعنایت کا جو کچھ معاملہ میرے ساتھ ہے
	وہ صرف اسکی بخشش اور خالص احسان ہے

"کتاب اللمن" کے اس مقدمہ کے مطالعہ کے بعد دل میں داعیہ پیدا ہوا کہ اس گنہگار و سیہ کار بندہ پر اللہ تعالیٰ کے جو خاص خاص الطاف و عنایات ہیں میں بھی ان کو سپرد قرطاس وقلم کروں اور اس طرح اپنی وسعت کے مطابق علی رؤس الاشہاد اسکی کریمی کی شہادت دوں اور اسکو تحریر میں

بھی محفوظ کردوں، کیا عجب کہ یہی میرے شکر کی دستاویز بن جائے اور آخرت میں میرے کام آئے۔ اِنَّ رَبِّی غَفُوْرٌ شَکُوْرٌ ؕ

اس وقت میں نے بالخصوص دو قسم کے انعامات خداوندی قلم بند کرنے کا ارادہ کیا ہے ایک وہ دینی وایمانی نعمتیں جن سے اللہ تعالیٰ نے اس گنہگار بندہ کو نوازا، اور دوسرے اس کے ان مقبول بندوں کی عنائتیں اور شفقتیں جن کو اس سیہ کار نے پایا۔

حصہ اوّل

نعمتِ علم اور توفیقِ عمل

زندگی کا آغاز اور تعلیم

سب سے پہلے خدا کو گواہ بنا کے تسمیم شرعی کے ساتھ عرض کرتا ہوں کہ اگرچہ اپنی ظاہری زندگی کے لحاظ سے میں دینداروں میں سمجھا جاتا ہوں اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے نماز روزہ جیسے فرائض کی ادائیگی اور معصیات سے اجتناب کا ایک گونا اہتمام بھی نصیب ہے لیکن ارشاد خداوندی بَلِ الْاِنْسَانُ عَلٰی نَفْسِہٖ بَصِیْرَۃٌ "(انسان اپنے کو خود ہی خوب جانتا ہے) کے مطابق سچی بات یہ ہے کہ میرے اندر ایسے ایسے رذائل اور اللہ تعالیٰ کے اور بندوں کے حقوق کی ادائیگی بین اتنی بڑی بڑی کوتاہیاں ہیں کہ اگر اللہ تعالیٰ اُس کی پاداش میں اس دنیا میں مجھے کے پانی سے بھی محروم کر دے یا العیاذ باللہ خسف یا مسخ کا فیصلہ فرما دے تو عدل وانصاف کے خلاف نہ ہوگا لیکن وہ رب کریم ابتدائے زندگی سے آج تک انعامات واحسانات کی بارش فرما رہا ہے اور اب تک کے تقریباً ستر سالہ تجربہ کی بنا پر امید کا پورا حق ہے کہ ان شاء اللہ زندگی کے باقی دنوں میں اور اس کے آگے کی منزلوں میں بھی اُسکا یہی لطف وکرم رہے گا۔ اَللّٰھُمَّ صَدِّقْ ظَنِّیْ!

ایک خوشحال دیندار مسلمان گھرانے میں پیدائش

اس کے بعد میں سب سے پہلے اللہ تعالیٰ کے جس احسانِ عظیم کا ذکر کرنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ اس نے مجھے ایک ایسے گھرانے میں پیدا فرمادیا۔ جس میں دنیوی معیشت کے لحاظ سے خوشحالی کے ساتھ اسکی توفیق سے

دینداری اور خدا ترسی بھی تھی ـــــ میرے والد ماجد (صوفی احمد حسین صاحب مرحوم) ایک متوسط درجے کے دولتمند تھے۔ زمینداری بھی اچھی خاصی تھی اور تجارتی کاروبار بھی خاصا وسیع تھا۔ اور اس میں اچھے کامیاب تھے۔ اسی کے ساتھ انکی آخرت کی فکر دنیا کی فکر پر غالب تھی۔ اور وہ کاروبار میں پوری مشغولی کے ساتھ اَلذّٰکِرِیْنَ اللّٰہَ کَثِیْرًا (اللہ کو بہت زیادہ یاد کرنے والے بندوں) میں سے تھے[1] اس کا یہ نتیجہ ہوا کہ میری دنیوی تعلیم کے خاص امکانات بلکہ بعض غیر معمولی قسم کی ترغیبات کے باوجود انھوں نے مجھے دینی تعلیم دلانے اور دین کا خادم بنانے کا فیصلہ فرمایا۔ ان غیر معمولی ترغیبات کی نوعیت بھی قابل ذکر ہے اور وہ یہ ہے کہ ہمارے ضلع مراد آباد کے اُس وقت کے انگریز کلکٹر نے جو کسی خوش گمانی کی وجہ سے میرے والد ماجد کا بہت قدر شناس تھا[2] ایک ملاقات میں والد صاحب سے اُنکی اولاد کے بارے میں پوچھا۔ والد ماجد نے بتایا کہ خدا کے دیئے ہوئے میرے پانچ لڑکے ہیں اور دو لڑکیاں۔ اُس نے تعلیم کے بارے میں دریافت کیا تو اُسے یہ معلوم کرکے حیرت ہوئی کہ ان لڑکوں میں سے

---

[1] مختلف وظائف میں جو اذکار ان کے مستقل معمولات میں داخل تھے ان کی مجموعی تعداد بیس ہزار کے قریب تھی۔ ایک زمانے میں رات کو بعد نماز عشاء گھر سے جا کر چار ہزار بار درود شریف کا معمول تھا۔ تہجد کے ایسے پابند تھے کہ میں نے ان کے انتقال کے بعد والدہ ماجدہ مرحومہ سے پوچھا کہ کیا ابا جی کا تہجد قضا ہوتا تھا کبھی ان کے طرف سے تو انھوں نے فرمایا کہ جب شروع میں نئی تھی تو کبھی تہجد قضا ہو جاتا تھا لیکن اس دن نماز اشراق و رکھتے تھے مگر ۳۰-۳۵ سال سے غالباً کبھی قضا نہیں ہوا۔ والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ نے شنبہ ۵ رمضان ۱۳۹۸ھ کو ایسے حال میں انتقال فرمایا کہ ہاتھ میں تسبیح تھی اور ذکر جاری تھا۔ رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین۔

[2] (از مرتب) ان کلکٹر صاحب کا نام مسٹر ایلیو۔ جے۔ اے پین تھا۔ ضلع مراد آباد کی مشہور شخصیت سر رضا علی (مرحوم) نے اپنی سوانح حیات "اعمال نامہ" میں ان صاحب کی خصوصیات میں لکھا ہے کہ ہر ایک سے خوش گفتگو تعلقات رکھنا اور با تجربہ استادوں کی عزت کرنا اپنا فرض اور سلطنت کی خیر خواہی سمجھتے تھے۔ (صفحہ ۲۲۳)

کسی ایک نے بھی انگریزی تعلیم حاصل نہ کی ہے اور نہ کوئی کر رہا ہے۔ ما سُنّت[1] میری عمر اور تعلیم کی منزل ایسی تھی کہ میرے ہی بارے میں اس طرح کا فیصلہ کیا جا سکتا تھا۔ میں پانچ بھائیوں میں تیسرے نمبر پر یعنی درمیان میں تھا۔ کوئی بارہ سال عمر تھی اور ابتک عربی فارسی کی تعلیم کے نام پر صرف وقت ضائع ہو رہا تھا۔ اسلئے کہ میں بے دلی سے پڑھتا تھا۔ ہر سال میری وہی کتابیں (میزان منشعب) نئے سرے سے شروع ہوتی تھیں۔ اور یہ محسوس کر کے کہ پڑھائی ٹھیک نہیں ہو رہی ہے والد صاحب اگلے سال میں مدرسہ بھی بدل دیتے تھے۔ اسلئے کہ ہمارے سنبھل میں اس وقت عربی کے تین مدرسے تھے مجھے یاد ہے کہ یہ چکر برسوں تک چلتا رہا۔ اور ہر سال میری تعلیم انہی کتابوں کے پہلے جملے "بدان اسعدک اللہ فی الدارین" سے شروع ہوتی تھی۔

کلکٹر صاحب کی ترغیب اور والد کا فیصلہ

الغرض یہ میری عمر اور میری تعلیم کی منزل تھی۔ اس لئے کلکٹر نے بھی میرے ہی بارے میں خاص طور سے اصرار سے کہا کہ کل ہی سے اس بچہ کو مقامی ہائی اسکول میں بھیج دیا جائے اور ساتھ ہی کہا کہ میں ہیڈ ماسٹر سے کہہ دونگا کہ وہ پانچ سال میں اس کو انٹرنس کرا دے۔ اور پھر میں اسکو نائب تحصیلداری دیدوں گا۔ اس زمانہ میں نائب تحصیلداری بڑی چیز تھی۔ اسکے بعد ترقی کر کے آدمی تحصیلدار ہو جاتا تھا۔ اور پھر ڈپٹی کلکٹر۔ بس یہی ہندوستانیوں کی معراج تھی اس سے آگے کلکٹر اور کمشنر تو انگریز ہی ہوتے تھے لیکن اللہ میرے والد مرحوم کو بہتر سے بہتر جزا دے۔ انھوں نے اس درجے کی دنیاوی

---

[1] تقریباً ۱۹۱۵ء

ترغیب کو ذرا بھی قابلِ توجہ نہ جانا۔ گھر آکر یہ قصہ سنایا تو ساتھ ہی یہ بھی بتلادیا کہ ان کا کوئی ارادہ کلکٹر کے اس با اصرار مشورے کو قبول کرنے کا نہیں ہے۔ اُن کے بعض ملنے والوں کی اور گھر کے بھی بعض لوگوں کی یہ رائے ہوئی کہ اس موقع کو ہاتھ سے نہ جانے دیا جائے۔ چنانچہ اُن کو راضی کرنے کی کوشش بھی کی گئی۔ مگر وہ کسی طرح اس بات پر راضی نہ ہوئے۔ انکا آخری جواب یہ تھا کہ میں ان بچوں کو دینی تعلیم دلانے کی کوشش کروں گا جس سے مجھے قبر میں اور اسکے بعد کچھ ملتا رہے۔ والد ماجد کا یہ فیصلہ اس وقت کی نادانی کی عمر میں تو بےحد رنج و ملال کا باعث ہوا تھا۔ مگر آج اس کی قدر کا بیان کرنے کیلئے کوئی بھی لفظ کافی نہیں ہے۔ انکا یہ فیصلہ ان پر تو اللہ کا بڑا انعام تھا ہی اس عاجز کے حق میں یہ اللہ کی بڑی عظیم نعمت تھی کہ انھوں نے مجھے دین کا خادم بنانے کا فیصلہ کیا۔

والد ماجد کی اس حسنِ نیت کی برکت کہنا چاہئے کہ پڑھنے کے بارے میں میری بدشوقی کا مرحلہ بھی دیر سویر طے ہو ہی گیا۔ اور میں ایک اچھے محنتی طالب علم کی طرح پڑھنے لگا۔

سنہ ۱۳۲۳ھ کی بات ہے۔ جبکہ میری عمر پندرہ سال ہو گئی تھی۔ والد صاحب کو معلوم ہوا کہ شہر کے فلاں مدرسے میں ایک نئے پنجابی استاد آئے ہیں اور وہ بہت توجہ سے پڑھاتے ہیں۔ والد صاحب نے مجھے اُن کے پاس بھیجنے کا فیصلہ فرمایا۔ یہ مولانا مفتی محمد نعیم صاحب لدھیانوی تھے۔ اللہ انکو بہترین جزا دے کہ انکی بدولت میری گاڑی اب پہلے دن سے پٹری پر پڑ گئی۔ اور بدشوقی و بے دلی دور ہو گئی۔ ذہن اور حافظہ بھی اللہ تعالیٰ نے بہت اچھا دیا تھا۔ اسلئے طالب علمی کے سفر کا بہت بڑا حصہ تیزی سے طے کر لیا۔ اُس زمانے میں ہمارے دینی مدارس میں قدیم منطق، فلسفے اور کلام کا بڑا زور تھا۔ میں نے کسی قدر وقت

اُن فنون کو کسی ذوق و محنت سے پڑھا۔ بعض کتابیں بھی ان فنون کی پڑھیں جو کبھی بھی مدارس میں پڑھی پڑھائی نہیں جاتی تھیں اور اب پورے یقین و بصیرت کے ساتھ یہ رائے ہے کہ ان فنون پر زیادہ وقت صرف کرنا بالکل فضول اور وقت کی صرف اضاعت ہے۔

دارالعلوم دیوبند میں داخلہ

بہرحال میری طالب علمی کا سفر اب بہت ہی تیزی سے طے ہوتا ہوا اس منزل پر آ گیا کہ توفیق الٰہی سے ۱۳۶۳ھ میں علوم دین، فقہ اور حدیث و تفسیر کی آخری اور تکمیلی تعلیم کیلئے مجھے دارالعلوم دیوبند جانا نصیب ہو گیا جو ہندوستان ہی نہیں پورے عالم اسلام میں اُس وقت ان علوم کی تدریس و تعلیم کا عظیم ترین مرکز تھا۔ اور جہاں ان علوم کے وہ ماہر اساتذہ جمع تھے جو اپنے فن میں امتیاز و کمال رکھتے تھے اور ساتھ ہی صلاح و تقویٰ میں اسلاف کا نمونہ تھے اور یہ اللہ کا میرے اوپر بہت ہی خصوصی انعام و احسان تھا ورنہ میرے والد ماجد جس تصوف کی لائن سے تعلق رکھنے کی وجہ سے صوفی کہلاتے تھے اور جن صوفیوں کی صحبت سے وہ متاثر ہوئے تھے وہ اگرچہ بظاہر مخلص مگر غلط عقیدوں کے لوگ تھے۔ اسلئے علمائے دیوبند سے اُن کا کوئی تعلق نہ تھا بلکہ بُعد تھا۔ مگر نہ معلوم کیسے اللہ نے میرے والد ماجد کے دل میں یہ بات بٹھا دی تھی کہ حدیث شریف دیوبند والے ہی اچھی پڑھاتے ہیں۔ اسلئے انہوں نے مجھے دیوبند جانے کی اجازت دینے میں کوئی تامل نہ کیا۔ اور اُن کے گیارہویں شریف، بارہویں شریف اور عرسوں کی محفلوں والے یاران طریقت کو جب اس بات کا پتہ چلا کہ صوفی جی کا لڑکا دیوبند پڑھنے جا رہا ہے اور انہوں نے

کچھ کہا سنا کہ یہ کیا غضب ہو رہا ہے تو والد ماجد نے فرمایا کہ مجھے اطمینان ہے کہ وہ رہے گا میرے ہی راستہ پر۔ الغرض انھوں نے اپنی رائے نہیں بدلی اور میں شوال سنہ ۱۳۴۲ھ میں دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوگیا۔

اس داخلے کے برکات میرے والد ماجد پر

یہ داخلہ میرے لئے تو باب رحمت کا داخلہ تھا ہی میرے والد ماجد کیلئے بھی اسکے ذریعہ اہل حق سے عقیدت و تعلق اور اصلاحِ عقائد کا راستہ کھل گیا اور اس راستہ کھلنے کا بھی ایک قابل ذکر واقعہ ہے۔

وہ مکان جسمیں حضرت شیخ الاسلام مدنی رحمۃ اللہ علیہ کا قیام تھا اور اب حضرتؒ کے گھر کے لوگوں کا قیام ہے ہمارے زمانۂ طالبعلمی میں اسمیں مطبع قاسمی اور کتبخانہ قاسمی تھا جن بیچارے طالب علموں کو مدرسہ میں حجرہ نہیں مل سکتا تھا، انکو اسکے ایک خستہ سے کمرے میں رہنے کی اجازت دیدی جاتی تھی، میں انہی بیچارے طالبعلموں میں سے ایک تھا، دونوں سال میرا قیام اسی میں رہا، پہلے سال ربیع الاول کا مہینہ تھا اور خوب یاد ہے چودھویں تاریخ تھی اور اتفاق سے جمعہ کا دن تھا، عصر کی جماعت کا قرب تھا، میں اسی مطبع قاسمی میں بیٹھا وضو کر رہا تھا کہ اچانک والد ماجد رحمۃ اللہ علیہ مطبع قاسمی کا پتہ پوچھتے ہوئے تشریف لے آئے، پہلے سے کوئی اطلاع نہ تھی بلکہ وہم و گمان بھی نہ تھا، لیکن میرا ذہن منتقل ہوا کہ یہ ربیع الاول کا مہینہ ہے، ان ہی تاریخوں میں پیران کلیر کا عرس ہوتا ہے، یہ وہاں عرس میں تشریف لائے ہونگے، ان کی پیران کلیر میں عرس میں حاضری کبھی قضا نہیں ہوئی تھی، چنانچہ دریافت کرنے پر یہی بتایا کہ میں کلیر شریف عرس میں آیا ہوا تھا خیال ہوا کہ دیوبند قریب ہی ہے اسلئے وہاں سے فارغ ہو کر آ گیا ہوں، میں نے عرض

کیا کہ عشاء کی جماعت کا وقت ہوچکا ہے، وہ باوضو تھے ہم لوگوں کے ساتھ فوراً ہی مسجد تشریف لے آئے۔ اس زمانہ میں حوض وہاں تھا جہاں اس وقت مسجد کے فرش کا آخری حصہ ہے، اور چونکہ مسجد میں تنگی ہوتی تھی اسلئے حوض کو لکڑی کے تختوں سے پاٹ دیا گیا تھا، اس پر بھی کئی صفیں ہوتی تھیں، ہم لوگ ایسے وقت مسجد میں داخل ہوئے کہ نماز شروع ہوچکی تھی ہمیں آخری صفوں میں حوض پر جگہ ملی، چودہویں رات کی چاندنی کھلی ہوئی تھی، اور جمعہ کا دن ہونیکی وجہ سے عام طور سے تمام طلبہ صاف سفید کپڑے پہنے ہوئے تھے جب رکوع یا سجدہ کا وقت ہوتا تو ہم لوگوں کو جو حوض کے اوپر بلندی پر کھڑے تھے ایسا معلوم ہوتا جیسے آسمان سے اُترے ہوئے فرشتوں کی صفیں ہیں مجھے خوب یاد ہے بڑا ہی نورانی منظر تھا، میں والد صاحب کے بالکل برابر میں کھڑا تھا میں نے محسوس کیا کہ والد صاحب پر اس منظر کا کچھ خاص اثر پڑ رہا ہے، نماز سے فارغ ہو کر ہم لوگ اپنی قیامگاہ یعنی مطبع قاسمی میں آگئے۔ والد صاحب کی باتوں سے میرے اس احساس کی تصدیق ہوگئی کہ وہ دار العلوم کی نماز کے اس منظر سے بہت متاثر ہوئے ہیں۔

صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت مولانا محمد ادریس صاحب کاندھلوی کا اسی مسجد میں قرآن مجید کا درس ہوتا تھا، وہ اگرچہ دار العلوم کے بڑے اساتذہ میں سے نہیں تھے، عمر بھی کم تھی، لیکن اپنی صلاحیت اور قابلیت کی وجہ سے ممتاز سمجھے جاتے تھے اور طلبہ میں مقبول اور محبوب تھے، اسی زمانہ میں ترجمہ قرآن دار العلوم کے نصاب میں داخل نہیں تھا، مولانا کا یہ درس گویا پرائیویٹ اور ان کے ذاتی ذوق و شوق کا نتیجہ تھا، بڑی وسیع نظر تھی اور خوب بولتے تھے، واقعہ یہ ہے کہ درس قرآن کا حق ادا کرتے تھے، طلبہ کی بہت بڑی تعداد پابندی سے۔

شرکت کرتی تھی بڑا علمی نفع ہوتا تھا، میں نے موقع نکال کر مولانا کے کان میں اس دن عرض کردیا کہ میرے والد صاحب تشریف لائے ہوئے ہیں، وہ عرس اور قوالی کے دلدادہ لوگوں میں سے ہیں ان کے عقائد و خیالات اس طرح کے ہیں، ہمارے بزرگوں کے بارے میں انھیں سخت بدگمانیاں ہیں اور ناواقفی کی وجہ سے یہ سمجھتے ہیں کہ ان دیوبند والوں کو تصوف اور بزرگانِ دین سے کوئی تعلق نہیں، میرا مقصد یہ تھا کہ آج کے درس میں اس کا لحاظ فرما لیا جائے حسنِ اتفاق سے اس دن سورۂ یوسف کا وہ مقام زیرِ درس تھا جہاں یہ ذکر آتا ہے کہ حضرت یعقوب علیہ السلام نے (غلہ وغیرہ لانے کیلئے) جب اپنے صاحبزادوں کو مصر کیلئے رخصت کیا اور چھوٹے صاحبزادے حضرت یوسفؑ کے حقیقی بھائی بن یامین کو بھی ان کے ساتھ جانے کی اجازت دیدی تو اس وقت یہ ہدایت بھی فرمائی کہ تم سب مصر میں ایک دروازے سے داخل نہ ہونا (یَا بَنِیَّ لَا تَدْخُلُوا مِنْ بَابٍ وَّاحِدٍ وَّادْخُلُوا مِنْ اَبْوَابٍ مُّتَفَرِّقَةٍ) جس کا مقصد اکثر مفسرین نے یہ بتایا ہے کہ دیکھنے والوں کی نظر نہ لگے تو آخر میں یہ بھی فرمایا تھا۔ وَمَا اُغْنِیْ عَنْكُمْ مِّنَ اللّٰهِ مِنْ شَیْءٍ اِنِ الْحُكْمُ اِلَّا لِلّٰهِ عَلَیْهِ تَوَكَّلْتُ وَعَلَیْهِ فَلْیَتَوَكَّلِ الْمُتَوَكِّلُوْنَ ۝ مولانا کاندھلوی نے ان آیات پر تقریر کرتے ہوئے توکل کی حقیقت اور توکل اور اسباب کے تعلق پر بھی خوب روشنی ڈالی اور اس دن عارف رومی کے اشعار بھی اس سلسلے میں سنائے، اسکے علاوہ بھی کئی مضامین تصوف و معرفت ہی سے متعلق مولانا نے اس دن کے درس میں ایسے بیان فرمائے جو والد ماجدؒ کے بہت ہی حسب حال تھے، اس درس سے بھی والد صاحب بہت متاثر ہوئے۔ رات کی نماز میں انھوں نے جو منظر دیکھا تھا اور جو نورانی کیفیت اس مجمع میں انھوں نے محسوس کی اور پھر صبح کے درس میں جو کچھ سنا اس سے

ان کا ذہن ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں بہت کچھ بدل گیا درس سے فارغ ہو کر جب ہم لوگ اٹھے تو والد صاحب نے فرمایا کہ میں یہاں کے بزرگوں کے مزارات پر جانا چاہتا ہوں، ہم لوگ ان کو قبرستان لے گئے، وہ پہلے حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور دیر تک بیٹھے رہے اسکے بعد حضرت نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مزار پر مراقب ہو کر بیٹھے اور بہت دیر تک بیٹھے اور ان کے چہرے کے رنگ سے ہم محسوس کرتے رہے کہ ان پر کوئی خاص اثر پڑ رہا ہے وہاں سے واپسی پر فرمایا کہ "ان حضرات کا مقام بہت ہی بلند ہے" اسکے بعد ہم لوگوں سے فرمایا کہ یہاں کے اساتذہ میں جو اللہ والے ہوں مجھے ان کے پاس لے چلو، ہم سب سے پہلے حضرت میاں صاحب یعنی حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں پہونچے حضرت میاں صاحب کی زیارت و ملاقات سے بھی والد صاحب بہت متأثر ہوئے اسکے بعد حضرت شاہ انور شاہ صاحب اور حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہما کی زیارت کی، ان حضرات کی زیارت سے بھی بہت متأثر ہوئے اور ان کے بارے میں فرمایا کہ یہ ہر وقت ذکر میں مشغول اور صاحب نسبت ہیں۔ الغرض ہمارے اکابر اور ہماری جماعت کے بارے میں انکو جو بدگمانیاں ہمیشہ سے تھیں وہ غالبًا اسی دن ختم ہو گئیں، اور اس کے بعد تو ان پر اللہ تعالیٰ کا بہت ہی بڑا فضل ہوا۔

دارالعلوم میں طالب علمی کا دور

دارالعلوم میں میری طالبعلمی کا دور دو سال سنہ ۱۳۴۴ھ تا سنہ ۱۳۴۵ھ رہا یہ امام العصر حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کی صدارت تدریس کا آخری دور تھا۔ اللہ تعالیٰ نے اپنے خاص کرم سے اساتذہ کی قدر اور استفادہ کی توفیق بھی بخشی۔ حضرت استاذ کشمیری قدس سرہٗ نے ایک دن درس میں بڑی خوشی کے ساتھ فرمایا تھا کہ، اس سال کے بعد دورۂ حدیث کی جماعت میں اتنے اچھے طلبہ اس سال جمع ہوئے ہیں۔

تعلیمی سال کے خاتمہ پر حسب معمول کے مطابق سالانہ امتحان ہوا تو اس عاجز نے بخاری شریف اور ترمذی شریف سے متعلق سوالات کے جوابات اس طرح لکھے کہ ہر سوال کے جواب میں ایک رسالہ لکھا اور اس کا نام بھی رکھ دیا[1]۔ نتیجہ میں بھی امتیاز حاصل رہا۔

دورۂ حدیث کا یہ پورا سال اس طرح گزرا تھا کہ دن رات کے اکثر اوقات میں حدیث شریف کی کتابوں ہی سے اشتغال رہتا تھا۔

علم حدیث سے جو مناسبت اُس زمانہ میں حاصل ہوئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی بہت ہی بڑی نعمت تھی پھر اُس وقت سے اب تک حدیث پاک سے اشتغال اور اس کی خدمت کا شغل کسی نہ کسی شکل میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے

---

[1] اتنا کام امتحان کے لیے مقررہ چند گھنٹوں میں نہیں ہو سکتا تھا۔ اسلئے میں نے خصوصی طور پر درخواست کر کے عصر کی نماز تک کیلئے وقت بڑھوایا تھا۔

برابر نصیب ہے۔ معارف الحدیث[1] کی تالیف بھی اسی سلسلے کی ایک کڑی ہے اللہ تعالیٰ زندگی کے آخری دن تک یہ اشتغال جاری رکھے۔

پھر رب کریم کا یہ بھی خاص فضل و احسان ہے کہ اس دولت عظمیٰ کی قدر و قیمت کا احساس بھی ہے انشاء اللہ ناظرین کیلئے بھی اس کا اظہار مفید ہی ہوگا کہ کبھی کبھی قرآن عزیز کی تلاوت اور اس میں تفکر کے وقت یا حدیث پاک میں مشغولیت کے وقت یا نماز یا ذکر یا دعا کی حالت میں جو کچھ نصیب ہو جاتا ہے اسکے سامنے دنیا کے خزانے اور دنیا بھر کی نعمتیں ہیچ معلوم ہوتی ہیں پھر اللہ کی اس بے نہایت عنایت کے احساس سے دل شکر کے جذبہ سے بھر جاتا ہے اور اس حالت میں اکثر مرحوم والدین کیلئے دعا کی توفیق بھی ملتی ہے کہ انھوں نے میرے حق میں دینی تعلیم کا فیصلہ فرمایا اور مجھے یہ دولت نصیب ہوئی بعض بزرگوں سے سنا ہے کہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کو ان کی طالب علمی کے زمانہ میں ان کے والد ماجد حضرت شاہ ولی اللہ صاحب نے تفسیر مظہری کے مصنف یعنی وقت حضرت قاضی ثناء اللہ پانی پتی کے سپرد فرماتے ہوئے ارشاد فرمایا تھا کہ اسکو قرآن سکھا دیجئے۔ حضرت شاہ عبدالعزیز رحمۃ اللہ علیہ اسی کی طرف اشارہ کرتے ہوئے شعر پڑھا کرتے تھے ؎

روحِ پدرم شاد کہ باستادِ مرا گفت
کہ فرزند مرا عشق بیاموز دگر ہیچ

(اللہ میرے والد کی روح پر رحمت کرے کہ انھوں نے میرے استاد سے فرمایا تھا کہ میرے بیٹے کو بس عشق سکھا دیجئے باقی کچھ نہیں چاہئے۔

---

[1] اس کتاب کی سات جلدیں شائع ہو چکی ہیں ـــ آٹھویں جلد کا مسودہ تقریباً تیار ہے امید ہے کہ یہ سلسلہ انشاء اللہ جلد مکمل ہوگا۔ (مرتب)

دارالعلوم کے اساتذہ اور ماحول

یہ عاجز شوال ۱۳۶۶ھ میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا۔ اس سال مشکوٰۃ شریف اور ہدایہ اخیرین وغیرہ وہ کتابیں پڑھیں جن کا دورۂ حدیث سے پہلے پڑھنا ضروری تھا اور ابھی تک میں نے نہیں پڑھی تھیں۔

مشکوٰۃ شریف حضرت مولانا سراج احمد صاحب رشیدی رحمۃ اللہ علیہ کے یہاں تھی، اس کا سبق دو گھنٹے مسلسل ہوتا تھا۔ مولانا ممدوح کو اپنے مرشد حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی قدس سرہٗ سے عشق تھا، اکثر ایسا ہوتا کہ سبق میں کسی نہ کسی سلسلہ سے ان کا ذکر آجاتا، کبھی کبھی اس تذکرہ میں مولانا کی آنکھیں آبدیدہ اور آواز گلوگیر ہو جاتی اور ایک خاص درد بھرے انداز میں مولانا یہ مصرعہ پڑھتے۔

وہ جو بیچتے تھے دوائے دل وہ دوکان اپنی بڑھا گئے

اسی زمانہ سے حضرت گنگوہی نور اللہ مرقدہٗ کی عظمت و محبت کا بیج دل میں پڑا۔

حضرت مولانا سراج احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کا ذکر آگیا تو ان کا ایک اور واقعہ بھی ذکر کرنے کا دل چاہتا ہے۔ اکثر ایسا ہوتا ہے کہ دیوبند میں جب کسی کا انتقال ہوتا ہے تو جنازہ نماز کے لئے دارالعلوم میں لے آتے ہیں اور درسگاہوں میں اطلاع کر دی جاتی ہے کہ نماز کے لئے جنازہ

آیا ہوا ہے اسی گھنٹے کے اختتام پر نماز جنازہ ہوگی" ایک دن مشکوٰۃ شریف کا سبق ہو رہا تھا، پہلا ہی گھنٹہ تھا، جنازہ کی اطلاع آئی، پہلا گھنٹہ پورا ہو جانے پر حضرت مولانا نے طلبہ کو سے فرمایا چلو، جنازہ کی نماز پڑھ لیں۔ باقی سبق بعد میں ہوگا! اس جماعت میں تقریباً ۲۵۔ طالب علم رہے ہوں گے ان میں سے صرف چار یا پانچ وضو کرنیکے لئے تیزی سے مسجد کی طرف چلے، باقی سب مولانا کے پیچھے پیچھے نودرہ کے صحن میں آ گئے جہاں نماز جنازہ ہونے والی تھی ـــ نماز سے فارغ ہونیکے بعد حضرت مولانا اور ہم سب پھر درسگاہ میں آ گئے، مولانا نے سبق شروع ہونے سے پہلے ہی بڑے درد اور تاثر کے ساتھ فرمایا آج مجھے یہ دیکھ کر بہت دکھ ہوا کہ آپ میں سے کچھ لوگ وضو کرنیکے لئے مسجد کی طرف دوڑے۔ اس سے معلوم ہوا کہ آپ لوگ حدیث شریف کے سبق میں بغیر وضو بھی بیٹھ جاتے ہیں۔ ہمارے بزرگوں کا طریقہ یہ نہیں تھا۔ حدیث کی برکتیں جب ہی حاصل ہونگی جب اسکو ادب سے پڑھا جائیگا۔ حضرت مولانا کی اس بات کا سب ہی طلبہ پر بہت اثر ہوا اور میرا اندازہ ہے کہ پھر سبھی وضو کا اہتمام کرنے لگے۔

حضرت العلام انور شاہ صاحب سے تلمذ

دوسرے سال یہ عاجز دورۂ حدیث میں شریک ہوا۔ یوں تو اسوقت دارالعلوم کے سبھی بڑے اساتذہ باکمال اپنے اپنے فن کے امام اور صلاح و تقویٰ اور تعلق باللہ میں بھی صاحب مقام تھے۔ لیکن ان میں اس وقت کے صدر المدرسین شیخ الحدیث استاذنا العلام حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیری قدس سرہٗ کا خاص الخاص مقام تھا جنھوں نے نہیں دیکھا وہ غالباً یہ تصور بھی نہ کر سکیں گے کہ چودہویں صدی ہجری اور بیسویں صدی عیسوی میں اس شان کا بھی کوئی متبحر عالم ہو سکتا ہے۔! اُن کی علمی جلالت کا کچھ اندازہ ان کے معاصر او دو قرین حضرت

مولانا شبیر احمد صاحب عثمانیؒ کی اس شہادت سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے اپنی جلیل القدر تصنیف فتح الملہم شرح صحیح مسلم میں ایک جگہ ان الفاظ میں ادا کی ہے۔

الشیخ التقی النقی الذی	وہ صاحب تقویٰ اور پاک سیرت شیخ
لم ترالعیون مثلہ و	جس کی کوئی دوسری مثال لوگوں کی
لم یرھو مثل نفسہ	آنکھوں نے نہیں دیکھی اور خود اس
ولوکان فی سالف الزمان	نے بھی اپنی کوئی مثال نہیں دیکھی ،
لکان لہ شان فی طبقۃ	اور اگر وہ پچھلے دور میں ہوئے ہوتے
اھل العلم عظیم۔ لہ	تو طبقۂ اہل علم میں ان کی بڑی عظیم شان ہوتی۔

اور حکیم الامت حضرت تھانوی قدس سرہ کا یہ ملفوظ مشہور و معروف ہے اور غالباً حضرت کے ملفوظات کے کسی مجموعہ میں طبع بھی ہو چکا ہے کہ حضرت شاہ صاحب کے بارے میں فرمایا کہ ان کا وجود اسلام کی حقانیت کی ایک روشن دلیل ہے"۔

جن اصحاب نظر نے حضرت ممدوح کو کچھ مدت تک قریب سے دیکھا ان سب کا احساس یہی ہوگا کہ وہ علوم دین کے بحر ذخار اور ورع و تقویٰ کے لحاظ سے اُن خاصان خدا میں سے تھے جن کی منجانب اللہ منکرات و معصیات سے حفاظت فرمائی جاتی ہے ــــ صورت بھی اللہ تعالیٰ نے ایسی حسین و جمیل اور معصومانہ بنائی تھی کہ دیکھنے والے بے ساختہ کہہ اٹھیں "ان ھذا الا ملک کریم"

لہ فتح الملہم ج ۱ ص ۳۳۵

شاہ صاحبؒ سے بیعت

اس زمانے میں دارالعلوم کے جو طلبا اپنی اصلاح کیلئے کسی صاحب ارشاد شیخ سے تعلق قائم کرنا چاہتے تھے وہ یا تو دیوبند ہی میں حضرت مولانا مفتی عزیزالرحمٰن صاحب مجددی نقشبندی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق قائم کرلیتے تھے' یا پھر حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں تھانہ بھون جایا کرتے تھے بعض طلبا سہارنپور جا جا کر حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ سے بھی بیعت ہوتے تھے لیکن دارالعلوم دیوبند میں میرا جو آخری سال دورۂ حدیث کا تھا اس سال کے شروع ہی میں حضرت سہارنپوری قدس سرہ مدینہ طیبہ ہجرت فرما گئے تھے اور کچھ ہی عرصہ کے بعد وہیں وصال ہوگیا۔

میں طالب علمی کے زمانہ میں' خاص کر دارالعلوم کی طالب علمی کے دو سالوں میں صرف طالب علم تھا اور اول و آخر دلچسپی بس درس و مطالعہ سے تھی ۔۔ جب سال کا اختتام قریب آیا جس کے بعد دارالعلوم میں قیام کا خاتمہ تھا تو میں نے بیعت کے مسئلہ پر سوچا میں نے محسوس کیا کہ مجھے اپنے زندہ اکابر میں سب سے زیادہ عقیدت و محبت حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے ہے اس لئے مجھے حضرت ہی سے بیعت کی درخواست کرنی چاہئے۔ لیکن یہ بات مشہور تھی اور ہم دیکھتے بھی تھے کہ وہ کسی کو بیعت نہیں فرماتے تھے ۔اسکے باوجود میں نے اپنے حق میں یہی طے کیا۔

جس دن سالانہ امتحان کا آخری پرچہ ہوا جس سے اگلے دن مجھے دیوبند سے وطن روانہ ہوجانا تھا' میں رات کو بعد عشاء حضرت کی خدمت میں دولت کدہ پر حاضر ہوا' حضرت اسوقت تنہا تھے' میں نے درخواست پیش کی' حضرت نے مجھے دوسرے اکابر کی طرف رجوع کرنے کے لئے فرمایا' لیکن جب میں نے اس کے

بعد بھی اپنی ہی بات عرض کی اور ایک درجہ میں نیازمندانہ اصرار کیا، تو قبول فرما لیا، توبہ کی تلقین اور تسبیحات اور شغلِ پاس انفاس کی تعلیم فرمائی مگر افسوس کے ساتھ اعتراف ہے کہ اس تعلق سے جتنا فائدہ اٹھانا چاہئے تھا، اپنی نااہلی اور خام کاری کی وجہ سے نہیں اٹھا سکا، اور چند ہی سال کے بعد حضرت کا وصال ہوگیا۔

اللھم اغفر لہ وانزل علی تربتہ شآبیب رحمتک ورضوانک۔

تعلیم سے فراغت کے بعد

درس وتدریس ۔ اِحقاقِ حق ۔ اور ۔ ابطالِ باطل

شعبان ۱۳۴۰ھ میں دارالعلوم سے فراغت ہوئی، اسکے اگلے سال اپنے وطن کے "مدرسہ محمدیہ" میں درس وتدریس کا سلسلہ رہا اس کے بعد بھی سلسلہ تین سال تک امروہہ کے ایک مدرسہ میں قائم رہا، جو اپنی جائے وقوع محلہ چلہ کی مناسبت سے مدرسہ چلہ کے نام سے معروف تھا، یہ وہ زمانہ تھا کہ ہندوستان میں اسلام کو چند شدید قسم کے فتنوں سے سابقہ تھا جن میں سے بعض داخلی تھے اور بعض خارجی۔ خارجی فتنہ آریہ سماج کی شدھی سنگھٹن تحریک کا تھا۔ داخلی فتنوں میں ایک طرف قادیانیت کی یلغار تھی ہر طرف ان کے مناظر اور مبلغ پھیل رہے تھے اور امت کے عقیدۂ ختم نبوت کی جڑیں کھود دینا چاہتے تھے اور دوسری طرف بریلوی مکتب شرک وبدعت نے سر اٹھا رکھا تھا۔ خلافت اور ترک موالات کی تحریک جہاں دونوں میں ملک اور ملت دونوں کے اندر فتنہ انگیز عناصر کے لئے سدِ راہ بنی تھی اُس کا زور ٹوٹتے ہی ان فتنوں نے سر اٹھایا۔ بریلوی مکتب خیال کو اس سلسلے میں ایک تازہ بتازہ فتنہ انگیز عنوان بھی ہاتھ آگیا۔ اور وہ یہ کہ ترکی خلافت عثمانیہ کا حجازی گورنر شریف حسین جو برطانوی حکومت کے دام فریب میں آکر حجاز کا خود مختار حاکم بن بیٹھا تھا، نجد کی سعودی حکومت کے سربراہ عبدالعزیز بن سعود نے اُسکے

ہاتھ سے حجازِ مقدس چھین کر اپنے دائرۂ حکومت میں شامل کر لیا تھا۔ اور پھر اپنے مسلک کے مطابق انھوں نے وہاں کے مزارات کے قبّوں کو منہدم کیا جن کو وہ اسلامی نقطۂ نظر سے منکر اور واجب الازالہ سمجھتے تھے۔

بریلوی فکر کے نمائندوں نے حجازِ پاک میں ہونے والے اس واقعے پر اپنے ردِّ عمل کے اظہار میں علمائے دیوبند کو بھی نشانہ بنا لیا جنھیں وہ سعودیوں کا ہم مذہب ٹھہرا کر "وہابی" ہی قرار دیتے تھے۔ اور اس طرح توحید و سنّت کے ان خادموں پر حملوں کا ایک سلسلہ قائم ہو گیا۔

ہمارا ضلع مرادآباد اس زمانے میں بریلوی فرقے کے مشہور زعیم و رہنما مولوی نعیم الدین صاحب کی وجہ سے اس فتنے کا خاص مرکز تھا۔ گلی کوچے بلکہ گھر گھر میں چرچا تھا۔

اس فضا سے متاثر ہو کر اس عاجز نے بریلوی فتنے کے خلاف دیوبند کے زمانۂ طالب علمی ہی سے تیاری شروع کر دی تھی۔ باقی دونوں فتنوں (قادیانیت اور آریہ سماجیت) سے مقابلے کا داعیہ اور اس کی صلاحیت بھی بفضلِ خدا اپنے اندر پائی تو تدریسی ذمہ داریوں کے ساتھ ہی ان سب کے خلاف محاذ آرائی میں حصہ لینا شروع کر دیا۔ اور اللہ نے اپنے فضل و کرم سے ہر مقابلے میں کامیابی سے سرفراز ہی نہیں کیا بلکہ اس میدان میں جد و جہد کی جو توفیق اس نے عطا فرمائی تھی اُسے وقت کے معروف و مقبول بندوں کی نگاہ میں میرے لئے وسیلۂ امتیاز و اعزاز بھی بنا دیا۔

یہ مقابلے اور مناظرے زیادہ تر بریلوی مسلک کے نمائندوں سے ہوئے۔ اور ان کی روداد یں اُسی زمانے میں شائع ہو گئی تھیں۔ مثلاً مناظرہ دَرْدُ (ضلع نینی تال یوپی) مناظرہ سنبھل۔ مناظرہ گیا (بہار)۔ مناظرہ سلا تولالی (جے پی)

مناظرۂ بریلی وغیرہ۔ اس کے بعد درجہ آریہ سماجیوں سے مناظروں کا رہا۔ اور پھر قادیانیوں سے ان میں سے جو مناظرے الفرقان کے اجرا کے بعد ہوئے انکی روداد یں الفرقان میں شائع ہو چکی ہیں۔

بریلوی مسلک کے لوگوں سے مناظروں کی نوبت جیسا کہ اشارہ کیا جاچکا ہے اُن کے اس تکفیری فتنے کی وجہ سے آئی تھی جو انھوں نے اکابر علماءِ دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری مہاجر مدنی اور حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی (رحمۃ اللہ علیہم) کے خلاف برپا کر رکھا تھا۔ یہاں تک کہ ان صاحبان علم اور باخدا بزرگوں کو ایسا کافر قرار دیا گیا تھا کہ جو کوئی ان کے کفر میں شک کرے وہ بھی کافر۔ یہ وہ حضرات تھے کہ جن کے دم سے اس ملک میں توحید و سنت کا فروغ اور شرک و بدعت کی بیخ کنی تھی۔ میں دارالعلوم کے اندر اپنی طالب علمی کے ذکر میں تذکرہ کر چکا ہوں کہ مجھے تو اس در سے جو کچھ حاصل ہوا وہ تو ہوا ہی میرے والد ماجد جو ان بزرگوں اور ان کے سلسلے سے عدم واقفیت کی بنا پر مخالفین سے سنی سنائی باتوں پر یقین کرتے ہوئے ان سے کچھ بدگمانی رکھتے تھے وہ میری طالب العلمی کے زمانے میں ایک دفعہ دیوبند تشریف لے آئے تو کچھ سننے سے پہلے وہاں کی زندگی کا غیر معمولی دینی رخ دیکھتے ہی ان کے دل کی حالت بدل گئی اور پھر رفتہ رفتہ ان کی ساری بدگمانیاں جاتی رہیں۔ ایسے بزرگوں اور ان کے سلسلے کا دفاع میرے لئے بلاشبہ دین حق کا دفاع تھا۔ اور اللہ کی اس نعمت کا کس طرح شکر ادا کروں کہ اس دفاع کے سلسلے میں میرے اندر ایک غیر معمولی جذبے اور سرشاری کی کیفیت ان دنوں میں تھی۔

پہلا مُناظرہ

اس سلسلے کا پہلا ہی مناظرہ ضلع نینی تال کی ایک چھوٹی بستی میں ہوا، جو دَرَ ڈُ کے نام سے یاد کی جاتی تھی۔ اس خاص بستی میں، جو بالکل غیر معروف قسم کی تھی، مناظرہ کا سبب ایک خاص واقعہ تھا۔ اور اس واقعہ کا ذکر اسلئے مناسب ہو گا کہ اس سے اس افسوسناک فتنہ انگیزی کا اندازہ کیا جانا آسان ہے جس سے ہمارے بریلوی مہربانوں نے سیدھے سادے مسلمانوں میں افتراق اور انتشار کی ایک آگ برپا کر رکھی تھی۔ واقعہ یہ تھا کہ ضلع نینی تال جو ہمارے ضلع مراد آباد سے تقریباً متصل ہی ہے، اس کی مشہور تجارتی بستی ہلدوانی منڈی میں حکیم محمد حنیف صاحب نامی ایک صحیح العقیدہ مسلمان ہوتے تھے۔ جو علمائے دیوبند سے اعتقاد رکھتے تھے۔ ان حکیم صاحب کے ایک عزیز کی شادی دَرَ ڈُ نامی اس گاؤں میں ہوئی۔ یہاں کی عام مسلم آبادی بریلویت سے متاثر تھی۔ اس شادی کو علاقے کے بعض بریلوی مولویوں نے حکیم صاحب کے رشتے کی بنا پر اپنی اجارہ داری کیلئے شاید خطرہ محسوس کیا اور لڑکی کے گھرانے پر دباؤ ڈالا کہ یہ شادی فسخ کی جائے۔ اسلئے کہ "بدعقیدہ" لوگوں میں ہوئی ہے۔ اس فتنہ انگیزی نے حکیم صاحب کو مجبور کیا کہ وہ اپنے بارے میں دیوبند کے تعلق سے بدعقیدگی کا الزام دور کرنے کے لئے ان فتنہ انگیزوں کو مجمع عام میں مناظرے کا چیلنج دیں۔

یہ مناظرہ محرم ۱۳۴۳ھ مطابق جولائی ۱۹۲۴ء میں ہوا، جبکہ میری عمر

۴۳ سال تھی۔ اس میں بریلوی جماعت کے مناظر مولوی رحم الٰہی صاحب تھے جو مولوی احمد رضا خاں صاحب کے مدرسہ منظر الاسلام بریلی میں شیخ الحدیث ہوتے تھے۔ مگر ابھی مناظرہ شروع نہیں ہوا تھا۔ بلکہ علاقے کے رئیس اور مجسٹریٹ جناب ثروت یار خاں صاحب کی فرمائش پر نماز ظہر کے بعد فریقین کی طرف سے عام دینی قسم کی ایک ایک تقریر کا پروگرام ہی ہوا تھا جس میں ہماری طرف سے مقرر میرے محترم ہم وطن دوست مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی تھے کہ اسکے بعد جو مناظرے کے شرائط و قواعد طے کرنے کی بات آئی تب مولوی رحم الٰہی صاحب نے گریز کی راہ پکڑتے ہوئے فرمایا کہ کسی مناظرے کی یہاں کیا ضرورت ہے؟ معلوم ہوگیا کہ یہاں کوئی نزاع نہیں ہے۔ سب ایک ہی خیال کے لوگ ہیں۔ مگر جناب ثروت یار خاں کی شخصیت کام آئی۔ اور ان کے یہ کہنے پر مولوی صاحب موصوف کو رکنا ہی پڑا کہ میں تو آج اسی لئے ہوں کہ مجھ سے لوگوں نے کہا تھا کہ آج یہاں مناظرہ ہے۔ پس میں بھی موجود ہوں تاکہ نقض امن وغیرہ کا خطرہ نہ رہے۔ غرض اس طرح سے مولوی صاحب بہ مجبوری مناظرے پر راضی ہوئے۔ اور شرائط و قواعد مناظرہ نیز موضوعات مناظرہ طے ہونے کے بعد مناظرہ کا آغاز ہوا۔

موضوع مناظرہ چار چیزیں تھیں۔ حضرت حکیم الامت مولانا اشرف علی صاحبؒ کی کتاب حفظ الایمان کی ایک عبارت جس پر کفر کا فتویٰ ان صاحبان نے لگا رکھا تھا۔ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ کی کتاب تحذیر الناس کی عبارت۔ اور حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارنپوریؒ کی تالیف براہین قاطعہ کی عبارت۔ ان دونوں پر بھی کفر کے فتوے تھے جن کے ذریعہ ناواقف مسلم عوام کو ان علماء کے حق سے بیزار کیا جاتا تھا۔ چوتھا ایک موضوع

مسئلہ علم غیب تھا۔ یعنی بریلوی مکتب فکر کا یہ عقیدہ کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو دنیا کی پیدائش سے لے کر قیامت تک ہونے والی ہر بات اور ہر شئ کا علم دے دیا گیا تھا۔

لیکن جو شخص کسی کام کیلئے مارے باندھے تیار ہوا ہو وہ ظاہر ہے کہ کیسا ثابت ہوگا۔ مولوی صاحب موصوف کا بھی یہی حال پورے مناظرے میں رہا۔ اور ان کی تقریریں سن کر حیرت ہوتی تھی کہ اتنی کچر اور فضول دلیلوں کے ساتھ یہ لوگ کیسے ہر وقت عوام میں ایک ہنگامہ ان اکابر سلمین کے خلاف اٹھائے رہتے ہیں! دو دن اِن حضرات کے تکفیری الزامات پر بحث ہوتی رہی تیسرا دن مسئلہ علم غیب کے لئے آیا۔ اور مناظرہ شروع بھی ہو گیا تو ہم لوگوں نے محسوس کیا۔ یہ ایک علمی مسئلہ ہے۔ اسکی بحث سمجھنے کیلئے یہاں کے لوگ بالکل موزوں نہیں ہیں۔ لہٰذا تجویز پیش کی گئی کہ اس بحث کا مقام بدل کر مراد آباد یا بریلی کر دیا جائے۔ مگر نہ صرف مراد آباد کے لئے بلکہ بریلی کے لئے بھی جو مولوی حشمت علی صاحب کا گڑھ اور مرکز کی مقام تھا۔ وہ کسی طرح تیار نہ ہوئے۔ اسلئے پھر سنبھل کا نام ہماری طرف سے تجویز کیا گیا جس میں تمام انتظامات کی ذمہ داری اپنے اوپر لینے کے ساتھ مولوی صاحب موصوف کو سفر خرچ بھی دینے کی پیش کش کی گئی تھی۔ اس پر مولوی صاحب بالآخر راضی ہو گئے۔

سنبھل کا مناظرہ

میرا قیام اس زمانے میں امروہہ میں تھا۔ سنبھل میں مناظرے کے انتظامات کے سلسلے میں مزید اطمینان حاصل کرنے کے بعد اگلے ہی مہینے

دصفر ۱۳۰۶ھ کے آغاز سے ہی اس مناظرے کے سلسلے میں تاریخ اور شرائط جیسی باتیں طے کرنے کیلئے اہل بریلی سے خط و کتابت شروع کر دی گئی۔ ایک ایک رجسٹری انکاری واپس آنے کے بعد دوسری رجسٹری کا جواب ۲۲ر صفر کو ان الفاظ میں ملا۔

" خیر اب ہم بالکل تیار ہیں۔ اور آمد و رفت اور خورد و نوش کے خرچ کے منتظر ہیں لہذا جلد از جلد تاریخ مناظرہ اور مقام مناظرہ کہ سنبھل میں کس جگہ ہوگا۔ اور شرائط مناظرہ مقرر فرما کر ان کے ساتھ آمد و رفت اور خورد و نوش کا خرچہ نقد روانہ فرما دیجئے "

اس کے جواب میں فوراً ہی شرائط مناظرہ کی اپنی تجویز کے ساتھ لکھا گیا کہ ان شرائط کی بعینہٖ یا ترمیم و تنسیخ کے ساتھ منظوری آنے کے بعد تاریخ مناظرہ طے کر دی جائے گی۔ اور اس تاریخ سے ایک ہفتہ قبل زادِ راہ بھی حاضر خدمت ہو جائے گا۔ یہ رجسٹرڈ جواب ۲۶ر صفر کو بھیجا گیا تھا۔ کوئی جواب نہ آیا۔ تو ۱۱ر ربیع الاول کو تقاضے کی ایک رجسٹری اور بھیجی گئی۔ اور اس کے جواب میں بھی خاموشی رہی تو تیسری ایک رجسٹری ۲۲ر ربیع الاول کو حوالۂ ڈاک ہوئی[1] تب جا کر ۲۷ر ربیع الاول کو جواب آیا۔

خط و کتابت کا یہ بیان مختصر کرتے ہوئے آخری بات یہ ہے کہ جب مناظرے کیلئے ۲۲ تا ۲۴ر جمادی الاولیٰ مقرر ہو گئی اور ادھر سے حسب وعدہ

---

[1] ڈاک کے نظام کی جو بدحالی آجکل کے ہندوستان میں ہے اس کا خیال کر کے شاید کوئی یہ سمجھ کر جواب کے لئے بہت تھوڑا وقت دیا جا رہا تھا۔ اسلئے یہ بتا دینا ضروری ہے کہ اس زمانہ میں امروہہ اور بریلی کے درمیان رجسٹرڈ خطوط کو دو تین دن سے زیادہ نہیں لگتے تھے۔

سفر خرچ کا منی آرڈر بھی چلا گیا تو بجائے کسی رسیدی جواب کے ایک اشتہار بعنوان "کھلا خط" ٹھیک ۱۲ رجمادی الاولیٰ کو موصول ہوا جس کا مضمون یہ تھا۔

جناب مولوی منظور حسن صاحب خصوصاً وجمیع وہابیہ عموماً
وارد ضلع نینی تال میں جو قرار داد ہو چکی تھی اسکے مطابق میں آپ سے
مناظرے کیلئے تیار تھا اور ہوں لیکن معلوم ہوا کہ تلمیذ رشید عزیز سعید
شیر بیشۂ اہل سنت مولوی حشمت علی خاں صاحب لکھنوی کے مقابلے
میں آپکا سارا گروہ عاجز رہا...... خدا و رسول جل جلالہ وصلی اللہ تعالیٰ
علیہ وسلم نے عزیز موصوف کو آپ کے گروہ کے مقابلے میں پانچ روشن
فتحیں دیں اور آپ کے گروہ کو پانچ بار شرمناک شکستیں دیں۔ آپ اور آپکا
گروہ سب عزیز موصوف کے مقابلے سے عاجز آ چکے۔ مناظرہ بحمد اللہ
تعالیٰ اہل سنت کی فتح مبین اور وہابیہ کی شکست مبین پر ختم ہو چکا۔
لہٰذا وہ مناظرہ جو قرار داد ضلع نینی تال کے مطابق طے ہوا تھا ختم ہو چکا۔
کہ جو لوگ میرے تلمیذ سعید کے سامنے اپنا اسلام ثابت کرنے سے عاجز رہے
وہ میرے سامنے ایک ذرا سا مسئلہ علم غیب میں لب کشائی کا کیا حق رکھتے ہیں
اب بھی اگر مناظرہ کرنا ہو تو اس کی ایک تحریر دو کہ ہمارا سارا گروہ
مولوی حشمت علی صاحب کے مقابلے سے عاجز رہا یا اپنے اکابر کو دیوبند
و تھانہ بھون سے بلاؤ تا کہ ان کا عجز و فرار بھی ایسا ہی دکھا دیا جائے۔"

مولوی رحم الٰہی صاحب نے اس اشتہار عام کے ذریعہ اپنے نزدیک اس بات کا پکا انتظام کر لیا تھا کہ مناظرے سے جان چھوٹی۔ مگر اپنا جو عالم اس زمانے میں تھا اس میں اس کی کیا گنجائش تھی۔ موصوف کو ایک نوٹس جوابی تار برقی کے

ذریعے ۲۲ر تاریخ کو دیا گیا۔

فوراً آئیے۔ ہر قسم کی بہانہ بازی کو چھوڑ دیجئے ورنہ جلد حرجے کے آپ ذمہ دار ہوں گے۔"

اور اسکے بعد موصوف کو چاروناچار آنا پڑا۔ اگرچہ پھر بھی اتنی دیر ضرور لگادی کہ ۲۴ر تاریخ کو پہنچے جو کہ مناظرے کا آخری طے شدہ دن تھا۔ اور نتیجۃً یہ مناظرہ اب ۲۴ر تا ۲۶ر ہوا۔

موصوف آتو گئے۔ مگر مناظرے کیلئے خود کھڑے ہونے کو کسی طرح تیار نہ ہوئے بلکہ اپنے ساتھ اپنے عزیز سعید المحمید رشید مولوی حشمت علی صاحب کو بلے آئے تھے۔ انہی کو اپنا وکیل بناکے کھڑا کیا۔ اور ان "عزیز سعید" نے پورے دو دن تو "سوال کچھ اور جواب کچھ" کے میدان میں اپنی مہارت دکھانے کا وہ منظر پیش کیا کہ خود اُن کی جماعت شرم سے پانی پانی ہونے لگی۔ مسئلہ زیر بحث رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے علم غیب کا تھا۔ اور وہ اپنی جوابی تقریر میں بحث کا موضوع بنا ڈالتے تھے اکابر دیوبند کے اسلام اور کفر کو۔ موضوع بحث سے ان کے فرار کی یہ کیفیت دو دن میں اتنی روشن ہو گئی کہ بالآخر اُن کی جماعت کے سر غنہ بھی تاب نہ لاسکے اور انھیں مجبور کیا کہ موضوع پر بات کریں۔ اور ان کے دعوائے علم غیب کے خلاف جو دلیل پر دلیل مسلسل پیش کی جارہی ہے اس کے جواب میں کچھ تو اپنی دلیل پبلک کے سامنے لائیں۔ اسکے نتیجے میں تیسرے دن انھیں بھی کچھ شرم آہی گئی اور کوشش شروع کی کہ دوسری طرف کی انکاری آیات واحادیث کے مقابلے میں کچھ ثبوت والی دلیلیں لائیں۔ تو اس میدان میں چونکہ اُن کی گرہ بالکل ہی خالی تھی۔ ورنہ ان کے استاذ شیخ الحدیث مولوی رحم الٰہی صاحب اس مناظرے میں آنے سے بچنے کے لئے وہ سب کچھ کیوں کرتے

جس کی تفصیل اوپر آئی۔ اسلئے اللہ تبارک وتعالیٰ کی تائید ونصرت سے اس مناظرے کے آخری دور میں یہ بات بالکل ہی روشن ہوگئی کہ عالم الغیب والشہادہ صرف اُسی کی ذات وحدہٗ لاشریک ہے اور کوئی بھی بندہ چاہے وہ نبی اور رسول کے مرتبے کا ہو۔ بلکہ ان سب میں بھی اشرف وافضل کیوں نہ ہو، اسکے لئے علم غیب کی صفت کا دعویٰ کرنا قطعی طور پر خلافِ قرآن وحدیث ہے۔ والحمد للہ تعالیٰ وسبحانہ۔

دَرَدَ اور سنبھل کے مناظروں کی تفصیلی روئیداد اُسی زمانے میں "صاعقۂ آسمانی برفرقۂ رضاخانی" کے نام سے چھپ گئی تھی اور رسائل میں موجود ہے۔ مگر یہاں اس سے زیادہ تفصیل کی گنجائش نہیں۔

آریہ سماجیوں سے پہلا مناظرہ

آریہ سماج والوں سے پہلے مناظرے کی نوبت بریلی میں آئی۔ یہ دسمبر ۱۹۳۲ء کی بات ہے۔ میرا قیام تو اس وقت تک بریلی میں نہیں ہوا تھا۔ لیکن وہاں کے مدرسہ مصباح العلوم میں میرے استاذ حضرت مولانا کریم بخش صاحب کے صاحبزادے مولانا عبدالحق صاحب کا صدر مدرس کی حیثیت سے تقرر ہوگیا تھا۔ انھوں نے اس سال مجھے اپنے مدرسے کے سالانہ جلسے میں تقریر کیلئے مدعو کیا، میری تقریر کا عنوان تھا حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی صداقت اور قرآن مجید کا وحی الٰہی ہونا۔ تقریر کے دوران میں ایک صاحب اعتراض کیلئے یا کچھ سوال کرنے کے لئے کھڑے ہوگئے۔ ان کے ساتھیوں نے بتایا کہ یہ آریہ سماجی ہندو ہیں۔ میں نے ان سے کہا کہ آپ میری تقریر کے بعد مجھ سے ملیں اور اپنی بات کہیں تب میں جواب دوں گا۔ وہ بعد میں ملے اور اپنا نام ماسٹر بلدیو پرشاد سوزن بتایا۔ اور مختصر گفتگو کے بعد انھوں نے مناظرہ کا چیلنج دیا جس کے بارے میں شہر کے دو معزز مسلمانوں نے ان سے بات چیت کرکے میری منظوری سے چھ دن کا مناظرہ طے کیا جس میں پہلے تین دن میں قرآن پاک کا وحی الٰہی ہونا موضوع بحث ہوگا۔ اور دوسرے تین دن میں وید کے بارے میں یہی بحث ہوگی۔ مگر اللہ تبارک وتعالیٰ کی مدد سے پہلے تین دن میں یہ صورت حال ہوئی کہ خود ماسٹر صاحب کی طرف کے صدر جلسہ کو

جو خود بھی گروادر ایک کالج کے پرنسپل تھے چوتھے دن ماسٹر صاحب پر رحم کھا کر یہ کہنا پڑا کہ مولانا صاحب آپکا اور ماسٹر صاحب کا کوئی مقابلہ نہیں ہے۔ اسلئے مناظرے کے مزید جاری رکھنے میں کوئی فائدہ نہیں مناسب ہے کہ اب ختم کر دیا جائے۔ اس طرح چوتھے دن ہی یہ مناظرہ خود ماسٹر صاحب کے اپنے صدر جلسہ کی فرمائش پر ختم ہوگیا۔ فالحمد للہ۔ اس کے بعد ان لوگوں سے بعض اور مناظرے ہوئے جو ۱۹۳۴ء میں الفرقان جاری ہونے کے بعد ہوئے اور ان کی روداد الفرقان میں آئی۔ اس دور کا بھی پہلا مناظرہ بریلی ہی میں مشہور سماجی مناظر پنڈت گوپی چند سے ہوا۔

الفرقان کا اجراء

ماہنامہ الفرقان جس کی اشاعت کا اسوقت (رمضان ۱۴۱۳ھ میں) باسٹھواں سال چل رہا ہے۔ اس کا اجرا بھی فی الواقع احقاقِ حق اور ابطال باطل کیلئے اس عاجز بندے کے فکر و عمل کی ہی ایک کڑی تھی۔ اس دور میں بار بار تقاضہ ہوتا رہا تھا کہ ایک ماہنامہ جاری کیا جائے۔ لیکن ہر کام کیلئے ایک وقت مقرر اور مقدر ہے۔ اس لئے عملی شکل نہیں بن پاتی تھی۔ حتیٰ کہ وہ وقت مقرر آ گیا اور ذی الحجہ ۱۳۵۲ھ میں استخارہ مسنونہ کے بعد اعلان کر دیا گیا کہ انشاء اللہ محرم ۱۳۵۳ھ سے ایک ماہنامہ الفرقان نام بریلی سے جاری ہوگا۔

عالمِ اسباب میں یہ قطعی فیصلہ اسی سال شوال کے ایک اہم واقعے کا نتیجہ تھا۔ واقعہ یہ تھا کہ ڈرڈاور سنبھل وغیرہ کے مناظروں کے بعد بریلوی فتنہ انگیزوں سے ایک اہم مناظرہ ۱۵ شوال کو لاہور میں ہونے کے لئے طے پا گیا۔ اسکی اہمیت یہ بھی کہ دیوبندی بریلوی نزاع کی تاریخ میں پہلی بار فریقین اس بات پر متفق ہوئے تھے کہ مناظرے میں کسی کو حَکَم اور جج بنا لیا جائے۔ اور اسکا فیصلہ اس قضیے کو جو ہندوستانی امت مسلمہ کیلئے نہایت مہلک اور اضطراب انگیز ہے ہمیشہ کیلئے ختم کر دے۔ اور اس مقصد کے لئے تین ناموں پر بھی فریقین کا اتفاق ہو گیا تھا۔ یہ نام تھے ڈاکٹر سر محمد اقبال۔ مولانا اصغر علی روحی سابق پروفیسر اسلامیہ کالج لاہور، اور

شیخ صادق حسن بیرسٹرایٹ لا - امرتسر۔ ڈاکٹر علامہ اقبال کے مرتبے اور مقام کے بارے میں تو کچھ کہنے کی ضرورت ہی نہیں۔ باقی دونوں حضرات بھی اپنے زمانے میں خاص کر پنجاب کے علاقہ میں نہایت مؤثر اور معزز شخصیتوں کے مالک تھے۔ اس لئے اس عاجز کی نظر میں یہ ہونے والا مناظرہ مسلمانانِ ہند کی تاریخ کا ایک یادگار ورق بننے جا رہا تھا۔ اور لازم تھا کہ کوئی چیز اس کی راہ میں اپنے امکان بھر حائل نہ ہونے دی جائے۔ چنانچہ بریلوی فریق کی ایک ایسی شرط بھی اس سلسلے میں منظور کی گئی جس کا کوئی جواز بھی انکے لئے نہ تھا اور ہمارے لئے اسکا پورا کرنا آسان بھی نہ تھا۔

شرط یہ تھی کہ جس طرح وہ اپنے لئے طے کرتے ہیں کہ اُن کی طرف سے مناظر مولوی حامد رضا خاں صاحب ہوں گے یا اُن کا وکیل۔ اسی طرح ہم اہل دیوبند کی طرف سے بھی یہ مانا جائے کہ حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی مناظر ہوں گے یا ان کا وکیل۔

ہماری طرف سے بھی مُناظر کا نام ہمارا مقابل فریق طے کرے ایسی عجیب وغریب بات شاید ہی کبھی کسی کے سننے میں آئی ہو!! اور پھر جو نام تجویز فرمایا گیا تھا یعنی حضرت مولانا اشرف علی صاحب تھانوی؟ اُن کے بارے میں دنیا جانتی تھی کہ بریلوی جماعت کے معاندانہ اور ہٹ دھرمانہ رویوں کا تجربہ فرمانے کے بعد حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے اپنے اصولوں کی رو سے انکو کبھی قابل خطاب ہی نہ سمجھا تھا پس بذات خود ان کے مقابلے میں مناظر بننے کے لئے لاہور تشریف لانے کا تو سوال ہی کیا تھا، اپنی طرف سے کسی کو وکیل اور مجاز بنا دیں یہ بھی مشکل بات تھی۔ بظاہر اس قطعی نامعقول شرط کی وجہ یہی تھی کہ یہ بریلوی حضرات سمجھتے تھے کہ مولانا تھانوی صاحب خود

توکیا آویں گے وہ اپنا وکیل بھی کسی کو بنانے کے لئے تیار نہیں ہونگے۔ پس مناظرہ ہی نہ ہوگا۔ اور اُن کی یہ کوشش (کہ مناظرہ ٹل جائے) اس لئے ہونی ہی چاہئے تھی کہ یہ جج اور حکم والی ہماری شرط انھوں نے بظاہر مان تو لی تھی۔ مگر یہ اُن کے مان کی بات نہ تھی۔ اسلئے کہ اکابر دیوبند کے خلاف اُن کی تکفیری مہم کے کسی غلط فہمی اور سنجیدگی پر مبنی ہونے کی کوئی علامت نہیں پائی جاتی تھی۔ اس کے برعکس تمام علامتیں اس بات کی تھیں کہ یہ ایک سوچے سمجھے کاروبار والی مہم ہے۔ لیکن یہاں چونکہ یہ طے کر لیا گیا تھا کہ کچھ بھی ہو اس تاریخی موقع کو ضائع نہیں ہونے دینا ہے۔ اس لئے جب بریلوی فریق ثانی اس ناروا شرط کے بارے میں کچھ بھی سننے کو تیار نہ ہوا تو یہ بھی مان لی گئی۔ اور سوچ لیا گیا کہ انشاء اللہ حضرت حکیم الامت (تھانوی) رحمۃ اللہ علیہ معاملے کی اس خاص نوعیت کے پیش نظر خدام کی بات قبول فرمالیں گے۔ اور ہم میں سے کسی کے نام کا وکالت نامہ تحریر فرمادیں گے۔

الحمدللہ کہ یہ توقع پوری ہوئی اور حضرت رحمۃ اللہ علیہ نے حسب ذیل وکالت نامہ تحریر فرمادیا

مقام تھانہ بھون ۵ رمضان ۱۳۵۲ھ

بعد حمد و صلوٰۃ جس دینی کلام سے کسی کو خطاب کیا جاوے وہ اگر محض تبلیغ ہے تو عبادت ہے اور یہ ایک صورت ہے، اس کے بعد اگر مخاطب محض تحقیق حق کیلئے کوئی سوال کرے تو اسکو جواب دینا بھی عبادت ہے اور یہ دوسری صورت ہے اور ان دونوں خدمتوں کیلئے ہر مسلمان جن میں احقر بھی ہے حاضر ہے۔ اور اگر محض جدال ہی مقصود ہے تو اس کو جواب نہ دینا اور اعراض کرنا بھی جائز ہے اور

سکوت میں جو مذبذبین کے ضرر کا شبہ ہوتا ہے تو اس ضرر کا خود مذبذبین کی تفہیم سے دفع کرنا ممکن ہے۔ خواہ ابتداءً یا ان کے سوال کے بعد۔ اور میرا یہی مذاق ہے۔

اس تمہید کے بعد عرض ہے کہ رسالۂ "حفظ الایمان" مؤلفہ احقر پر اعتراض کرنے والوں کے متعلق میرا عمل ہمیشہ سے اپنے مذاق کے موافق رہا ہے کہ نفس مسئلہ کی تبلیغ اور مترددین کی تسلی کے لیے خود رسالۂ "حفظ الایمان"، "بسط البنان"، "تغییر العنوان" لکھ چکا اور جاحدین کو کہیں خطاب نہیں کیا مگر بعض احباب بعض مواقع میں دوسرے مذاق پر عمل کرنے کو نافع سمجھتے ہیں اور ان بعض مواقع پر بعض حالات کے اقتضاء سے اس نافعیت میں اسکی حاجت ہے کہ اس تفہیم کے لیے میں کسی کو اپنا وکیل بنا دوں اسلئے سہولت سے میں اپنی طرف سے اس تفہیم کے لیے ان بزرگوں کو اپنا وکیل بناتا ہوں۔

حضرت مولانا حسین احمد صاحب فیض آبادی۔ جناب مولانا محمد منظور صاحب سنبھلی مولانا ابوالوفا صاحب شاہجہانپوری۔ مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی

دام فیضہم جمیعاً

اللہ تعالیٰ ان حضرات کے ارشاد و تفہیم میں نفع و برکت بخشے ان ارید الا الاصلاح ما استطعت وما توفیقی الا باللہ

کتبہٗ اشرف علی تھانوی حنفی چشتی

یہ وکالت نامہ لے کر یہ خاکسار (محمد منظور نعمانی) اور مولانا ابوالوفا صاحب نیز مولانا محمد اسمٰعیل صاحب سنبھلی (رحمۃ اللہ علیہما) تاریخ مناظرہ سے تین چار دن پہلے ہی لاہور پہونچ گئے۔

جیسا کہ ابھی عرض کیا گیا کہ دیوبندی مناظر کے لئے حضرت حکیم الامت کی طرف سے وکالت نامے کی شرط لگانے کا مقصد سوائے اسکے کچھ نہیں ہو سکتا تھا کہ یہ شرط پوری نہ ہو سکے گی۔ اور اس طرح اس مناظرے سے جان چھوٹ جائے گی جس میں ایسے معروف دعوؤں اور مستند حضرات کو حکم بنانا مان لیا گیا ہے اس اندازے کی پوری تصدیق ہم لوگوں کے لاہور پہونچنے پر اس طرح ہو گئی کہ وکالت نامہ سامنے آجانے پر مناظرے سے دو دن پیشتر بریلوی حضرات کا ایک وفد جس میں مولوی حشمت علی صاحب مولوی عبدالحفیظ صاحب اور مولوی سید محمود صاحب ناظم حزب الاحناف وغیرہ شامل تھے ہمارے پاس آیا۔ اور ایک نئی شرط یہ عائد کی کہ اس وکالت نامے کی تصدیق جماعت دیوبند کے دو مستند عالموں کو کرنی ہوگی۔ ہم نے تو ہر قیمت پر مناظرہ ہو جانا طے کیا ہوا تھا، اس لئے جب اُن کو بضد دیکھا تو اس کو بھی مان لیا۔ یہاں بھی ان کو ناکامی ہوئی اور مناظرہ رہ جانے کا بہانہ نہ مل سکا تو اگلے دن ایک نیا شگوفہ کھلایا۔ کہ مناظرہ کی جگہ کے سلسلے میں اگرچہ یہ طے ہو چکا تھا اور تحریر میں آچکا تھا کہ جج صاحبان اگر مجمع عام والے مناظرے میں حصہ لینے کو تیار نہ ہوئے تو بس ایک ایک مناظر اور دس دس تحسین مجلس مناظرہ میں شریک ہوں گے۔ مگر جب ان جج صاحبان نے اس تجویز اور معاہدے کی روح اور اسپرٹ کے مطابق یہ بھی چاہا کہ مناظرے کی مجلس کسی تخلیے کی (پرائیویٹ) جگہ میں ہو نہ کسی ایسی جگہ پر کہ جہاں عام مجمع ہو سکتا ہو تو اِن حضرات نے ان کی اس بات کو ماننے سے انکار کر دیا۔ اور بغیر ہمارے مشورے یا علم و اطلاع کے اشتہار شائع کر دیا کہ مناظرے کا مقام مسجد وزیر خاں ہوگی جو کہ لاہور میں بریلوی حضرات کا مرکز تھی مزید یہ

الکل خلافِ واقعہ طور پر یہی شائع کیا علامہ اقبال اور مولانا اروحی نے کسی حالت میں بھی ثالثی کرنے سے انکار کردیا ہے۔ جس کی تردید خود ان دونوں حضرات کی طرف سے اخبارات اور اشتہارات میں نکلی۔ ہم نے اس سب کے باوجود طے کئے رکھا کہ مناظرے سے انکار ہمیں نہیں کرنا ہے۔ جنانچہ ۱۵ شوال کی مقررہ تاریخ کو ہم لوگ اُن حضرات کے شائع کردہ اشتہار کے مطابق مسجد وزیرخاں میں پہونچ گئے۔

اب مجمع عام میں حضرت تھانوی (رحمۃ اللہ علیہ) کا وکالت نامہ پیش کیا گیا تو دو مستند دیوبندی علماء کی طرف سے اسکی تصدیق والی بریلوی شرط پوری کرنے کے لئے انہی حضرات کی طرف سے لئے گئے ناموں کے مطابق حضرت مولانا احمد علی صاحب لاہوری اور مولانا عبد الحنان خطیب اسٹریلیا مسجد نے وہیں اسکی تصدیق تحریراً کردی۔

یہ قصہ میں اتنی تفصیل کے ساتھ اسلئے لکھ رہا ہوں کہ اپنے رنگ کا ایک غیر معمولی عبرت انگیز قصہ ہے۔ قصہ ہے شیطان کے کسی پر مسلط ہوجانے کا کہ جب بدقسمتی سے ایسا ہوجاتا ہے تو پھر ایک فرد یا ایک گروہ کیسی کیسی ناقابل تصور باتیں بے دھڑک کرسکتا ہے۔ اس تصدیقی تحریر کی بات سامنے آنے کے بعد کسی کے ذہن میں کوئی شبہ اس بارے میں نہ رہا ہوگا۔ کہ اب مناظرے کی بساط بچھ گئی ہوگی۔ مگر نہیں۔ اب ایک نیا مطالبہ ہوا اور وہ یہ کہ لاہور کے دیوبندی علماء تحریر دیں کہ ہم محمد منظور کو مولانا اشرف علی تھانوی صاحب کا وکیل تسلیم کرتے ہیں: مطلوبہ تحریر کی یہ عبارت مولوی حامد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی کی تجویز فرمودہ تھی۔ جو ان کی طرف کے صدر جلسہ جناب مولوی سید حبیب صاحب

ایڈیٹر:- بار سیاست لاہور کے ذریعہ ہم لوگوں تک آئی۔ کیسی بھی معقول آدمی کے ذہن میں کوئی تنگ اس مزید مطالبے کی آسکتی ہے؟ مگر اس کی نامعقولیت سے بھی صرف نظر کر کے موجودہ علماء دیوبند کی طرف سے تحریر دیدی گئی تاکہ کسی طرح تو مناظرہ ہو۔ اور اسی لئے یہ ان کی مضحکہ خیز بات بھی قبول کر لی گئی کہ مولوی حامد رضا خاں صاحب جو بریلوی جماعت کے سربراہ تھے وہ مناظرے میں تشریف تو رکھیں گے۔ مگر مناظرہ ان کی طرف سے ان کے وکیل کی حیثیت سے مولوی حشمت علی صاحب کریں گے۔ اس کے لیے موصوف نے تحریر عطا فرمائی کہ

"میں لاہور کے فیصلہ کن مناظرے کے لئے اپنی طرف سے مولوی حشمت علی صاحب سلمہٗ کو اپنا وکیل مطلق بناتا ہوں۔ وکیل موصوف کا قول، قبول، عدول سب میرا ہے اور ان کی فتح و شکست میری فتح و شکست ہے۔"

یہ مرحلہ طے ہونے کے بعد اب اس عاجز کے اور مولوی حشمت علی صاحب کے درمیان مناظرے کے طریق کار پر باضابطہ گفتگو شروع ہوئی اور اس سلسلے میں میری یہ شرط مولوی صاحب موصوف نے مان لی کہ مناظرے میں مدعی کی پوزیشن میری ہوگی۔ لیکن اس کے بعد اپنے لئے وہ حق طلب کیا جو فن مناظرہ کی اصطلاح میں مجیب کا حق ہوتا ہے۔ یعنی ہر بحث میں آخری اور اختتامی تقریر کا حق۔ حالانکہ اس حق کے اصول و قواعد کی رو سے یہ حق مدعی کا ہوتا ہے اور اسی کو اصطلاحی مجیب کی پوزیشن حاصل ہوتی ہے۔ موصوف نے اس میں بحث کرنی چاہی تو ان کو اس فن کی مستند اور مسلم کتاب رشیدیہ دکھائی گئی جس کا اُن کے پاس کوئی معقول جواب

نہ تھا اور نہ ہو سکتا تھا۔ لیکن وہ اپنی بے قاعدہ ضد سے باز آنے کے لئے تیار نہ تھے حتیٰ کہ انکی طرف کے صدر جلسہ نے مجبور ہو کر اس عاجز ہی سے پوچھا کہ اچھا تو اب کیسے اس نزاع کا فیصلہ ہو؟ تب اُن سے عرض کیا گیا کہ پروفیسر مولانا اصغر علی صاحب روحی جن کا نام آپ حضرات ہی کی تحریک پر ججوں میں شامل ہوا تھا میں اس معاملہ میں ان کو حکم تسلیم کرتا ہوں وہ جو فیصلہ فرمادینگے میں قبول کرلوں گا۔ لیکن مولوی حشمت علی صاحب اسکو قبول کرنے کے لئے بھی آمادہ نہ ہوئے حتیٰ کہ پہلا دن تمام ہوگیا۔

دوسرا دن (۲۷ شوال ۱۳۵۲ھ) پھر اسی بحث سے شروع ہوا۔ اس دن بریلوی فریق کے صدر جلسہ محمد شاہ صاحب تھے اس بحث کے سلسلے میں اس عاجز کے دلائل سننے کے بعد موصوف نے فرمایا کہ میں اگر مناظر ہوتا تو آپ کی بات مان لیتا۔ مگر اپنے مناظر کو میں اس کے لئے مجبور نہیں کرسکوں گا۔ اور اسکے بعد انھوں نے سمجھوتے کی ایک تجویز پیش کی کہ مناظرے میں چونکہ چار بحثیں ہونا ہیں۔ اسلئے سمجھوتے کے طور پر اسے قبول کرلیا جائے کہ دو بحثوں میں ایک فریق مجیب ہو اور دوسری دو میں دوسرا فریق۔ ہم لوگوں نے اسے بھی قبول کیا۔ اور چار میں سے دو بحثوں میں آخری تقریر کا حق مولوی حشمت علی صاحب کے لئے بالکل خلاف قاعدہ طور پر مان لیا۔

مگر شرطوں کی زنبیل خالی ہونے کا نام نہیں لیتی تھی۔ اب ایک اور شرط پٹارے میں سے نکل آئی کہ تقریریں لفظ بہ لفظ لکھی جائیں اور اصل موکلین کے دستخط اُن پر کرائے جائیں۔ اسے بھی مان لیا گیا۔ یعنی مناظرے کو ٹالنے کا یہ حیلہ بھی ناکام بنادیا گیا، تو پھر ایک اور شرط نکلنے لگی۔ مجبوراً اب اس عاجز نے کہا کہ شرطوں کا قصہ ختم کیجئے۔ میں بلا شرط مناظرہ شروع کرتا ہوں

اور یہ کہہ کر خطبۂ مسنونہ سے آغاز کرکے مولوی احمد رضا خاں صاحب کے مرتب کردہ فتوائے حسام الحرمین کے خلاف اپنے دعوے کی تقریر شروع کردی[1] اور اس تقریر کا جواب بریلوی سمت سے اس ہنگامہ آرائی اور شور و شر سے دیا گیا جس نے پولیس کو مداخلت کرنے اور مناظرہ کا پروگرام ختم کرا دینے پر مجبور کیا یعنی مناظرہ بہر حال نہیں ہوسکا۔

اس کے بعد یہ عاجز لاہور سے واپس ہوکر جو ۲۰ رشوال کو مرادآباد پہنچا تو اس مناظرے سے متعلق بریلوی فتح مبین کے پوسٹر لگے ہوئے تھے۔ یا للعجب۔ یہ اکابر بریلویت مولوی حامد رضا خاں صاحب اور مولوی نعیم الدین صاحب مرادآبادی اس درجہ کی دروغ گوئی بھی پسند کرسکتے ہیں!

یہ تھا وہ خاص واقعہ جس نے ایک ماہنامہ جاری کرنے کے دلی تقاضے کو اس منزل پر پہونچا دیا کہ دو مہینے کے اندر ہی اندر الفرقان نامی ماہنامے کا بریلی سے اجراء طے ہوگیا اور اعلان نکل گیا۔

۲۰ رشوال کو بریلوی پوسٹر دیکھ کر اگلے ہی دن ایک رجسٹرڈ نوٹس بنام مولوی حامد رضا خاں صاحب (سجادہ نشین آستانہ رضویہ۔ بریلی) روانہ کیا جس میں اس پوسٹر کے حوالے سے انیس سوالات تھے۔ جو الفرقان کے پہلے ہی شمارے (محرم ۱۳۵۳ھ) میں شائع ہوچکے ہیں۔ آخری سوال جو اصل مقصد کو پیش کرنے والا سوال تھا وہ یہ تھا کہ

---

[1] اسی فتوے کی چار بحثوں پر مناظرہ طے ہوا تھا۔ یہ بحثیں اکابر دیوبند حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی، حضرت مولانا رشید احمد گنگوہی، حضرت مولانا خلیل احمد سہارنپوری اور حضرت حکیم الامت تھانوی رحمۃ اللہ علیہم پر الزامات سے متعلق تھیں۔

"لاہور کے مناظرے سے جس بری طرح آپ نے فرار اختیار کیا۔ اُس کا حال تو آپ کا ضمیر خوب جانتا ہو گا۔ لیکن کیا اب آپ اس کے لئے تیار ہو سکتے ہیں کہ اس موضوع پر میرے اور آپ کے درمیان بذریعہ خط و کتابت تحریری مناظرہ ہو۔ اور بعد اختتام فریقین کی تمام تحریریں بغرض فیصلہ اُن تینوں حضرات کے سامنے پیش کر دی جائیں جو لاہور کے اُس فیصلہ کن مناظرہ کیلئے باتفاق فریقین حَکَم مقرر ہوئے تھے۔ اگر آپ اسکے لئے آمادہ ہوں تو فوراً مطلع فرمائیں۔ تاکہ میں یہاں سے اپنا بیان و دعویٰ روانہ کروں جس میں بعونہ تعالیٰ اس ناچیز نے ثابت کر دیا ہے کہ آپ کے والد ماجد کی حسام الحرمین کے فتوے کفر علماء اہل خلاف دیانت و امانت اور سراسر جہالت یا محض عناد پر مبنی ہے۔۔۔"

چالیس دن سے زیادہ گزرنے پر بھی جب خاں صاحب موصوف کا کوئی جواب نہ آیا تو ایک دوسرا نوٹس دیا گیا۔ جس کا مضمون تمہیدی سطروں کے بعد حسب ذیل تھا۔

"آج پھر خالصاً لوجہ اللہ اور نُصحاً للعباد اللہ میں آپ کو اس طرف توجہ دلاتا ہوں کہ محض توفیق خداوندی سے اس وقت ہمارا اور آپکا اتفاق ہندوستان کے تین مشہور اور قابل اعتماد عمائد (یعنی ڈاکٹر سر محمد اقبال مولانا اصغر علی صاحب روحی، شیخ صادق حسن صاحب بیرسٹر ایٹ لاء ایم ایل اے امرتسر) پر ہو گیا ہے، اور فریقین نے ان کو حَکَم تسلیم کر لیا ہے۔ خدارا اس لطیفہ غیبی سے فائدہ اٹھائیے اور مسلمانوں کو فائدہ اٹھانے کا موقع دیجئے اور اسکی آسان ترین صورت وہی ہے جو میں پیش کر چکا ہوں کہ لاہور کے طے شدہ مباحث پر انھیں شرائط کے ساتھ میرے اور آپ کے درمیان

بذریعہ خط وکتابت تحریری مناظرہ ہو اور بعد اختتام وہ تمام تحریریں حضرات ثالثین کی خدمت میں بغرض فیصلہ پیش کر دی جائیں۔ اور ان کے بعد ان کے فیصلہ کے ساتھ ملک میں شائع کر دی جائیں۔ اس کے لئے فریقین کے کہیں اجتماع کی بھی ضرورت نہیں اپنے اپنے مقام پر رہتے ہوئے بھی یہ کام ہو سکتا ہے لیکن بایں ہمہ اگر کسی وجہ سے آپ اجتماع ضروری سمجھیں تو بندہ خود اپنے کرایہ سے بریلی جناب کے دولتکدہ پر حاضر ہو سکتا ہے۔ اور ہر حال آپ کو اختیار ہوگا کہ میری تحریر کا جواب آپ خود لکھیں یا اپنے وکیل سے لکھوائیں مکرر گزارش ہے کہ خدارا مسلمانوں کی پراگندہ حالی پر رحم فرمایئے اور مسلہ فریقین ثالثین کے فیصلہ پر اس تباہ کن جنگ کو ختم کر دیجئے۔ والسلام علیٰ اهل الاسلام۔

خاکسار محمد منظور نعمانی

یہ دوسرا نوٹس جس وقت بھیجا گیا۔ اس وقت بہ فضل اللہ کے عزم مصمم پر کر لیا گیا تھا کہ آئندہ محرم (۱۳۵۳ھ) سے الفرقان نامی ماہنامہ جاری کیا جائے گا۔ اور بریلی سے ہی جاری کیا جائے گا۔ اور اگر اس دوسرے نوٹس کا بھی جواب نہ آیا جیسا کہ بظاہر یقینی ہے۔ تو ان دونوں نوٹسوں کے متن کے ساتھ ساتھ اپنے اس بیان دعوے کی اشاعت بھی الفرقان میں شروع کر دی جائے گی جس کو اس مجوزہ تحریری مناظرے میں پیش کرنا مقصود ہے۔ تاکہ عام مسلمانوں کے ساتھ ساتھ ان تین مؤقر حکم صاحبان کے سامنے بھی مولوی احمد رضا خاں صاحب کے فتوے حسام الحرمین کی حقیقت آسکے۔ اور اس فریب کارانہ فتوے کے ذریعہ ملت اسلامیہ ہند کو جس باہمی جنگ وجدال میں پھنسا دیا گیا ہے۔ اُس سے نجات کی کچھ راہ کھلے۔

پس یہ لاہور کا مجوزہ فیصلہ کن مناظرہ تھا جو بظاہر اسباب الفرقان کو وجود میں لانے کا باعث بنا۔

مسلسل نصرت و عنایتِ حق کا تجربہ

آج جبکہ الفرقان کے اجراء کو ساٹھ سال سے اوپر گزر چکے ہیں۔ یہ بندۂ عاجز پیچھے کی طرف پلٹ کر دیکھتا ہے تو دل اللہ کے شکر اور اس کی حمد و ثنا سے لبریز ہو جاتا ہے کہ ایک کمزور اور تن تنہا انسان کے فیصلے اور ارادہ کو اس نے کیسی قوت بخشی۔ الفرقان جاری کرنے کا یہ فیصلہ بالکل ہی بے سر و سامانی کے عالم میں محض توکلاً علی اللہ کیا گیا تھا۔ چنانچہ آغاز ہی سے مسلسل دقتوں اور ناسازگاریوں کا سایہ رہا۔ مگر ہمت اپنے ربِ کریم کی اعانت کے آسرے پر بندھی رہی۔ اور اگر کبھی اس میں شکست کے آثار پیدا ہوئے تو مالک کی مدد و اعانت کا ہاتھ کسی نہ کسی شکل میں ضرور سامنے آ گیا۔ اور اُدْعُوْنِیْٓ اَسْتَجِبْ لَكُمْ (تم مجھے پکارو میں سنوں گا۔ قرآن سورۂ بقرہ) کی نوید کے مطابق اپنے بندے کی وہ پکار سنی گئی جو اس نے الفرقان کی کشتی دریائے عمل میں اتارتے ہوئے ذیل کے الفاظ میں بلند کی تھی۔

"اے ساری کائنات کے پروردگار! تیرا ایک عاجز اور سیاہ کار بندہ تیری ہی جلالت والے نام اور عظمت والے کلام سے شروع کرتا ہے۔ تو اس کے ارادوں میں برکت عطا فرما، اور اس کے دل کو صدقِ نیت اور اخلاص کی توفیق عطا فرما۔

خدا وندا! میں پیادہ پا چل رہا اور وادی خار دار میں پھنستا ہوں اور راستے میں ہزاروں خونخوار۔ میری کشتی شکستہ ہے اور سامنے حوادث کا

طوفان! مگر تری نصرت ساتھ دے تو بیڑا پار ہے اور اُسی کے بھروسے پر تیرے اس کمزور بندے نے ہمت باندھی ہے ؎

دریں دریائے بے پایاں دریں طوفانِ موج افزا
دل افگندیم بسم اللہ مجریھا و مُرساھا ،،

(محرم ۱۳۵۳ھ)

الفرقان کے اجراء کا اعلان کیا گیا تو اس کا استقبال بہت حوصلہ افزا تھا۔ چنانچہ پہلے ہی شمارے میں اس عاجز کے لکھے ہوئے یہ الفاظ ملتے ہیں کہ :-

"مجھے ہرگز امید نہ تھی کہ مجھ جیسے عاجز بندے کے ایک اعلان پر الفرقان کے اسقدر چاہنے والے پیدا ہو جائیں گے۔ خدا کے فضل و کرم سے صرف ماہ ذی الحجہ (۱۳۵۲ھ) میں اتنی درخواستیں آگئیں کہ اگر چند روز یہی رفتار باقی رہی تو امید ہے کہ انشاء اللہ عنقریب الفرقان ایک کامیاب رسالہ ہو جائے گا اور اپنے تمام مصارف خود برداشت کریگا"

(محرم ۱۳۵۳ھ)

لیکن دوسرے ہی پرچے میں یہ لکھنے کی نوبت آئی کہ

"جیسا کہ محرم کے پرچے میں عرض کیا گیا تھا ذی الحجہ میں الفرقان کی خریداری کی رفتار بہت زیادہ حوصلہ افزا رہی اور میں سمجھتا تھا کہ اگر دو چار مہینے یہی حال رہا تو بہت جلد انشاء اللہ الفرقان اپنے پیروں پر کھڑا ہونے کے قابل ہو جائے گا لیکن افسوس کہ محرم ہی سے اس میں انحطاط شروع ہو گیا اور صفر میں تو گویا صفر ہی رہا" (صفر ۱۳۵۳ھ)

اس کے بعد یہ کہہ کر کہ "لیکن میں مایوس نہیں ہوں" احباب اور خاص کر

علماء کرام اور برادرانِ قاسمی سے اپیل کی گئی تھی کہ وہ الفرقان کے مقصد کو دیکھتے ہوئے اس کی حیات و بقاء کے سلسلے میں اپنا فرض محسوس کریں۔

تہی دستی کی وہ حالت جس کے ماتحت یہ سب لکھا گیا تھا یہ تھی کہ ربیع الاول کا شمارہ چھپوانے کے لئے اس عاجز کے پاس ایک پیسہ بھی نہیں تھا۔ خدا غریق رحمت کرے میری اہلیہ مرحومہ[1] (والدۂ مولوی عتیق الرحمٰن و حافظ حفیظ الرحمٰن) کو کہ میں نے اُن سے کہا کہ کیا تمھارے پاس کچھ روپے ہوں گے جو مجھے قرض دیدو؟ مرحومہ کے پاس ستر بہتر روپے نکلے جو انھوں نے بخوشی مجھے دے دیئے۔ اور اس زمانہ میں بس اتنی ہی رقم ایک شمارہ تیار کرنے کیلئے کافی تھی۔ چنانچہ میں رسالہ کی کتابت لے کر فوراً دہلی روانہ ہو گیا جہاں اُس زمانے میں الفرقان کی طباعت ہوا کرتی تھی اسلئے کہ بریلی میں اس وقت کوئی اچھا پریس نہ تھا۔

ربیع الاول کا یعنی تیسرا شمارہ تو نکل گیا۔ مگر اب اسکے آگے کے لئے کیا ہو؟ ہر ماہ ایک شمارہ نکال کر آئندہ والے کیلئے یہی سوال سامنے آتا تھا اور تقریباً ہر مہینے تعاون کی اپیل مختلف انداز سے دہراتے دہراتے گیارہویں نمبر یعنی ذیقعدہ کے شمارہ میں یہ لکھ دینے پر مجبور ہونا پڑا کہ

پہلو بشگافید و ببینید دلم را
تا چند بگویم کہ جان است چنیں نیست[2]

---

[1] ان کا انتقال [illegible] ۱۹۴۳ء میں بریلی ہی کے زمانۂ قیام میں ہوا۔ عمر کل چالیس سال پائی نہایت صابرہ و شاکرہ تھیں۔ اور میرے لئے ہر لحاظ سے ذریعۂ راحت۔

[2] سینہ چیرو اور دل کا حال بذاتِ خود دیکھو، کہیں کہاں تک بتاؤں کہ ایسا ہے اور ایسا ہے۔

حالات و مشکلات سے مجبور ہو کر گزشتہ نمبر میں میں نے اپنی اور الفرقان کی حالتِ زار لکھ دی تھی۔ اور مجھے کافی توقع تھی کہ درد انگیز داستان سے الفرقان کا ہر ناظر تھوڑی دیر کے لئے ضرور بے چین ہو جائے گا اور اسکی توسیع و اشاعت کیلئے (جو اس کی زندگی کی کلید ہے) امکانی طاقت صرف کر دے گا اور ہفتہ عشرہ کے اندر پانچسو کی مقررہ تعداد پوری ہو جائے گی۔ لیکن افسوس ہے کہ رسالہ کی اشاعت کو آج پندرہ دن سے زیادہ ہو گئے۔ مگر ابتک چند مخصوص احباب کے سوا (جن کی تعداد دس سے زیادہ نہیں) کسی طرف سے کوئی آواز نہیں آئی اور وا حسرتا! کہ میری وہ درد بھری پکار صدا بصحرا ہو کر رہ گئی فالی اللہ اشتکی وھو المستعان۔

اب احباب کے اس تغافل نے رہی سہی ہمت بھی توڑ دی اور آج صفائی کے ساتھ میں یہ عرض کر دینے پر مجبور ہوں کہ بحالت موجودہ الفرقان کو آئندہ سال جاری رکھنے کی مجھ میں طاقت نہیں ہے، میں نے بہت چاہا کہ ہمت شکست نہ کھائے اور جس طرح ابتک الفرقان کو چلایا ہے آئندہ بھی چلتا رہے، لیکن یہ دنیا عالم اسباب ہے اور کوئی کام اس وقت تک باقی نہیں رہ سکتا جب تک کہ کم از کم اس کا جمع خرچ برابر نہ ہو یا اسکے لئے کوئی ایسا خزانہ ہاتھ نہ آجائے جسکے ختم ہو جانیکا کبھی خوف نہ ہو"

یہ گویا آئندہ سے الفرقان جاری نہ رکھ سکنے کا اعلان تھا۔ مگر رب کریم کی رحمت و نصرت نے مجھے تنہا نہ چھوڑا اور وہ بات پوری ہو کر رہی اور آج تک ہو رہی ہے جو میری پریشانی اور بے بسی کا مذکورہ بالا حال پڑھ کر میرے

ایک بزرگ نے (جن کا نام ظاہر کرنے کی مجھے اجازت نہ تھی) تحریر فرمائی کہ

فکر نہ کرو، ہمت نہ ہارو، کارساز حقیقی کی اعانت تمہارے ساتھ
ہے اور اس وقت اس کی مشیت یہی ہے کہ الفرقان ابھی دنیا میں زندہ
رہے۔ (ذی الحجہ ۱۳۸۲ھ)

خانصاحب عبداللطیف خاں کا مشورہ

ابھی ذکر کر چکا ہوں کہ الفرقان کی چھپائی دہلی میں ہوا کرتی تھی میں خود ہی اس کی کتابت کرا کے کاپیاں دہلی بھیجتا اور چھپوا کر بریلی لاتا تھا۔ دہلی کے جس پریس (جامعہ پریس) میں الفرقان کی طباعت ہوتی تھی اس کے مالک خاں صاحب عبداللطیف خاں سے پہلے ہی سے کچھ تعارف و تعلق تھا۔ پہلے شمارے کی کاپیاں لے کر گیا اور خاں صاحب کے حوالے کرنے لگا تو انھوں نے بڑے خلوص کے ساتھ فرمایا کہ مولانا! میری ایک حیثیت یہ ہے کہ میں یہ پریس چلا رہا ہوں، اس لحاظ سے مجھے چاہئے کہ میں آپ کا کام فوراً ہاتھ میں لے لوں اور آپکا رسالہ چھاپ کر چھپائی آپ سے وصول کر لوں، لیکن مجھے آپ سے مخلصانہ تعلق بھی ہے اس لئے میں اپنے تجربہ کی بنا پر آپ کو مشورہ دینا ضروری سمجھتا ہوں ——— اس ایک دو سال میں کئی ایک دینی مذہبی رسالے نئے جاری ہوئے، میرے ہی پریس میں چھپتے تھے۔ کسی کے دو تین نمبر نکل سکے، کسی کے چار پانچ، کسی کے اس سے ایک دو زیادہ، اور پھر بند ہو گئے کیونکہ وہ لوگ اس سے زیادہ خسارہ برداشت نہیں کر سکتے تھے ——— اسلئے میرا مشورہ یہ ہے کہ اگر آپ کے پاس سرمائے کا اتنا انتظام ہے کہ دو تین سال تک رسالہ خسارہ کے ساتھ جاری ر کھ سکیں، تب تو آپ اس کو شروع کریں، اور اگر اتنا

انتظام نہیں ہے تو اس کا خیال چھوڑ دیں۔ اس شمارہ کی کتابت پر جو کچھ خرچ آپ کر چکے ہیں اسی کا نقصان برداشت کر لیں ـــــــــــ میں نے خاں صاحب کے اس مخلصانہ مشورہ کا شکریہ ادا کیا اور عرض کیا کہ اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اس طرف سے اطمینان ہے ـــــــــــ خاں صاحب نے کاپیاں لے لیں اور دوسرے یا تیسرے دن میں چھپا چھپایا رسالہ لے کر بریلی واپس آگیا ـــــــ اور واقعہ یہ تھا کہ میرے پاس صرف اتنا انتظام تھا کہ بس دو مہینے کے شمارے چھپ سکتے تھے ـــــ وہ توکل تو مجھے اب تک نصیب نہیں جس کے بارے میں فرمایا گیا ہے ـــــــــ وَمَنۡ يَّتَوَكَّلۡ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسۡبُهٗ ۔ (جو بندہ اللہ پر توکل کرے اس کی کاربراری کے لئے اللہ کافی ہے) لیکن اُس وقت بس اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے امید کر کے میں نے خاں صاحب سے وہ بات کہہ دی تھی۔

عبداللطیف خاں صاحب نے ایسی ہی تجربہ کارانہ بات فرمائی تھی کہ ہر مہینے ہی اس کی سچائی کا تجربہ ہوتا رہا۔ مگر رحیم و کریم مالک کی رحیمی و کریمی کے قربان کہ اس نے میری تمامتر تہی مائیگی کے باوجود الفرقان بند ہو جانے کی نوبت نہ آنے دی۔ اور بلاشبہ یہ اس کارسازِ حقیقی کے مشیت ہی کا فیصلہ تھا کہ الفرقان زندہ رہے۔ چنانچہ مسلسل دشواریوں اور پیہم نشیب و فراز کے زیر اثر سنہ ۱۳۷۱ھ مطابق سنہ ۱۹۵۲ء میں جب اس عاجز کی ہمت جواب ہی دے گئی اور الفرقان کی اشاعت بند کر دینے کا فیصلہ کر لیا گیا تو اللہ نے میرے بڑے بیٹے مولوی عتیق الرحمٰن سلمہ اللہ تعالیٰ کے دل میں ڈالا کہ وہ اسکو آئندہ جاری رکھنے کی تمام ذمہ داری اپنے سر لے لیں اور اس طرح صرف چار ماہ کے عارضی وقفے کے بعد اسکی اشاعت

کا سلسلہ بحال ہوگیا۔ اور تقریباً بیس سال تک (جبتک کہ عزیز موصوف اپنی صحت کی خرابی کی بنا پر اس ذمہ داری سے معذور نہ ہوگئے) الفرقان اس طرح نکلتا رہا کہ یہ عاجز اسکے مصارف کی فکر سے بالکل آزاد تھا۔

مولوی عتیق الرحمٰن کی صحت نے ان کو الفرقان کی ذمہ داری کے سلسلے میں معذور کر دیا تب بھی بحمداللہ اسکے بند ہونے کی نوبت نہ آئی اور اس عاجز نے ایک بار اور یہ سوچ کر اسکا بار اٹھا لینے کی ہمت اپنے اندر پائی کہ اس کی عمر کے پچاس سال پورے ہو جائیں تب تک اسکو کسی طرح جاری ہی رکھا جائے۔ اور جب یہ وقت آیا تو مشیت الٰہی نے میرے سب سے چھوٹے بیٹے مولوی خلیل الرحمٰن سجاد کو اس قابل کر دیا کہ وہ اس ذمہ داری کو اٹھا لینے کی پیش کش کریں۔ اور اس طرح بحمداللہ وہ اس وقت تک جاری ہے۔ اللھم لک الحمد ولک الشکر لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

الفرقان کی افادیت اور وجہ شکر

الفرقان کبھی بھی مالی منفعت کا ذریعہ نہیں رہا۔ کم از کم ابتدائی بیس سال میں تو سراسر مالی پریشانی کا موجب ہی بنا رہا۔ اسکے باوجود اسکا سلسلہ جاری رہنے پر اللہ تبارک تعالیٰ کا بے انتہا شکر اور اس کی حمد اسلئے ہے کہ اس کے ذریعہ بندگان خدا کو مختلف طریقوں سے دینی فائدہ پہنچتا رہا اسکے اوّل دور میں کتنے ہی مسلمان اس کی بدولت مشرکانہ رسوم و عقائد سے تائب ہوکر اخلاصِ توحید و اتباعِ سنت کے راستے پر آئے۔ ہندوستان میں جن اہل علم بزرگوں کے دم سے توحید و سنت کا فروغ اور اس کی حفاظت و حمایت تھی یعنی حضرت شاہ اسمٰعیل شہید دہلوی حضرت مولانا رشید احمد گنگوہیؒ حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی اور حضرت مولانا اشرف علی تھانوی، حضرت مولانا خلیل احمد صاحب سہارن پوری وغیرہ ان کے بارے میں بدعقیدگی اور بدگوئی سے اپنا نامۂ اعمال سیاہ کرنے والوں کو ان سے عقیدت و محبت کی دولت نصیب ہوئی۔ اور بریلی کے رضا خانی فتنے کی حقیقت و اصلیت واضح کرنے میں جو کام الفرقان کے ذریعہ انجام پایا، اس کے بارے میں تو یہ کہنے میں کوئی مضائقہ ان شاء اللہ نہیں ہوگا کہ وہ ابھی تک یکتا و یگانہ ہے۔ اور یہ سب بلاشبہ محض اللہ کی توفیق و نصرت سے ہوا ورنہ ایک تن تنہا پردیسی بندے کی کیا طاقت تھی کہ وہ عین بریلی ہی میں بیٹھ کر یہ کام انجام دیتا!

الفرقان کی یہ افادیت، بحمد اللہ اسکے روز اول ہی سے ایسی نمایاں ہوئی کہ اکابر وقت کی نگاہوں میں وہ قابل قدر قرار پا گیا۔ اپنی بے سرو سامانی کے ساتھ ساتھ الفرقان کو جاری رکھنے کی جو جدو جہد اس عاجز کی طرف سے ہو رہی تھی اسکو چھ سات مہینے سے زیادہ نہیں گزرے تھے کہ ان اکابر نے اس میں اپنی تائید کا وزن شامل کرنے کے لئے ایک پرزور اپیل قوم سے ان الفاظ میں جاری فرمائی۔

الفرقان کے لئے

اکابرِ ملّت کی اپیل

باسمہٖ تعالیٰ حامداً و مصلیاً

رسالہ الفرقان جناب مولانا محمد منظور صاحب نعمانی کی ادارت میں سات آٹھ مہینے سے جاری ہے اس کا مقصد وحید جیسا کہ معلوم ہوا ہے دین الٰہی کی اشاعت توحید و سنت کی حمایت و حفاظت ہے اور پوری تیز رفتاری کے ساتھ وہ اپنے اس مقصد کی طرف گامزن ہے اس مبارک مقصد کی اہمیت اور ضرورت سے تو کسی کو انکار نہیں ہو سکتا۔

مگر یہ بھی ظاہر ہے کہ مولانا محمد منظور صاحب الفرقان کے ذریعہ جو کام کر رہے ہیں وہ ان کا ذاتی نہیں بلکہ خالص دینی کام ہے اور تائید اہل سنت و تردید اہل بدعت کے سلسلے میں جو خدمات وہ انجام دے رہے ہیں در حقیقت پوری جماعت کی طرف سے ایک فرض کفایہ ادا کر رہے ہیں۔

اندریں حالات چاہئے تو یہ تھا کہ جماعت پوری گرم جوشی کے ساتھ

الفرقان کی آواز کو پائدار اور وسیع کرنے کی کوشش کرتی اور مسلمانوں کی کوئی بستی ایسی نہ ہوتی جہاں الفرقان نہ پہونچا ہوتا لیکن یہ معلوم کرکے افسوس ہوا کہ جماعت کے تغافل کی وجہ سے الفرقان کی اشاعت نہایت محدود ہے جس کی وجہ سے اس کی مالی حالت بھی نازک ہے بلکہ سرمایہ کی پریشانیوں کی وجہ سے اسکا بقا بھی خطرے میں ہے۔

لہذا مسلمانانِ اہل سنت سے پرزور اپیل کی جاتی ہے کہ وہ الفرقان کو ایک دینی مبلغ اور مذہبی داعی سمجھتے ہوئے اسکے دائرۂ اشاعت کو وسیع کرنے کی انتہائی جدوجہد کریں اور کوشش کریں کہ الفرقان کی آواز ہر شہر۔ ہر قصبہ اور ہر گاؤں میں پہونچ جائے۔ مدارس اسلامیہ کے مہتمم صاحبان اسکو مدارس کے نام جاری کرائیں اور طلبہ سے اسکا مطالعہ کرائیں، حضرات علماء وطلبہ کو چاہئے کہ وہ خود بھی الفرقان کا مطالعہ فرمائیں اور اسکی آواز کو وسیع کرنے کی ممکن سعی سے دریغ نہ فرمائیں۔ یہ زمانہ سخت فتنوں کا ہے اور الفرقان کا خصوصی نصب العین تمام جدید و قدیم فتنوں کا استیصال ہے۔ واللہ الموفق

دعا ہے کہ ہماری یہ اپیل ضائع نہ جائے۔ اور اللہ تعالیٰ بہت جلد الفرقان کو بامِ ترقی پر پہونچائے اور اسکو اپنے مقاصد حسنہ میں کامیاب فرمائے وَمَا ھُوَ عَلَی اللّٰہِ بِعَزِیْز

دستخط حضرات علماء کرام و مشائخ عظام دامت فیوضہم و برکاتہم

(امیر الہند شیخ الاسلام حضرت مولانا سید حسین احمد غفرلہ شیخ الحدیث دار العلوم دیوبند) (حضرت علامہ مفتی) محمد کفایت اللہ غفرلہ (صدر جمعیۃ علماء ہند دہلی) (حضرت علامہ مولانا شبیر احمد عثمانی عفا اللہ عنہ) (شیخ الحدیث والتفسیر) (حضرت مولانا مولوی حافظ)

محمد عبد اللطیف (صاحب ناظم مظاہر علوم سہارنپور) خطیب امت حضرت مولانا سید عطاء اللہ شاہ بخاری غفرلہ (امیر شریعت پنجاب) رئیس الاحرار حضرت مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی عفی عنہ (صدر مجلس احرار) (حضرت مولانا) احمد علی غفرلہ (امیر انجمن خدام الدین لاہور) (حضرت مولانا مفتی) محمد نعیم لدھیانوی عفا اللہ عنہ (حضرت مولانا) سید مرتضیٰ حسن عفی عنہ (حضرت مولانا) محمد طیب غفرلہ (مہتمم دار العلوم دیوبند) (حضرت مولانا) محمد اسعد اللہ عفا عنہ مولاہ (ناظم اسلام و مدرس مظاہر علوم) (حضرت مولانا) حبیب الرحمٰن اعظمی غفرلہ (صدر مدرس مفتاح العلوم مئو اعظم گڑھ) (الفرقان بابت رمضان وشوال ۱۳۵۳ھ)

مجدد الف ثانی نمبر

اسی دور کے خاص قابلِ شکر کاموں میں الفرقان کا مجدد الف ثانی نمبر ہے جو اس بے سروسامانی کے دور کی یادگار ہے جس کا بیان اوپر ہوا۔ مگر اللہ نے اسی حال میں یہ کام اس شان سے کرایا کہ حضرت مجددؒ کے بارے میں یہ آج تک حوالے کی کتاب کے طور پر استعمال ہو رہا ہے۔ اور اس موضوع پر کوئی مصنف اس سے بے نیازی برتنا جائز نہیں رکھتا۔

حضرت مجددؒ کا جو احسان ہندوستانی مسلمانوں پر توحید و سنت کے باب میں ہے یعنی یہ کہ دسویں صدی ہجری کے ہندوستان میں مشرکانہ اور مبتدعانہ افکار و خیالات کا جو اندھیرا مسلمانوں پر چھا گیا تھا وہ آپ ہی کے دم سے دور ہوا۔ الفرقان کے اس خاص نمبر نے آپ کے اس تجدیدی کام کو اجاگر کرنے اور اس سے ملنے والی روشنی کو از سر نو پھیلانے کا کام تو کیا ہی۔ اسکے علاوہ حضرت مجددؒ کا جو کارنامہ اس نمبر کے ذریعہ دنیا کے سامنے

ایک مرتب اور مدلل شکل میں آیا وہ اکبر کے الحادی فتنے "دینِ الٰہی" کے توڑ میں آپ کی وہ جراتمندانہ اور حکیمانہ جدوجہد ہے جس نے اکبر کے بعد جہانگیر کے زمانے سے حکومت کا رخ بدل دیا اور بالآخر اورنگ زیب عالمگیر جیسا حکمراں اکبر کے تخت پر بیٹھا۔ حضرت مجددؒ کے اس خاص کارنامے کا تعارف مولانا سید مناظر احسن گیلانی رحمۃ اللہ علیہ کے قلم سے ہوا جو الفرقان کے ساتھ بڑی خصوصیت کا معاملہ کرتے تھے اور ایک زمانے میں اس کے مدیر اعزازی بھی رہے۔

اس نمبر کی ایک اور قابلِ ذکر خصوصیت حضرت مولانا عبدالشکور فاروقی لکھنوی رحمۃ اللہ علیہ کا مقالہ تھا جس نے حضرت مجددؒ کے سلسلۂ بیعت و ارشاد پر اس پہلو سے روشنی ڈالی کہ یہ سلسلہ ہندوستان سے باہر کی دنیا میں کہاں سے کہاں تک اور کس طرح پھیلا ہوا تھا۔ اور اللہ نے کیسی مقبولیت اور برکت اس مجددی سلسلے کو بخشی۔ یہ عاجز گنہگار بندہ الفرقان کے اس خصوصی نمبر کو اپنے بڑے حسنات میں گمان کرتا ہے جس کی توفیق اسے عطا ہوئی اور اللہ کی ذات سے امید ہے کہ اس کے اس گمان کی لاج آخرت میں رکھ لی جائے گی۔

فتنۂ مشرقی کا رد

الفرقان کے اسی دور میں جبکہ وہ اپنی ساری توجہ شرک و بدعت کے خلاف مرکوز کیے ہوئے تھا۔ ایک فتنہ علامہ عنایت اللہ مشرقی کی خاکسار تحریک کی شکل میں بھی رونما ہو چکا تھا۔ اور الفرقان کی اشاعت کے پانچویں چھٹے سال میں جبکہ الفرقان کا یہ دورِ اول ختم ہو رہا تھا۔ (اسلئے کہ ہندوستان میں ایک بڑی سیاسی تبدیلی کے آثار نے کچھ نئے مسائل کو توجہ

طلب بنا دیا تھا) یہ خاکساری فتنہ آناً فاناً بہت نمایاں ہوگیا۔ الحمد للہ کہ الفرقان کو اسکے خلاف برسرپیکار ہونے اور اسکے اثرات کو رد کرنے کی بھی توفیق ملی۔

مشرقی کے مقاصد غالباً سیاسی نوعیت کے تھے۔ مگر لبادہ انھوں نے مسلمانوں کے مذہبی خیالات کی "اصلاح"[1] کا اوڑھ لیا تھا اور اس لبادے میں اسلام کو مغربی مادہ پرستی کے طرز پر ایک بالکل مادہ پرستانہ نظریۂ زندگی کے رنگ میں رنگنے کا بیڑا اٹھایا ہوا تھا۔ اس نظریہ کی اشاعت اور مقبولیت کے لئے موصوف نے خاکسار تحریک کے نام سے ایک تنظیم کی بنیاد ڈالی جس کا نظم اور ڈھانچہ ایک فوجی تنظیم کے انداز پر تھا۔ اسمیں قواعد پریڈ اور اسلحہ برداری وغیرہ سب کچھ تھا۔ مسلمانوں کے نوجوان اور پرجوش طبقے کے لئے اس انداز کی تنظیم میں قدرتی طور سے ایک خاص کشش تھی اور اسلام کی مادہ پرستانہ تعبیر میں اُس الحاد زدہ طبقے کیلئے کشش تھی جو مسلمان تو کہلانا چاہتا تھا مگر ان اعتقادی اور عملی پابندیوں سے آزاد رہ کر جو کہ اسلام کا جزو لاینفک تھیں۔ نیز ایسی ہر تحریک کی طرح اس تحریک کو بھی اسلام دشمن قوتوں کی خفیہ ہمدردیاں حاصل ہونا ایک یقینی سی بات تھی۔ نتیجتاً اسکا حلقۂ اثر تیزی سے وسیع ہونے لگا اور کتنے ہی مسلمان اصل اسلام کو "مولوی کا غلط مذہب"[1] قرار دے کر ذہنی ارتداد کی گود میں جانے لگے۔ اس فتنہ انگیز تحریک کے مقابلے میں بھی الفرقان کو ایک بھرپور اور یگانہ طریقے سے میدان عمل میں آنے کی توفیق ملی۔ اور تحریری جہاد کے علاوہ کچھ عملی جدوجہد کی سعادت بھی اس بندۂ عاجز کے حصے میں اس سلسلے میں آئی۔

---

[1] یہ مشرقی کی اصطلاح تھی۔

اس داستان کا ایک صفحہ

خاکسار تحریک اب ایک بھولی بسری کہانی ہو چکی ہے۔ مگر وہ ہماری تاریخ کا ایک قابل عبرت باب ہے۔ اسلئے اچھا ہوگا کہ اسکے بارے میں الفرقان کے ایک دو صفحے یہاں نقل کر دیے جائیں

الفرقان کی چھٹی جلد (۱۳۵۷ھ) میں تین ماہ کے شماروں پر مشتمل ایک خاص نمبر اسی تحریک کے بارے میں نکالا گیا ہے جو پورا کا پورا اس عاجز کے ایک مقالے پر مشتمل تھا اس کی تمہید میں ذیل کی سطریں لکھی گئی تھیں۔

خاکسار تحریک اور ہمارا فرض

"خاکسار تحریک کا مسئلہ اس وقت مسلمانان ہند کے اہم ترین مسائل میں سے ہو گیا ہے اور وہ اس مقام پر پہونچ چکا ہے کہ اگر چند روز یہی رفتار رہی تو پھر اسکی مذہبی اور سیاسی مضرتوں اور ملت پر مرتب ہونے والے اس کے مہلک اثرات اور بدترین نتائج کا انسداد و دفاع اگر محال نہیں تو قریب بہ محال ضرور ہو جائے گا۔ لیکن یہ دیکھ کر افسوس ہوتا ہے کہ اسکی اس اہمیت کو سمجھنے والے اور اسکے خطرناک عواقب کا ادراک رکھنے والے ہندوستان بھر میں شاید گنتی کے چند ہیں۔ ہماری یہ بہت بڑی غلطی ہے کہ ہم کسی فتنے کی اہمیت کو اس وقت تک محسوس نہیں کرتے جب تک وہ سیلابی کیفیت نہ اختیار کر لے حالانکہ ؎

سر چشمہ باید گرفتن بہ میل　　چو پر شد نشاید گذشتن بہ پیل

اس سلسلے میں پہلی اور سب سے پہلی ضرورت ہے ایسے لٹریچر کی تیاری
اور اسکی زیادہ سے زیادہ اشاعت کی جس میں نہایت صحیح و سنجیدہ اور
منقح طور پر اس تحریک کی حقیقت، اسکے مقصد و منتہا اور اسکے اثرات و
نتائج کو بیان کیا جائے تاکہ جو مسلمان ابھی اس بارہ میں گمراہ نہیں کئے
جا سکے ہیں یا جو صرف سرسری طور پر اس عام نظر سے اسکے مخالف ہیں کہ یہ بھی
منجملہ دوسری گمراہ اور غلط و مذہبی و سیاسی جماعتوں کے ایک جماعت ہے
اور اس سے زیادہ کوئی غیر معمولی اہمیت ان کے نزدیک اسکی نہیں ہے۔
وہ اس کی حقیقت اور خصوصی اہمیت کو سمجھ سکیں اور اس سلسلہ میں ان
پر حفاظت امت اور حمایت دین و ملت کا جو خاص وقتی فریضہ عائد ہوتا
ہے اسکے ادا کرنے کیلئے کمربستہ ہو جائیں۔ نیز اللہ کے جو سادہ دل او نیک
بندے اسلامی نوعی تنظیم کے فریب میں آکر اور اچھرہ کے ادارۂ عالیہ[1] کے
بے بنیاد مگر محض خالی از حقیقت پروپیگنڈے سے متاثر ہو کر اس میں شامل
ہو گئے ہیں وہ بھی ٹھنڈے دل اور سنجیدہ دماغ کے ساتھ اسکو دیکھ کر اپنی حالت
اور اپنے رویہ پر نظر ثانی کر سکیں۔ ظاہر ہے کہ ایسے لٹریچر کی تیاری اور اشاعت
ایک دو شخصوں کا کام نہیں ہے ضرورت ہے کہ جس سے بھی اس سلسلے میں کچھ
ہو سکتا ہو وہ کرے اور جس قدر ہو سکتا ہو اس قدر کرے۔ اور جن اخبارات
میں اس قسم کے مضامین شائع کرائے جا سکتے ہوں ان میں کرائے جائیں اور
اس کے لئے عملی کوشش کا کوئی دقیقہ فروگذاشت نہ کیا جائے اس سلسلہ
میں میرا جو مقالہ اس وقت آپ کے ہاتھوں میں ہے امید ہے کہ انشاء اللہ اس

---

[1] لاہور کا محلہ اچھرہ اس تحریک کا مرکز تھا جس کا نام ادارۂ عالیہ رکھا گیا تھا۔

مقصد کے لئے مفید ثابت ہوگا اور عام ناظرین کے علاوہ جو حضرات اس تحریک کے متعلق مزید لٹریچر کی تیاری کا ارادہ رکھتے ہیں یا اس میں کوئی حصہ لینا چاہیں گے ان کو بھی اس سے خاکسار تحریک کی حقیقت سمجھنے میں اچھی طرح مدد مل سکے گی اس مقالہ میں میرا مطمح نظر صرف اسی قدر رہا ہے کہ نفس "تحریک خاکساران" کا مقصد و منتہا اسکے حالیہ اثرات اور آئندہ کے متوقع نتائج کو ناظرین علی وجہ البصیرت سمجھ سکیں۔ اسی لئے اس میں میں نے بانی تحریک علامہ مشرقی کے عقائد و خیالات سے براہ راست تعرض نہیں کیا ہے بلکہ تحریک کے رخ اسکے مقصد و منتہا اور اسکے پس منظر کو سمجھ لینے کیلئے ان کے جن خاص خیالات و نظریات سے واقفیت کی ضرورت تھی صرف انہیں کو میں نے اس میں ذکر کیا ہے۔

آئندہ بھی "الفرقان" میں اس موضوع پر انشاء اللہ التزام اور تسلسل کے ساتھ مضامین درج ہوا کریں گے۔ دوسرے اہل قلم حضرات بھی اگر خاکسار تحریک کے متعلق کچھ لکھ کر بھیجیں تو شکریہ کے ساتھ الفرقان میں شائع کیا جائے گا۔ بشرطیکہ سنجیدگی اور ذمہ داری کا لحاظ رکھتے ہوئے لکھا گیا ہو اور کوئی مفید تحقیقی بات کہی گئی ہو۔"

الفرقان کے اس نمبر کی افادیت کے تعلق سے یہ واقعہ اللہ کے خصوصی شکر کے ساتھ قابل ذکر ہے کہ مولانا عبدالماجد دریابادی کے ہفت روزہ "سچ" میں خاکسار تحریک کی تحسین و تائید کا رجحان چل رہا تھا الفرقان کے اس نمبر سے مولانا کے خیالات میں تبدیلی آئی۔ نمبر کو پڑھتے ہی مولانا مرحوم نے جو خط عاجز کو لکھا اس میں چند پتے بھی تھے کہ ان پر یہ نمبر بھجوا دیا جائے اور اس کا ڈاک خرچ بھی ساتھ رکھا ہوا تھا۔ فللہ الحمد۔

شاہ ولی اللہ نمبر

حضرت مجدد الف ثانی نمبر کی طرح الفرقان کا ایک دوسرا خصوصی نمبر جس کو یہ بندہ الفرقان کے ذریعہ اپنے نصیب میں آنے والے حسنات میں سے ایسا ہی ایک دوسرا اہم حسنہ سمجھتا ہے، اور اس کیلئے اللہ کا صمیم قلب سے شکر گزار ہے حضرت شاہ ولی اللہ نمبر تھا جو ۱۳۵۹ھ میں شائع ہوا جس کا مقصد تذکار شاہ ولی اللہ کی تجدید تھی۔ اس نمبر کو بھی مجدد الف ثانی نمبر کی طرح بلکہ اس سے بڑھکر ہی علمی وقعت حاصل ہوئی۔ اس کی ایک نہایت اہم خصوصیت حضرت مولانا عبید اللہ سندھی رحمۃ اللہ علیہ کا مبسوط مقالہ تھا جس نے حضرت شاہ ولی اللہ کو سمجھنے کا ایک بالکل نیا باب اہل فکر کے آگے کھولا۔ اس میں مولانا سندھی نے شاہ ولی اللہ کے جامع فکر کی جس طرح ترجمانی کی اُس سے کوئی چاہے کسی درجہ کا اختلاف بھی کرے (اور خود اس عاجز کو بھی اسکے بعض مقامات پر اشکال تھا اور اس کا اظہار حواشی میں کیا گیا تھا) لیکن شاہ صاحب کے بارے میں فکر و نظر کا ایک نیا باب کھول دینے اور دعوت غور و فکر دینے کے لئے اُس کا اعتراف ناگزیر ہے۔ الحمد للہ کہ اس نمبر کو اہل علم و دین میں کچھ زیادہ ہی مقبولیت حاصل ہوئی فوراً ہی دوسرا ایڈیشن تیار کرانا پڑا۔ یہ تقریباً چار سو صفحے کا ضخیم نمبر تھا۔ بعد ازاں اس کا کتابی ایڈیشن بھی نکلا۔

حضرت شاہ ولی اللہ ہندوستان کی وہ واحد دینی اور علمی شخصیت ہیں جن کا دینی احترام اور صاحب فکر و نظر ہونے کا اعتقاد مسلم ہندوستان کے ہر با شعور طبقے میں وسیع پیمانے پر پایا جاتا ہے۔ اور اس لئے ان کے افکار و علوم کی ترویج و اشاعت سے بڑے خیر کی

توقع کی جاسکتی ہے۔ الفرقان کے شاہ ولی اللہ نمبر کی اشاعت کی توفیق اسی پہلو سے اس بندے پر اللہ کا ایک بڑا احسان و کرم ہے خاص کر وہ مالی مشکلات دیکھتے ہوئے جن میں الفرقان برابر گرفتار رہا۔

الفرقان کا دوسرا دور

الفرقان کی اشاعت کا سلسلہ جیسا کہ اوپر ذکر آچکا، ۱۳۵۲ھ مطابق ۱۹۳۳ء میں شروع ہوا تھا۔ اور اس کا ایک مخصوص اور محدود دائرہ کار تھا۔ ۱۹۳۵ء سے ہندوستان میں ایک بڑی تبدیلی کا آغاز ہوا۔ یہ ۳۵ء کے انڈیا ایکٹ کا نفاذ تھا جس کے ذریعہ برطانوی حکومت نے ہندوستانیوں کو کچھ زیادہ حکومتی اختیارات منتقل کرنے کا سلسلہ شروع کیا تھا۔ اس ایکٹ کے ماتحت صوبوں میں انتخابات ہوئے اور پھر جیتنے والی پارٹیوں کی صوبائی حکومتیں بنیں۔ یعنی ہندوستان آزادی کی اس منزل پر پہونچنے لگا جس کے لئے ایک عرصۂ دراز سے جد وجہد جاری تھی۔ اس صورت حال کے پیدا ہوتے ہی یہ سوالات اٹھنے شروع ہوئے کہ ملک کی آزادی کی صورت میں مسلمانوں کا دینی مستقبل کیا ہے؟ اور مسلمانوں کو اس مستقبل کے تحفظ کیلئے کیا کرنا ہوگا؟ اس سوال کو اس وقت کے ایک نمایاں صاحب قلم مولانا ابوالاعلیٰ مودودی نے اپنے ماہنامہ ترجمان القرآن میں بہت غیر معمولی انداز پر اٹھایا اور ایک عرصے تک موضوع بنائے رکھا۔ مودودی صاحب اس سے پہلے جمعیۃ علماء ہند کے اخبار "مسلم" کے ایڈیٹر رہے تھے اور اس زمانے میں ان کے قلم سے "الجہاد فی الاسلام" نامی کتاب نے اُن کا ایک خاص علمی اعتبار اسی طرح اہل علم ودین میں قائم کر دیا تھا جیسے مولانا آزاد کا اُن کے الہلال کے دور میں۔ موصوف کے اس سلسلۂ مضامین نے اس عاجز کو متاثر کیا اور رفتہ رفتہ

یہ ذہن بن گیا کہ چند اعتقادی اور عملی مسائل، جن میں مسلمانوں کے بعض طبقے افراط و تفریط اور غلطیوں میں مبتلا ہیں اُن کی بابت اصلاحی جد وجہد تک اپنی سرگرمیوں کو محدود رکھنے کے بجائے وہ میدانِ عمل اختیار کیا جانا چاہئے جس کے ذریعہ مسلمان آنے والے نئے حالات سے عہدہ برا ہونے کے قابل ہوسکیں۔

یہ عاجز محسوس کرتا ہے کہ یہ اللہ تبارک وتعالیٰ کی طرف سے بہت بروقت اور صحیح رہنمائی تھی اور اسکے ذریعے اس بندے پر ایک خیر کثیر کا دروازہ کھلا اور پھر جب اس نئے ذہن اور نئے تقاضے کے ماتحت اس بندے کے قدم اولاً اُس راہ کی طرف اُٹھ گئے جو اب اُسکے نزدیک فکر و نظر کی ایک غلطی تھی یعنی مولانا ابوالاعلیٰ مودودی کے زیر قیادت جماعت اسلامی کی تاسیس۔ تب بھی توفیق الٰہی میری دستگیری کیلئے مہربان ہوئی اور بالکل ابتدائی مرحلے ہی میں ایسے حالات پیدا ہوگئے کہ میرے قدم واپس ہوں۔ اور اگرچہ الٹے پاؤں واپسی کا یہ مرحلہ نفسیاتی طور پر بڑا ہی سخت تھا۔ اسلئے کہ اس جماعت کی بنیاد ڈالنے کی کوشش میں، میں مودودی صاحب سے بھی کچھ آگے ہی تھا۔ نیز لوگوں کو بڑی قوت سے اس کی طرف دعوت دی تھی اور اعتراضات کے مقابلے میں اس کی بھرپور مدافعت کی تھی۔ مگر بس ایک مختصر سی کشمکش کے بعد اللہ نے میرے لئے یہ واپسی کا فیصلہ بھی آسان کیا۔ اور علیحدگی اختیار کرنے کے بعد اس کا بقدر ضرورت اعلان بھی الفرقان کے صفحات میں کردیا۔ اور بلاشبہ یہ میرے مالک کا میرے اوپر بڑا احسان تھا کہ واپسی کے اس فیصلے میں دنیا کی شرم دامن گیر نہ ہوسکی[1] ـــــ بلکہ

[1] جن حضرات کو اس قصے کی تفصیل جاننے سے دلچسپی ہو وہ میری کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگذشت" کو ملاحظہ فرمائیں۔

"تحدیثِ نعمت" کے ضمن میں میرے لئے یہ بات مستقل طور سے کہنے کی ہے کہ اللہ نے میرے لئے یہ بات بالعموم ہی آسان رکھی کہ اپنی غلطی کا اعتراف کرنے سے نہ شرماؤں اور حتی المقدور اس کی تلافی کی بھی کوشش کروں۔ اور یقیناً وہ چیز ہے کہ اللہ اگر توفیق نہ دے انسان کے بس کا کام نہیں!

نئے میدانِ عمل کی رہنمائی

اور یہ بھی محض اللہ تبارک تعالیٰ ہی کی عنایت و رحمت تھی کہ اس فکر کے احساس نے جو صدمہ پہنچایا تھا۔ کہ اس سے پہلے اتنا بڑا کوئی صدمہ یاد نہیں۔ اس صدمے اور تلخ تجربے کے نتیجے میں میرا یہ جذبہ کہ کچھ کرتے رہنا چاہئے سرد نہیں پڑا۔ ملکی و عالمی سطح کے حالات کی غیر معمولی تبدیلیوں کے اشارے پاکر عملی سلسلے میں جو وسیع تر نقطۂ نظر ذہن نے اپنا لیا تھا اس کے ماتحت میدانِ عمل اور طریقِ عمل کی تلاش میں طبیعت برابر سرگرم رہی حتیٰ کہ حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ کی خدمت میں رسائی ہوئی۔ اور آپ نے مسلمانوں میں عوامی پیمانے پر اپنی زندگی کے احیاء کی جو تحریک شروع کی ہوئی تھی۔ (جسے تبلیغ کے عوامی نام سے یاد کیا جاتا ہے) اُس میں اپنے حالات کے مطابق حصہ لینے کی توفیق میسر آگئی[1]

الفرقان اور تبلیغی تحریک

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی تحریک کا کام صرف دل و زبان اور عملی

---

[1] حضرت مولاناؒ کی خدمت میں رسائی اور اس تحریک میں شرکت کیلئے میرا دل کھلنے کی تفصیل کتاب کے دوسرے حصے میں مستقل عنوان کے ساتھ آئے گی۔

نقل وحرکت سے تعلق رکھتا تھا۔ قلم اور تحریر کا اس میں کوئی حصہ نہ تھا۔ یا نہ ہونے کے برابر تھا۔ مگر میری ذات کے ساتھ الفرقان ایسا جڑا ہوا تھا کہ کسی علمی ودینی اور اصلاحی خدمت کی میں توفیق پاؤں اور الفرقان اس سے الگ الگ رہے اسکا تصور ہی کرنا مشکل تھا۔ چنانچہ اب الفرقان کی بھی اصل دعوت یہی ہوگئی۔ اور میرا احساس ہے کہ اپنی ذات اور الفرقان دونوں سے جسقدر کام اس راہ میں لینا اس عاجز کے لئے ممکن ہوا وہ میرے اوپر اللہ تعالیٰ کے احسانات وانعامات میں سے غیر معمولی درجے کا بڑا انعام واحسان ہے۔

. . . .

. . . .

اس دور کے سلسلے میں اللہ کی طرف سے توفیق وہمت اور لگن کی ارزانی کا حال بیان کرنے کیلئے جی چاہتا ہے کہ الفرقان (بابت رجب ۱۳۶۶ھ) کے دو صفحے نقل کر دیئے جائیں۔

الفرقان کا دورِ جدید

مقصد اور دعوت

الفرقان کا دورِ اولیں اب سے ساڑھے تیرہ سال پہلے محرم ۱۳۵۳ھ میں "الفرقان" جاری ہوا تھا، اس وقت اپنے سامنے مسلمانوں کی اصلاح اور خدمتِ دین کا ایک مخصوص اور محدود دائرہ تھا یعنی مسلمانوں کے بعض خاص طبقوں کی اعتقادی اور عملی غلطیوں پر سنجیدہ بحث

وتحمیص اور مدلل تنقید، اور دین کے بارے میں اُن کے افراط وتفریط کی تغلیط وتردید کرتے ہوئے صراطِ مستقیم کی طرف دعوت، الغرض اُس ابتدائی دور میں یہی الفرقان کا خاص موضوع تھا ـــــ چند سال تک الفرقان اسی خصوصیت کے ساتھ جاری رہا اور تحدیثاً بالنعمۃ کہا جا سکتا ہے کہ اُس زمانہ میں جن خاص مسائل پر الفرقان میں بحث کی گئی، غالباً اب آئندہ ان پر کسی مزید غور وبحث کی ضرورت نہ ہوگی اور الفرقان میں جو کچھ لکھا جا چکا ہے وہی ان شاء اللہ ان مسائل ومباحث میں حرفِ آخر رہے گا۔

نقطۂ نظر میں تبدیلی اور الفرقان کی موجودہ دعوت

لیکن اپنے تجربات میں اور اُمت کے حالات سے واقفیت میں جیسے جیسے اضافہ ہوتا گیا یہ حقیقت منکشف ہوتی رہی کہ موجودہ مسلمان قوم کا بہت بڑا حصہ اور اس کا غالب عنصر اصل دین ہی سے اس قدر دور اور ناآشنا بیگانہ ہو چکا ہے کہ اسلام کے نام اور جاہلی قسم کی ایک قومی عصبیت کے سوا اس کے پاس کچھ بھی نہیں ہے، اس کو یہ بھی معلوم نہیں ہے کہ ہمارے مسلمان ہونے کا مطلب کیا ہے اور اسلام ہم سے کیا چاہتا ہے ـــــ اسی کے ساتھ ساتھ اللہ تعالیٰ کا ایک خاص کرم یہ ہوا کہ سیاسی ترقیات اور اقتصادی تحریکات کے پہلو بہ پہلو مادیت اور لادینی کے جو رجحانات نہایت تیزی سے ہمارے ملک میں اور خصوصاً ہماری قوم میں آرہے ہیں، اُن کو اور ان کی تیز رفتاری کو اور دین وایمان کے خلاف پڑنے والے ان کے اثرات ونتائج کو بہت پہلے سے سمجھنے کی اللہ تعالیٰ نے مجھے توفیق دی ـــــ انہی چیزوں کا یہ اثر ہوا کہ شروع میں مسلمانوں کی اصلاح کا جو محدود تصور اور

خدمت دین کے بارے میں جو ایک مخصوص زاویہ نظر اور ایک خاص ذوق تھا وہ آپ سے آپ بدلنے لگا اور اسکے بجائے حکمت نبوی کے اصول پر دعوت و تبلیغ کے ذریعہ عام مسلمانوں میں پہلے صحیح شعور اور حقیقی ایمان کو عام کرنے کی اور عبدیت و اطاعت والی اسلامی زندگی کے بنیادی اصول کو ان میں رواج دینے کی اور اس کے لئے جد و جہد کرنے کی ضرورت کا احساس دل و دماغ پر غالب آتا گیا۔ بتھوڑے ہی عرصے میں اللہ تعالیٰ نے اس حقیقت کا پورا پورا یقین نصیب فرما دیا کہ اسوقت دین کی اہم ترین اور بنیادی خدمت یہی ہے اسی راہ سے مسلمانوں کی اصلاح اور نئے پرانے تمام فتنوں سے ان کے دین و ایمان کی حفاظت ہو سکتی ہے اور اسی بنیاد کے استحکام پر ہمارے تمام تکمیلی کام اور ہماری تمام ترقی اور فلاح موقوف ہے اور اسکے بغیر صلاح و فلاح کے تمام دروازے امت محمدیہ پر بند ہیں۔

اپنے نقطۂ نظر کی اس تبدیلی کے ساتھ ساتھ اسی رفتار سے الفرقان کی روش بھی بدلتی گئی۔ ناظرین کرام کو بھی اندازہ ہوگا کہ ادھر چند برسوں سے اب اسکی اصل دعوت و پکار صرف یہی رہ گئی ہے ۔۔۔ کہ

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْٓا اٰمِنُوْا اے مسلمانو سچے مومن بن جاؤ!

اور ۔۔۔

یٰٓاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوا ادْخُلُوْا فِی السِّلْمِ کَآفَّةً وَّلَا تَتَّبِعُوْا خُطُوٰتِ الشَّیْطٰنِ اِنَّهٗ لَکُمْ عَدُوٌّ مُّبِیْنٌ۔ اے مسلمانو! پورے پورے اسلام میں آجاؤ اور شیطان کی پیروی نہ کرو۔ یقیناً وہ تمہارا بڑا کھلا ہوا دشمن ہے۔

اور ۔۔۔۔۔۔

جَاھِدُوا فِی اللّٰہِ حَقَّ جِھَادِہٖ ۔ دین کے لئے کوشش کرو راہِ خدا میں جیسا کہ اس کا حق ہے ۔

اور واقعہ یہ ہے کہ اگر اس مقصد اور اس دعوت کا تقاضا "الفرقان" جاری رکھنے کے لئے نہ ہوتا یا دعوت و تبلیغ کا جو کام خاص اسی سلسلہ میں الفرقان کے ذریعہ ہو رہا ہے اگر اسکے لئے کوئی دوسرا راستہ نکل آتا تو غالباً میں اس کو کبھی اب سے بہت پہلے بند کر چکا ہوتا ___ ادھر چند سالوں سے الفرقان کا نظام جس قدر ابتر اور میرے قابو سے باہر ہو رہا ہے اور اس سے میں جس قدر عاجز اور تنگ آچکا ہوں، اور کتابت و طباعت وغیرہ کی اجرتوں میں دن بدن کی ہوش ربا گرانی کی وجہ سے امسال اس کے مصارف میں جو ناقابل برداشت اضافہ ہو گیا ہے اور اس کی وجہ سے میں جس قدر زیر بار ہوتا چلا جا رہا ہوں، ان سب باتوں کا تقاضا یہی تھا کہ اس کو بند ہی کر دیا جاتا یا حالات کی سازگاری تک کے لئے اس کی اشاعت کو ملتوی کر دیا جاتا ۔ لیکن جیسا کہ عرض کیا گیا کہ دین کی جس دعوت و اشاعت کو مقصد حیات اور زندگی کی غایت قرار دے لیا گیا ہے چونکہ اس کے لئے بھی "الفرقان" کا جاری رہنا ضروری ہے، اور عام تحریری دعوت کا اپنے ہاتھ میں صرف وہی ایک ذریعہ ہے اس لئے مذکورہ بالا مشکلات اور پریشانیوں کے باوجود اس کو جاری ہی رکھنے کا فیصلہ ہے ۔" (الفرقان رجب ۱۳۶۶ھ)

ملک کی آزادی اور تقسیم سے پیدا ہونیوالے ملی مسائل کیلئے

کچھ کاموں کی توفیق

مسلمان بچوں کیلئے دینی تعلیم کی تحریک

۱۹۴۷ء میں ملک کی تقسیم کے بعد ہندوستان میں رہ جانے والے مسلمانوں کیلئے جو مسائل پیدا ہوئے اُن میں ایک نہایت سنگین مسئلہ یہ بھی تھا کہ ایک طرف تو تعلیم لازمی کی جارہی ہے جس کے مطابق ہر بچے کا سرکاری اسکول یا سرکار سے منظور شدہ اسکول میں داخل ہو کر پڑھنا لازم تھا دوسری طرف اردو کی تعلیم ختم کر دی گئی تھی اور پھر جو کچھ پڑھایا جارہا تھا اس میں ہندو دیومالا خوب خوب شامل کی گئی تھی جس کی بنیاد سراسر شرک اور توہم پرستی پر تھی۔ اس صورت حال نے ان تمام مسلمانوں کو بے چین کر دیا تھا جو اس کے نتائج کا اندازہ کر سکتے تھے۔ اللہ تعالیٰ غریق رحمت کرے قاضی عدیل احمد عباسی ایڈوکیٹ (متوفی ۱۹۸۰ء) کو کہ انھوں نے اس خطرناک صورت حال سے نپٹنے کے لئے ایک عملی اسکیم تیار کر کے اپنے ضلع بستی (یوپی) میں اسکے مطابق کام شروع کر دیا اسکیم یہ تھی کہ جہاں بھی مسلم آبادی ہے وہاں ابتدائی تعلیم کے اپنے مکتب قائم کئے جائیں۔ جن میں خصوصیت سے قرآن مجید ناظرہ اور اردو زبان میں دینیات کی تعلیم ہو۔ اور ضروری حد تک پرائمری درجات کے دیگر مضامین حساب اور تاریخ

وغیرہ کی تعلیم کا بھی بندوبست کیا جائے اور ان مکاتب کے مصارف کی ذمہ داری بستی کے مسلمان اپنے اوپر بالکل اس طرح لیں جس طرح اپنے بچوں کے شادی بیاہ کی ذمہ داری سمجھتے ہیں ۔ اس سلسلے میں قاضی صاحب نے ایک بہت سہل العمل تعین طریق کار کی تجویز بھی رکھی اور اپنے علاقے میں اسکی کامیابی کا تجربہ بھی کیا جس سے اُن کے مکاتب ایک طرح سے خود کفیل ہوئے ۔ وہ تجویز یہ تھی (جس میں خاص طور سے دیہات کے مسلمانوں کو سامنے رکھا گیا ہے) کہ ہر گھر میں ایک برتن رکھ دیا جائے اور جس وقت بھی روٹی پکنے کے لئے آٹا نکالا جائے ایک چٹکی آٹا اس مکتب کے برتن میں ڈال دیا جائے جسے انھوں نے چٹکی اسکیم کا نام دیا تھا ۔ اور اسی طرح کھلیان کے زمانے میں کھلیان سے تھوڑا سا غلہ مکتب کیلئے نکال دینے کی تجویز تھی اور اس کو "کھلیانی" کا نام دیا ۔

مرحوم قاضی صاحب نے یہ کام لگ بھگ سن ۵۱ء میں شروع کیا تھا سن ۶۲ء یا سن ۶۳ء میں انھوں نے اس سلسلے میں اپنے شہر بستی میں ایک جلسہ کیا اس میں شرکت کیلئے مجھے بھی مدعو کیا ۔ میں اُن کی اس مکتبی تحریک کے بارے میں کچھ سن چکا تھا لیکن پوری بات سامنے نہیں آئی تھی ۔ بستی کے اس جلسے میں جس میں میں اُن کی دعوت پر شریک ہوا تھا قاضی صاحب نے اس کام کی اہمیت و ضرورت اور اس کے طریق کار پر تفصیل سے روشنی ڈالی ۔ اور جو مکاتب قائم ہو چکے تھے ان کا کچھ حال بیان کیا ۔ میرے سامنے اب پوری بات آئی جس سے میں متاثر ہوا ۔ اور مجھے محسوس ہوا کہ ملک کے موجودہ حالات میں یہ ہماری نئی نسل کے دین کی حفاظت کا انتظام ہے ۔ اور اللہ کی طرف سے قاضی صاحب کو خاص طور پر اس کام کی توفیق عطا ہوئی ہے ۔ وہ ایک

مردِ مخلص تھے۔ ان کی زندگی میں قوم وملت کی خدمت کو ابتدائے عمری سے نہایت اہم جگہ حاصل رہی[1]۔ اپنے ضلع کے وہ کانگریسی لیڈروں میں بھی تھے کافی دنوں تک یوپی اسمبلی کے ممبر بھی رہے تھے۔ اور اس طرح اُن معاملات سے واقفیت کے اُن کو زیادہ مواقع حاصل تھے جن کا تعلق سرکاری محکموں اور سرکاری اسکیموں سے تھا۔ غالباً اسی چیز نے اُن کو آزاد مکاتب کی اس تحریک کی طرف متوجہ کیا۔

بہرحال جلسے کے بعد اگلے دن جب اطمینان سے گفتگو کا موقع ملا۔ تو میں نے قاضی صاحب سے کہا کہ آپ اس کام کے دائرے کو وسیع کریں۔ اور فی الحال اگر پورے ملک کو نہیں تو اپنی ریاست اترپردیش کو اپنا میدانِ کار بنا لیں۔ مگر قاضی صاحب باوجود میرے اصرار کے اسوقت آمادہ نہ ہوسکے۔ اور ان کا کہنا یہ تھا کہ راستہ معلوم ہوگیا ہے اور تجربہ بھی ہو گیا ہے۔ ہر ضلع کے لوگ اپنی اپنی جگہ پر اسی طرح کام کریں۔ میں بس اپنے ضلع ہی کے کام کو سنبھال سکتا ہوں۔

لکھنؤ واپس آکر میں نے رفیقِ محترم مولانا علی میاں سے یہ سب ذکر کیا۔ تو ہم دونوں نے یہ سوچ کر کہ بظاہر قاضی صاحب کے سامنے مسئلہ یہ ہوگا کہ وہ کام کا دائرہ پھیلا کر اپنا ذریعہ معاش وکالت برقرار نہ رکھ سکیں گے اس لئے ہم لوگوں نے ان کیلئے ایک انتظام کی فکر کی اور وہ ہوگیا۔ مگر قاضی صاحب اسے قبول کرنے کیلئے اپنے آپ کو آمادہ نہ کرسکے۔ پھر بھی میرا اور علی میاں کا اُن سے اصرار جاری رہا کہ وہ یوپی کی سطح تک کام کو پھیلانے پر بہرحال غور کریں

---

[1] اس سلسلے کی کچھ تفصیلات قاضی صاحب مرحوم کی کتاب "تحریکِ خلافت" سے معلوم ہوسکتی ہیں

اور بالآخر ایک وقت آیا کہ انھوں نے کام کے اس پھیلاؤ کے لئے ہمت کرلی۔ یہ ۱۹۵۹ء کی بات ہے۔ اس سلسلے کے آغاز کے لئے اُن کے شہر بستی میں ریاستی سطح کی ایک کانفرنس دسمبر ۱۹۵۹ء میں بلائی گئی۔ اور اس کانفرنس میں دینی تعلیمی کونسل اتر پردیش کا قیام عمل میں آیا۔ مولانا علی میاں کو کونسل کا صدر منتخب کیا گیا اور قاضی صاحب نے جنرل سکریٹری کی ذمہ داریاں قبول کرلیں۔ اس کونسل کے ماتحت یوپی کے اضلاع میں انجمن تعلیمات دین کے نام سے شاخیں قائم کی گئیں اور ہزاروں کی تعداد میں مسلمانوں کے اپنے مکاتب کا قیام عمل میں آگیا۔ یہ عاجز تو اب ایک عرصہ دراز سے اپنی معذوریوں کی بنا پر کونسل کے کاموں میں شرکت سے معذور ہے قاضی صاحب بھی ۱۹۸۷ء میں اس دنیا سے رخصت ہوگئے۔ اور اس کام میں قاضی صاحب کے دست راست اور نہایت اہل اور مستعد ان کے قریبی عزیز مولوی محمود الحسن جو کونسل کے آرگنائزر تھے وہ بھی رخصت ہوئے۔ مگر الحمد للہ مولانا علی میاں موجود ہیں اور قاضی صاحب کی جگہ ہمارے ایسے کاموں کے پرانے ساتھی اور اپنی لگن اور مستقل مزاجی کے ممتاز ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی اب کونسل کے سکریٹری جنرل ہیں۔

مسلمان بچوں کی دینی تعلیم اور ان کے ایمان و عقائد کے تحفظ کی اس تحریک میں اپنے حصے کو بھی اللہ کی ایک بڑی نعمت ہی سمجھتا ہوں۔ اور اس کے لئے شکر گزار ہوں۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس کام کے موجودہ ذمہ داروں اور کارکنوں کی ہر طرح مدد فرمائے اور یہ نہایت ضروری کام اطمینان بخش پیمانے پر جاری ہے۔

اخبار ندائے ملت کا اجراء

۱۹۴۷ء میں ملک کی آزادی اور تقسیم نے مسلمانانِ ہند کے لئے اُن کے دین کی سلامتی اور بقاء سے بھی پہلے اُنکے جان و مال کی سلامتی کا مسئلہ کھڑا کر دیا تھا۔ مگر اس عاجز کے اور اُس کی طرح سوچنے والوں کے خیال میں یہ عارضی اور وقتی صورتِ حال تھی اور مسلمانوں میں دینی اور ایمانی شعور بیدار کرنے کی جد و جہد بجائے خود اس صورتِ حال کی تبدیلی کے لئے کافی ہونے والی چیز تھی۔ اسلئے بہت کچھ یکسوئی کے ساتھ اور کچھ زیادہ ہی جوش اور جذبے کے ساتھ اپنے آپ کو اُسی دینی دعوت کے شغل میں لگائے رکھا جسکا ابھی ذکر آیا (یعنی تبلیغی کام) اگرچہ ذہن اس بات سے غافل کبھی نہیں رہا تھا کہ معاملات کے دنیوی پہلوؤں پر بھی مسلمانوں کو اچھی رہنمائی کی ضرورت ہے مگر اپنے لئے خالص دینی خدمت ہی کو قابل ترجیح سمجھا۔ لیکن تقریباً بیس سال کے بعد یعنی ۱۹۶۱ء میں ملک میں مسلم کشی کا ایک بھیانک سلسلہ آناً فاناً شروع ہوا جس کے تیور بتا رہے تھے کہ یہ کوئی ۱۹۴۷ء کی طرح کا وقتی اُبال نہیں ہے بلکہ قابل فکر چیز ہے۔ پس اس کے نتیجے میں وہ یکسوئی محال ہوگئی۔ اور اب اذیت محسوس ہونے لگی کہ ملت کے جان و مال کی سلامتی کے لئے بھی کچھ مستقلاً کیا جائے خاص کر اس لئے کہ یہ کام کسی بھی اور جگہ سے اطمینان بخش طریقے پر نہیں ہو رہا تھا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ الفرقان کی ذمہ داری میری طرف سے مولوی عتیق الرحمٰن نے اٹھا رکھی تھی (جس کا اوپر ایک جگہ ذکر آچکا ہے) اور وہ اس زمانہ میں ان نئے حالات کے زیر اثر الفرقان کے اداریوں میں مسلسل اسی موضوع پر لکھ رہے تھے۔

اب کچھ اس سلسلے میں مستقل طور سے کرنے کے بارے میں عزیزوں اور رفیقوں کے مشورے سے طے ہوا کہ سب سے پہلے قدم کے طور پر ایک ہفتہ وار اخبار اس سلسلے میں جاری کیا جائے۔ چنانچہ اسی فیصلے کے ماتحت ایک اعلان اور اپیل کی اشاعت الفرقان (بابتہ جمادی الاخریٰ ۱۳۸۱ھ مطابق دسمبر ۱۹۶۱ء) میں بایں الفاظ کی گئی۔

ایک ہفت روزہ اخبار کی ضرورت

آزادی کے بعد سے مسلمانوں کے لئے جو حالات و مسائل پیدا ہوگئے ہیں اُن کے پیشِ نظر عرصہ سے دوہ کر خیال ہوتا رہا ہے کہ ایک ایسا بلند پایہ اردو اخبار نکلنے کی کوئی صورت ہو جاتی جو مسلمانوں کے زیادہ سے زیادہ افراد تک پہنچتا اور موجودہ حالات و مسائل میں اُن کی ایسی صحیح رہنمائی کرتا جس کی انکو فی الواقع ضرورت ہے، اور مسلسل وہ پیام اُن کو دیتا جو اُن کو موجودہ حالات و مسائل سے نپٹنے کا اہل بنا سکے۔

ہمارے اخبارات بہت سے نکل رہے ہیں، مگر کسی کی یہ دا عداد خلاص مہم نہیں ہے کہ مسلمانوں میں، ان نئے مسائل اور اُن سے نپٹنے کے صحیح طریقہ کار کا شعور اور اس پر کاربند ہونے کا حوصلا ور لگن پیدا کی جائے۔ یہی اور اس کو پورا کرنے کی ضرورت جیسا کہ عرض کیا گیا اس چودہ سال کے عرصہ میں برابر رہ رہ کر محسوس ہوتی رہی ہے، حتیٰ کہ بعض دفعہ یہ خیال بھی ہوا کہ الفرقان ہی کو ہفتہ وار کی شکل دیدی جائے۔ مگر اس کے حق میں نہ اپنی ہی طبیعت مطمئن ہو سکی اور نہ دوسرے اہل الرائے نے اسکے حق میں رائے دی۔

ادھر کے چند مہینوں میں جو خصوصیت سے وہ واقعات اور انکے

نتیجے میں وہ حالات رونما ہوئے جن پر دو تین مہینے سے الفرقان میں لکھا جا رہا ہے تو طبیعت اس ضرورت کے لئے انتہائی حد تک بےچین ہوئی۔ کچھ درد مند اور ہوشمند دوستوں سے ذکر کیا، جنھوں نے اس ضرورت اور مقصد سے پورا اتفاق کرتے ہوئے گرمجوشی کے ساتھ اس کام کو انجام دینے کا بیڑا اٹھا لیا۔

طے یہ پایا کہ اس مقصد کیلئے فی الحال سب سے زیادہ مفید شکل ہفت روزہ اخبار ہی کی ہوسکتی ہے جسے جلد سے جلد ایک اجتماعی انداز پر جاری ہوجانا چاہئے۔ اجتماعی انداز کا مطلب یہ ہے کہ اخبار کسی کی شخصی ملکیت اور شخصی نقطۂ نظر کا ترجمان نہ ہو بلکہ ہم مقصد اور ہم خیال اشخاص کا ایک بورڈ اس کا متولی (ٹرسٹی) اور پالیسی کا ذمہ دار ہو۔ اور ابتدائی سرمایہ اُن صاحب استطاعت افراد کے عطیوں سے حاصل کیا جائے جو اس مقصد سے ہمدردی رکھتے ہوں۔

چنانچہ ایک ایسے بلند پایہ ہفت روزہ کا ہر پہلو سے مکمل اور اطمینان بخش خاکہ بنانے کے بعد جو قبول عام کی صلاحیت اپنے اندر رکھتا ہو اور کم سے کم مسلمانوں کے اکثر طبقات میں وقعت اور عزت کی نگاہ سے دیکھا جائے سرمایہ کی تحصیل کا کام اور دیگر انتظامات شروع کر دیے گئے ہیں اور امید ہے کہ جلد ہی اس اخبار کے اجرا کا اعلان کیا جاسکے گا۔

قدرتی طور پر سب سے زیادہ ناظرین الفرقان ہی سے امید ہے کہ وہ اس منصوبے کو کامیاب بنانے کیلئے ہر ممکن جد وجہد فرمائیں گے، اور خود ان میں سے اور ان کے ذریعہ سے دوسرے صاحب استطاعت حضرات سے فراخدلانہ مالی تعاون بھی منتظمین اور محرکین کو حاصل ہوگا۔

مختلف سہولتوں اور مصلحتوں کو پیش نظر رکھتے ہوئے کہ کم سے کم

سو روپے کا عطیہ اس سلسلے میں مقرر کیا گیا ہے —

ترسیل زر کا پتہ حسب ذیل ہوگا۔

جناب ڈاکٹر محمد اشتیاق حسین قریشی
کرامت منزل، اکبری گیٹ، لکھنؤ

ناچیز
محمد منظور نعمانی عفا اللہ عنہ

یہ اخبار جو ندائے ملت کے نام سے نکلا، اس فکری بنیاد پر نکالا گیا تھا کہ ہندوستان کے مسلمان احساس کمتری کا شکار ہیں، انھیں سب سے پہلے اخلاقی جرأت اور حوصلے کی خوراک چاہئے۔ اور ثانیاً سیاسی شعور کی۔ جہاں تک سیاسی شعور کا تعلق ہے افسوس ہے کہ اس کا پیدا کرنا آسان ثابت نہ ہو سکا۔ اسلئے کہ آزادی سے پہلے کی ہندو مسلم کشمکش کے اثرات اور آزادی کے بعد کے مخالف حالات کے کچھ کے عام مسلمانوں کے لئے غیر جذباتی انداز سے معاملات کو سوچنے کا موقع ہی نہیں آنے دیتے تھے البتہ جرأت و حوصلہ کی روح پھونک دینے اور احساس کمتری دور کرنے میں اس اخبار کو جو کامیابی حاصل ہوئی وہ ایک تاریخ ساز درجے کی کامیابی تھی اور لائق صد شکر ہے۔ اس عاجز کو امید ہے کہ اس کا جو حصہ اس اخبار کے اجراء اور اس کی اشاعت و بقا میں رہا وہ اللہ کے یہاں قابل اجر و ثواب ثابت ہوگا۔ (اَللّٰھُمَّ صَدِّقْ ظَنِّیْ) اور ایسے کام کی توفیق جس میں اجر و ثواب کی امید ہو اللہ کا احسان ہی ہے۔

مسلم مجلس مشاورت کا قیام

مسلمانوں کی حیات و بقا اور ان کے جان و مال کی حفاظت کے لئے فکر اور جد و جہد کے سلسلے کا دوسرا کام، جس کی توفیق اس عاجز کو میسر آئی وہ "مسلم مجلس مشاورت" کو وجود میں لانے کی جد و جہد میں شرکت تھی۔ اس مجلس کا بنیادی تخیل ایک پرانے نیشنلسٹ لیڈر ڈاکٹر سید محمود کی طرف سے اُن دنوں میں سامنے آیا جبکہ جنوری ۱۹۶۴ء میں بنگال، بہار اور اڑیسہ تین صوبوں میں پھیلی ہوئی چار سو میل کی پٹی میں اس درجے کا بھیانک مسلم کش فساد ہوا کہ جس کا کوئی تصور انسانوں کی بستی میں نہیں کیا جا سکتا۔ اس کے ولدوز مناظر کی تاب لانا آدمی کو مشکل تھا، ندائے ملت کا سلسلہ جاری تھا اور ذہن اس طرح کے معاملات کی طرف پوری طرح متوجہ تھا۔ فساد زدہ علاقے میں جا کر اپنی آنکھوں سے حالات دیکھے بھی تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا تخیل سامنے آیا تو دل نے اسے قبول کیا۔ یہ نہایت تعمیری ہونے کے ساتھ ایک انقلابی تخیل بھی تھا۔ دل و دماغ نے جب اس سے اتفاق کیا تو اپنی افتادِ طبع کے مطابق اُسے اوڑھ ہی لیا اور شعور کی حد تک آخرت کے اجر و ثواب کی امید ہی میں اوڑھا اور یہی چیز اس معاملہ میں اللہ کا وہ احسان اس عاجز کو معلوم ہوتی ہے کہ اسکا اظہار اور اس پر شکر کیا جائے۔

• ۹ اگست ۱۹۶۴ء کو لکھنؤ میں ایک نمائندہ اجتماع کے ذریعہ یہ مجلس وجود میں آئی۔ اور مسلم مجلس مشاورت اس کا نام طے ہوا۔

ڈاکٹر سید محمود جنگ آزادی میں قربانیاں دینے والی پرانی نسل سے تھے۔ اور کانگریس کے پلیٹ فارم سے ہندو لیڈروں کے

شانہ بشانہ رہے تھے۔ اسلئے آزادی کے بعد کی مسلم آزار فضا سے بے حد ملول اور متفکر رہنے والے مسلم لیڈروں میں تھے۔ رانچی میں جو بڑے فسادات ہوئے تھے۔ جن کے نتیجے میں ہم لوگوں کو "ندائے ملت" نکالنے کا تقاضہ ہوا تھا ڈاکٹر محمود صاحب نے انہی فسادات کے سلسلے میں مولانا حفظ الرحمٰن صاحب وغیرہ کی معاونت سے ایک بڑا کنونشن ملک کی سیکولر طاقتوں کو فسادات کی سیاست کے خلاف جمع کرنے کے لئے منعقد کیا تھا ۱۹۶۴ء کے فساد نے اُن کو مسلمانوں کے ایک اتحاد کا خیال دیا جو اس بنیاد پر عمل میں آئے کہ فسادات کے اس شرمناک سلسلے میں صرف مسلمانوں کی تباہی و بربادی ہی قابل توجہ نہیں ہے۔ بلکہ اس میں ملک کی اکثریت کی جو بے حسی اور اخلاق و روحانی مفلسی الم نشرح ہے اس کو بھی قابل توجہ سمجھ کر وہ طریق کار اختیار کرنے کی ضرورت ہے جس کے ذریعے ہندو عوام تک پہنچا جا سکے اور ان کی اخلاقی حس کو بیدار کرنے کی کوشش کی جا سکے۔

ڈاکٹر صاحب مرحوم کا خیال واقعی ایک بلند پایہ خیال تھا مگر افسوس کہ یہ فکر و خیال اچھی طرح تجربے میں نہیں آسکا۔ اسکے لئے جس ذہنی صفائی اور جس اسپرٹ کی ضرورت تھی وہ شاید ڈاکٹر صاحب کے سوا ہم میں سے اکثر میں موجود نہ تھی۔ اور اسلئے ہم نے داعی کی اصل بات میں زیادہ دلچسپی رکھے بغیر محض مسلم اتحاد سے دلچسپی رکھتے ہوئے اس کی دعوت قبول کر لی۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ کہ دو تین سال بعد جو جنرل الیکشن کا زمانہ آگیا تو ہم سے کتنوں ہی نے اس اتحاد کو اپنے سیاسی خیالات و رجحانات کی سواری بنانے میں بھی تکلف نہ کیا۔ اور نتیجے میں یہ اتحاد بس ایک بالکل نام نہاد اتحاد بن کر رہ گیا۔ اور سچ یہ ہے کہ یہ کوئی ایسی بات نہ تھی جو سکا

اندیشہ نہ رہا ہو مجلس کے تاسیسی اجلاس کا مرحلہ بخیر طے ہو جانے پر اپنی خوشی کا جو اظہار الفرقان کے صفحات میں کیا گیا تھا[1] وہ اظہار بھی مایوسی کے اندیشے سے آزاد نہ کیا جا سکا تھا۔ اسلئے کہ مسلمان قوم میں اجتماعی کاموں کی صلاحیت ایک عرصۂ دراز سے مفقود ہے۔ چنانچہ اس تجربے کے بعد کسی نئے اجتماعی کام میں اپنا وقت صرف کرنے کی ہمت ہی نہ رہی۔ بس جو کچھ انفرادی طور پر ہو سکے اسی کے لئے اپنے آپ کو مکلف سمجھ لیا البتہ محدود نوعیت کی اجتماعی ذمہ داریاں جو پہلے سے چلی آرہی تھیں ۔ جیسے دار العلوم دیوبند کی مجلس شوریٰ کی رکنیت، ان کا معاملہ مختلف تھا۔ اگرچہ وہاں بھی طبیعت کے اس رجحان نے بعض موقعوں پر سبکدوشی کی خواہش اور کوشش کی جو کامیاب نہ ہو سکی۔

اس رکنیت کی ذمہ داریوں کے سلسلے میں بھی اللہ کے احسانات کی کوئی کمی اس عاجز بندے پر نہ رہی۔ اسلئے اسکا کچھ ذکر بھی واجب ہے۔

شورائے دار العلوم کی رکنیت

دار العلوم دیوبند سے ایک تعلق تو طلب علم کا تھا جس کے میسر آنے کا ذکر شروع ہی میں اس حیثیت سے آچکا ہے کہ وہ اس عاجز پر اللہ کا بڑا احسان تھا۔ دوسرا باقاعدہ تعلق اپنی طالب علمی کا دور ختم ہونے کے اٹھارہ سال بعد ۱۳۶۲ھ مطابق ۱۹۴۳ء میں) اس کی مجلس شوریٰ کی رکنیت کی شکل میں قائم ہوا۔ جو آج اس تحریر کے وقت[2] تک جاری ہے۔ اور اس ذمہ دارانہ

---

[1] الفرقان ستمبر ۱۹۶۲ء۔ [2] سنہ ۱۹۹۵ء۔

نوعیت کے تعلق میں بھی اس بندے کے اوپر اللہ کے احسان وانعام کی بڑی نشانیاں سامنے آتی رہی ہیں۔

دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کیلئے اس عاجز کا انتخاب بالکل بے گمان ہوا تھا۔ رجب ۱۳۶۳ھ میں جبکہ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کا وصال ہوا تھا اس عاجز کا قیام اس سے پہلے اور اس کے بعد بھی کچھ عرصہ تک دہلی بستی حضرت نظام الدین میں تھا۔ انہی دنوں میں حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ سے ملاقات ہوئی (جو مجلس شوریٰ کے ارکان میں تھے) حضرت مفتی صاحب نے اس ملاقات میں فرمایا کہ اس دفعہ کی شوریٰ میں ہم لوگوں نے آپ کو رکنیت کے لئے منتخب کیا ہے۔ مجھے حیرانی سی ہوئی۔ اسلئے کہ میں اپنے آپ کو بالکل اس مرتبے کا آدمی نہیں سمجھتا تھا۔ مگر مفتی صاحب سے معلوم ہوا کہ یہ انتخاب سب ارکان کی متفقہ رائے سے ہوا ہے۔ یہ جہاں ایک بڑا اعزاز تھا وہاں بڑی بھاری ذمہ داری بھی تھی۔ اور میں اللہ کا نہایت شکر گزار ہوں کہ اس ذمہ داری کو نباہنے کے سلسلے میں اس کا مجھ ناتواں پر اس قدر کرم رہا ——— اور اسکی توفیق نے اس درجہ اس عاجز کی دستگیری فرمائی کہ اپنے شعور وادراک کی حد تک کسی ایک بھی معاملے میں دارالعلوم کے بہترین مفاد پر کسی چیز کو کبھی بھی مقدم نہ ہونے دیا۔ کسی تعلق کی رعایت، کوئی سفارش اور کسی کی بھی ناراضگی کا ڈر الحمد للہ اس توفیق کے آگے اثر انداز نہ ہو سکا۔ میری رکنیت کو اس تحریر کے وقت بچاس برس کے قریب ہو چکے ہیں۔ اس پوری مدت میں جس بات کو صحیح اور دارالعلوم کے مفاد میں سمجھا اسے پیش کیا اور اس پر زور دیا۔ اسی طرح کسی دوسرے رکن کی طرف سے پیش کی گئی بات کو صحیح اور دارالعلوم کے مفاد میں سمجھا تو وہ خواہ کسی کی طرف سے بھی ہو اس کی تائید کی اور جس کو صحیح نہیں سمجھا اس سے

اختلاف کیا۔ صرف حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ کے ساتھ میرا یہ رویہ رہا کہ جب انکی کسی تجویز یا رائے سے مجھ کو اختلاف ہوتا تو میں مجلس میں اس پر گفتگو نہ کرتا، خاموش رہتا بعد میں تنہائی میں ملاقات کر کے اپنی رائے عرض کرتا۔ (اپنے اور دارالعلوم کے حق میں میں نے یہی رویہ مناسب سمجھا) اور کم از کم دو تین دفعہ کے بارے میں یقین کے ساتھ یاد ہے کہ میری تنہائی کی گفتگو کے بعد حضرت نے اپنی رائے بدل دی اور مجلس کی اگلی نشست میں اسکا اظہار بھی فرما دیا۔

مجھے مسرت ہے کہ شوریٰ کے ساتھیوں میں میری رایوں سے وقتاً فوقتاً اختلاف کرنے والے تو جتنے بھی رہے ہوں مگر الحمد للہ کہ میرے بارے میں سب کا گمان میرے علم اور اندازے کی حد تک یہی رہا کہ میری رایوں اور میری تجویزوں کی بنیاد دارالعلوم کا مفاد دیکھنے اور سوچنے کے علاوہ اور کچھ نہیں ہوتی۔ اور ان سب کا رویہ بھی میرے ساتھ ایسا ہی رہا کہ گویا مجھے ان سب کا رفیقانہ اعتماد حاصل ہے۔ اور یہ بلاشبہ اللہ کی بہت بڑی نعمت ہے خاص کر اس زمانے میں جبکہ باہمی اعتماد ایک کمیاب شی ہو گئی ہے[1]۔ مگر افسوس ہے کہ یہ اعتماد ہم لوگوں کو اس وقت جوڑے رکھنے میں کامیاب نہ ہو سکا جب دارالعلوم کو سب دنوں سے زیادہ اس کی ضرورت تھی

---

[1] رفقائے شوریٰ کے اس اعتماد کا ظاہر یوں تو ہمیشہ ہی کسی نہ کسی طور پر ہوتا رہا۔ مگر اس سلسلے کے دو واقعوں کا ذکر مجھے تحدیث نعمت کے طور پر ضرور کرنا چاہیے۔

۱۔ ایک مرتبہ جبکہ سات آٹھ ارکان شوریٰ کی جگہ خالی ہو گئی تھی اور ضرورت تھی کہ ان جگہوں پر کچھ نئے ارکان کا انتخاب کیا جائے تو شوریٰ کے ایک جلسے میں ان میں سے چار جگہوں کے لئے فہرستیں پیش ہوئیں۔ ایک میں مہتمم دارالعلوم مولانا محمد طیب صاحب مرحوم کی طرف سے جا رہا ہوں کی (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

اختلاف اور اس میں میرا موقف

یعنی دارالعلوم کی تاریخ کا وہ مرحلہ جس میں جشن صد سالہ کے ما بعد انتشار کے اسباب پیدا ہوئے تو پھر یہ انتشار رکا نہ جا سکا اور دارالعلوم دیوبند اور جماعت دیوبند کا جو بھرم سو سال سے اس کے بزرگوں کی للہیت اور نیک نیتی کے طفیل بنا چلا آرہا تھا وہ ٹوٹ پھوٹ کر رہ گیا۔

اس المناک واقعے میں ہم میں سے کس کی کیا ذمہ داری ہے اس کا صحیح فیصلہ تو آخرت ہی میں ممکن ہے۔ یہاں تو صرف اپنے اپنے قیاس گمان اور اندازِ دل ہی کی بات ہے۔ البتہ اس موقع پر اس عاجز نے جو کچھ

(بقیہ حاشیہ صفحہ گذشتہ) تجویز تھی۔ دوسری میں حزب مخالف کے نمائندہ قاضی زین العابدین سجاد میرٹھی مرحوم نے اپنے تجویز کردہ چار نام پیش کئے تھے۔ اس عاجز نے مقابلے کا یہ رنگ دیکھ کر گزارش کی کہ ہم سب اب حضرت مہتمم صاحب مدظلہ کے یہاں جلنے والے نہیں۔ اور یہ دارالعلوم جلنے والے ہاتھوں میں امانت ہے۔ اسلئے ناموں کی تجویز کے سلسلے میں یہ سوچ لینے کی ضرورت ہے کہ ہم اللہ کے سامنے یہ کہہ سکیں کہ اپنی دانست میں یہ امانت بہترین ہاتھوں میں چھوڑ کر آئے ہیں۔ میری تائید اور میرا شکر کا حق ادا کرنے کے قابل نہیں کہ دوستوں نے بہ یک زبان ان چاروں ناموں کی تجویز کا حق بالکسی شرط کے اس گنہگار کے ہاتھوں میں دے دیا۔ اور الحمد للہ یہ مرحلہ سب کے اتفاق کے ساتھ نہایت خوبی سے طے ہو گیا۔ تین نام خود میرے ذہن میں آئے۔ مولانا عبدالحلیم جونپوری، مولانا ابوسعود (جھنجھانوی) اور حکیم انعام اللہ صاحب چوتھے نام کے سلسلے میں ایک اور ساتھی نے میری مدد کرتے ہوئے مل گڑھ کے نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی کا نام لیا جو میرے لئے قابل قبول تھا۔ اور یہ چاروں حضرات منتخب کر لئے گئے۔ باقی جو ایک جگہ خالی کرانے کیلئے اس اجلاس میں میرا جو نام تجویز ہو گیا تھا اور عرض کر دیا کہ وہ مولانا سید مصطفیٰ باندوی، حکیم محمد زماں حسینی کلکتہ اور حاجی علاء الدین پالنپوری۔ مولوی محمد عثمان مختار دیوبند

اپنا فرض اور دارالعلوم کا مفاد سمجھ کر کیا۔ اسکے بارے میں دعا ہے کہ وہ اللہ کے حضور میں بھی ایسا ہی ثابت ہو۔ نہ کسی گرفت اور مواخذے کا باعث۔ واقعہ یہ ہے کہ اس عاجز نے تو دا تقریبے سے آٹھ دس سال پہلے ارادہ کیا تھا کہ شوریٰ کی رکنیت سے استعفیٰ دے دوں۔ اسلئے کہ جن معاملات کی بدولت یہ واقعہ رونما ہوا وہ اس وقت اس درجے پر پہنچ چکے تھے کہ اُن کے جواز کی بہتر نزدیک کوئی شکل نہ تھی اور اصلاح کی کوئی امید نظر نہ آتی تھی۔ اسلئے ایک ہی راستہ نظر آتا تھا کہ بحیثیت رکن شوریٰ اس سلسلے میں جو ذمہ داری مجھ کو اپنے اوپر نظر آتی ہے اس سے اپنے آپ کو سبکدوش کر لوں۔ میرا یہ احساس اور قلبی داعیہ بہت ہی شدید تھا۔ مگر میں نے اس پر عمل کرنے سے پہلے ضروری سمجھا کہ حضرت شیخ الحدیث (مولانا محمد زکریا صاحب) رحمۃ اللہ علیہ سے مشورہ کر لوں جن سے ایسے معاملات میں مشورہ لینے کی میری عادت بھی تھی اور وہ دارالعلوم کے معاملات سے پوری طرح واقف بھی تھے۔ حضرت شیخ الحدیث نے میری رائے سے اتفاق نہ کرتے ہوئے فرمایا کہ عنداللہ بری الذمہ ہونے کے لئے اتنی بات کافی ہے کہ جس بات کو غلط سمجھو اسکے بارے میں اپنی رائے ظاہر کر دو۔ خواہ مانی جائے یا نہ مانی جائے۔ میں ان حالات میں بھی تمہارا مجلس شوریٰ میں رہنا دارالعلوم کے لئے مفید سمجھتا ہوں۔ روک ٹوک سے بھی فائدہ ہوتا ہے۔ چنانچہ میں نے اس مشورے کو قبول کرنا ہی مناسب سمجھا اور دارالعلوم کی گاڑی جس لائن پر چل رہی تھی اسی پر اسکے چلتے ہوئے بھی میں شوریٰ کے جلسوں میں شریک ہوتا اور اپنے بس بھر روک ٹوک کا فریضہ ادا کرنے کی کوشش کرتا رہا۔ حتیٰ کہ جشن صد سالہ کے موقع پر مولانا اسعد میاں کی صدارت میں "مؤتمر ابنائے قدیم دارالعلوم دیوبند" کا قیام اور حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مرحوم مہتمم

دارالعلوم کی صدارت میں "تنظیم فضلائے دارالعلوم دیوبند" کے قیام نے اُس لاوے کے پھوٹ پڑنے کا اعلان کردیا جو ایک مدت سے پک رہا تھا۔ اور اسکے نتیجے میں حضرت مہتمم صاحب مرحوم کی طرف سے مولانا اسعد میاں کے خطرے کی روک تھام کیلئے جو اقدامات دارالعلوم کے اندرونی معاملات میں شروع ہوئے انھوں نے معاملات کے اس بگاڑ کو جو اس عاجز کے لئے استعفے کے ارادے کا باعث ہوا تھا تیز رفتار بھی کردیا اور پہلے سے کہیں زیادہ خطرناک رخ پر بھی ڈال دیا۔

کاش حضرت مہتمم صاحب مرحوم نے مولانا اسعد میاں کے کسی اقدام کے مقابلے میں خود سے کوئی فیصلہ اور اقدام کرنے کے بجائے معاملہ شوریٰ کے سامنے رکھا ہوتا بلکہ اسی پر چھوڑا ہوتا، اسلئے کہ یہ اس کے دائرۂ اختیار کی چیز تھی تو امید کی جاسکتی تھی کہ یہ نزاع جس شکل میں اپنے انجام کو پہنچا اس سے کوئی بہتر شکل نکل آتی۔ مگر مقدرات کو کون روک سکتا ہے؟ اور ہم اپنی خطاؤں کی رو سے کسی بہتر انجام کے مستحق رہ بھی کب گئے تھے؟ یہ نزاع مولانا اسعد میاں اور مہتمم صاحب کے درمیان محدود رہنے کے بجائے خود شوریٰ اور مہتمم صاحب کے درمیان نزاع کی شکل اختیار کرگیا اور پھر اُس ایک انجام کے سوا جس تک بات بالآخر پہنچی کسی دوسرے انجام کی گنجائش ہی باقی نہ رہی۔

مسلم پرسنل لا بورڈ

دارالعلوم کے تذکرے سے دارالعلوم کی بدولت ہی ملنے والی ایک اور اچھے کام میں شرکت کی توفیق بھی یاد آرہی ہے۔ یہ مسلم پرسنل لا بورڈ کا قیام تھا۔ سنہ ۱۹۷۲ء کی بات ہے کہ مسلمانوں کے لئے شادی بیاہ اور طلاق و وراثت

کے جو خاص قوانین ملک میں نافذ ہیں اور اُن کا مجموعہ "مسلم پرسنل لا" کہلاتا ہے ۔ اسکے خلاف آزادی کے بعد ہی سے وقتاً فوقتاً اٹھنے والی آوازوں نے ایک ایسی شکل اختیار کی جو مسئلے کی سنگینی کا احساس پیدا کرنے والی تھی۔ یہ غالباً دہلی میں اس مسئلے پر لا انسٹی ٹیوٹ کی طرف سے منعقد کیا ہوا ایک سیمنار۔ اس کے بعد دارالعلوم کی مجلس شوریٰ کا جلسہ منعقد ہوا اُس میں مولانا منت اللہ رحمانی مرحوم نے اس مسئلے کی سنگینی کی طرف ہم لوگوں کو توجہ دلائی کہ اس سلسلے میں کچھ ہونا چاہیئے ارکان شوریٰ میں سے جن لوگوں نے کچھ کرنے کی اس دعوت سے اپنے اندر خصوصی دلچسپی محسوس کی اُن میں سے ایک یہ عاجز بھی تھا دارالعلوم کے اس وقت کے مہتمم قاری محمد طیبؒ نے بھی اس میں گہری دلچسپی لی اور ملک کے معروف و ممتاز علماء اور چند ماہرین قانون کا ایک محدود خصوصی اجتماع بلانا طے کر لیا گیا ۔ مارچ ۱۹۷۲ء میں دارالعلوم کے اندر یہ دو روزہ اجتماع منعقد ہوا ۔ اور اس میں ایک بڑے پیمانے کا اجتماع بلانے کا فیصلہ کیا گیا، جس میں مسلمانانِ ہند کے تمام مکاتب فکر کی نمائندگی ہو ۔ یہ بڑا اجتماع بھی دیوبند ہی میں بلانے کا ارادہ کیا تھا مگر اس کے لئے جو تیاری کمیٹی تشکیل کی گئی اس نے اپنا کام مکمل کرتے ہوئے یہ رائے دی کہ اس مسئلے کے سلسلے میں خصوصی فتنہ انگیزی چونکہ مہاراشٹر اور خصوصاً بمبئی شہر سے ہو رہی ہے اس لئے مناسب ہوگا کہ یہ ملی کنونشن بمبئی ہی میں منعقد کیا جائے ۔ یہ رائے مناسب تھی اور اس کے ماتحت اہل بمبئی سے اس سلسلے میں رابطہ قائم کرنے کے لئے طے کیا گیا کہ مراسلت کے بجائے ایک مؤثر وفد وہاں جائے تاکہ ضروری مراحل جلدی اور آسانی سے طے ہو جائیں ۔ یہ وفد بہت محدود پیمانے کا تھا اور اس کے شرکا میں سے

ایک یہ عاجز بھی تھا۔ بمبئی کے حوصلہ مند دوستوں نے حسب توقع کونشن کی ذمہ داری قبول کرلی اور ۲۷، ۲۸ دسمبر ۷۲ء کو اس کونشن کا انعقاد عمل میں آگیا۔ جس کے بارے میں اس عاجز نے الفرقان (جنوری فروری ۷۳ء) میں اپنا تاثر ان الفاظ میں درج کیا تھا کہ

"........ قمری حساب سے اس عاجز کی عمر کا سترواں سال شروع ہوچکا ہے۔ تحریک خلافت کے شباب کا دور میری طالب علمی کا زمانہ تھا۔ میں نے خلافت کے بعض وہ بڑے بڑے جلسے بھی دیکھے ہیں جن میں مختلف الخیال علماء اور زعماء ملت ایک پلیٹ فارم پر ہوتے تھے، اسی طرح جمعیۃ العلماء کے ابتدائی دور میں وہ اجلاس بھی دیکھے ہیں جن میں علماء فرنگی محل، علماء بدایوں مولانا ثناء اللہ امرتسری، مولانا ابوالقاسم سیف بنارسی اور اکابر علماء دیوبند ایک ساتھ اور ایک ہی رزولیشن کی تائید میں تقریریں کرتے تھے ـــــ لیکن بمبئی کے اس "تحفظ مسلم پرسنل لا کونشن" میں ملت اسلامیہ ہند کے مختلف مسالک و مکاتب فکر کی جیسی اجتماعیت اور جس قدر مکمل نمائندگی ہوئی اس کی کوئی مثال اسلامی ہند کی تاریخ میں میرا خیال ہے کہ مشکل ہی سے ملے گی"

اس کونشن کی صدارت حضرت مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند نے فرمائی اور اس کے ذریعے جو ایک مستقل ادارہ "آل انڈیا مسلم پرسنل لا بورڈ" کے نام سے قائم ہوا اس کا صدر بھی قاری صاحب رحمۃ اللہ علیہ ہی کو منتخب کیا گیا۔ اور مولانا منت اللہ صاحب اس کے جنرل سکریٹری بنائے گئے۔

بلاشبہ اس بورڈ کا قیام ہندوستان میں مسلم پرسنل لا کے خلاف فتنہ انگیزی کے اثرات کی روک تھام کے لیے ایک بڑا مؤثر ذریعہ ثابت

ہوا۔ اور الحمدللہ کہ اب بھی جبکہ بیس سال سے زائد اس کے قیام کو گزر گئے ہیں اس کی نمائندہ حیثیت کا وزن برقرار اور موثر ہے۔ قاری صاحب کے بعد بورڈ کی صدارت کیلئے مولانا علی میاں کا انتخاب کیا گیا۔ اور بورڈ کا وزن اور وقار برقرار رہنے میں یقیناً مولانا کی شخصیت کا بھی بڑا دخل ہے۔ افسوس کہ مولانا منت اللہ نہ رہے جو واقعہ یہ ہے کہ بورڈ کے اصل روح رواں تھے اللہ تعالیٰ قاری صاحب اور مولانا منت اللہ صاحب کی روحوں کو شاد و شاداب رکھے کہ ان کے ذریعہ مسلمانوں کو اپنے اتحاد و اتفاق کے مظاہرے کا ایک پلیٹ فارم میسر آیا۔

حرمین شریفین میں بار بار حاضری کی سعادت

ایمان کا کوئی ذرہ اگر آدمی کو نصیب ہوا ہے تو کسی پر خلتے کی آرزو سے پہلے اس کی اگر کوئی اہم خواہش ہوسکتی ہے تو وہ خانۂ خدا اور مسجد نبوی اور آرامگاہ نبوی پر حاضری کی خواہش و آرزو ہی ہوسکتی ہے اللہ کا اپنے اس گنہگار بندے پر محض احسان ہی احسان ہے کہ اسے تقریباً بیس بار یہ سعادت نصیب ہوئی۔

سب سے پہلے یہ سعادت ۱۳۸۳ھ مطابق ۱۹۶۳ء میں اپنے ایک مخلص دوست کی خواہش کی بدولت میسر آئی جن کے اصرار نے مجبور کیا کہ میں اس مبارک سفر میں انکا شریک ہوجاؤں۔ یہ ضلع گونڈہ (یوپی) کے ماسٹر محمد نسین صاحب تھے۔ دو سال کے بعد لکھنؤ کے ایک اور دوست نے بھی فرمائش کی۔ یہ لکھنؤ کے برادرم محمد شفیع تھے۔ ان کا مخلصانہ اصرار بھی میرے لئے مکرر حاضری کا بہانہ بن گیا۔ تیسری مرتبہ حج بیت اللہ کی سعادت اناؤ کے مخلص دوست جناب الحاج رئیس الدین صاحب کی فرمائش پر ان کے والد مرحوم کی طرف سے حج بدل کی نیت سے حاصل ہوئی یہ میرا پہلا ہوائی سفر تھا۔ بعد میں رابطہ عالم اسلامی کی رکنیت اس سعادت سے بار بار بہرہ ور ہونے کا ذریعہ بن گئی۔ فالحمد للہ

رابطہ عالم اسلامی کی رکنیت

رابطے کی رکنیت کی بھی ایک دلچسپ تاریخ ہے ۱۹۶۵ء کی آخ

ہے جبکہ میرا اور مولانا علی میاں (مولانا سید ابوالحسن علی ندوی) کا قیام لکھنؤ میں تقریباً ایک ہی جگہ رہتا تھا یعنی تبلیغی جماعت کے مرکز میں۔ میرا قیام مع اپنے اہل خانہ کے تھا اور مولانا علی میاں اُسکے باہر کے کمرے میں قیام فرماتے تھے۔ رابطے کی تاسیس ۱۹۶۲ء میں ہوگئی تھی۔ مولانا علی میاں اس کے بالکل ابتدائی ممبران میں تھے۔ وہ اپنی عربی تقریر و تحریر کی وجہ سے عرب دنیا میں متعارف ہو چکے تھے۔ اس سال جبکہ وہ رمضان گزارنے کے لئے حسبِ دل اپنے وطن رائے بریلی جانے والے تھے تو مجھ سے مشورہ طلب کیا کہ رابطے کی گزشتہ میٹنگ میں ہندوستان اور پاکستان سے دو نمائندے لئے جانے کی بات طے ہوئی تھی۔ اور ہندوستان سے دوسرے نمائندے کا انتخاب میرے ذمے رکھا گیا تھا۔ اب اس کی یاددہانی آئی ہے۔ رائے دیجئے، کون مناسب رہے گا؟ میں نے غور کرکے انھیں دو نام بتائے۔ ایک حضرت مولانا حبیب الرحمٰن اعظمی اور دوسرے مولانا قاری محمد طیب صاحب مہتمم دارالعلوم دیوبند۔ اس کے بعد وہ رائے بریلی چلے گئے۔ شوال میں رابطے کی طرف سے میرے نام آئندہ جلسے کا دعوت نامہ اور رکنیت کی اطلاع پہنچی۔ میں حیران ہوا کہ یہ کیا معاملہ ہے؟ شاید کوئی غلط فہمی ہوئی ہے۔ مولانا رائے بریلی سے واپس ہوئے تو میں نے اُن سے بتایا کہ رابطے سے ایسا خط آیا ہے۔ اس کا کیا مطلب؟ کیا غلط فہمی ہے؟ تو پتہ کہ یہ مولانا ہی کا کیا ہوا ہے۔ انھیں نے میرا نام بھیجا تھا۔ میں نے کہا کہ بھئی یہ حضرات جن کے میں نے نام دیئے تھے اہل بھی زیادہ تھے۔ اور دوسرے یہ کہ آپ کے ساتھ میرا بھی نام تو بالکل ایسے ہے جیسے ایک ہی گھر کے دو آدمی! مگر مولانا کا عذر یہ تھا کہ آپ کے ہونے سے مجھے مشورے کا فائدہ

ملے گا۔ اس فور پر میرے لئے کچھ کہنا مشکل تھا۔ اس لئے اب دوسری بات میں نے یہ کہی کہ میرے پاس پاسپورٹ بھی نہیں ہے۔ میرا پاسپورٹ جیسا کہ آپ کے علم میں آ بھی چکا ہے، سفر میں میرے بریف کیس کے ساتھ چوری ہو گیا تھا۔ اور محکمے کی طرف سے میرے نئے پاسپورٹ کی درخواست پر مجھے تحریری طور پر جواب مل چکا ہے کہ حکومت کی طرف سے موصولہ ہدایات کی بنا پر آپ کو پاسپورٹ نہیں دیا جا سکتا۔ اس کھلی ہوئی ناانصافی کا میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ اب میں نے طے کر لیا ہے کہ میں اس سلسلے میں ہرگز کوئی کوشش نہ کروں گا۔ مولانا نے فرمایا کہ اسے دیکھا جائے گا اور بات اُس وقت ختم ہو گئی۔ جلد ہی اعظم گڑھ میں دارالمصنفین کی گولڈن جبلی کی تقریب تھی، اور وہاں جانا تھا۔ وہاں کے مہمانوں میں ایک صاحب سے جن کو میں نہیں جانتا تھا، آمنا سامنا ہوا تو انھوں نے مجھے رابطے کی ممبری کی مبارکباد دی۔ میں نے کچھ اجنبیت کی وجہ سے اور کچھ اس ممبری کے بارے میں ذہن صاف نہ ہونے کی وجہ سے کچھ زیادہ دلچسپی اُن سے گفتگو میں نہیں لی۔ بعد میں کسی نے بتایا کہ یہ مالک رام تھے جو حکومت ہند کے محکمہ خارجہ میں سکریٹری کا عہدہ رکھتے ہیں وہ اگلے دن ایک بار پھر آمنے سامنے میں مل گئے اور اسی موضوع کو چھیڑا تو میں نے ان کو اپنی عدم دلچسپی کی وجوہات میں سے خاص طور پر یہ وجہ بتا دی کہ میرے پاس پاسپورٹ ہی نہیں ہے اور حکومت کہتی ہے کہ مجھے ملنا بھی نہیں ہے۔ اس پر وہ بولے کہ یہ بالکل کوئی مسئلہ نہیں۔ آپ ضرور جائیں اور جب جانے کا ارادہ کریں پاسپورٹ دن کے دن ہی مل جائے گا۔ میرا اسی محکمے سے تعلق ہے۔

اس جشن میں اسوقت کے نائب صدر جمہوریہ ڈاکٹر ذاکر حسین خاں

بھی شریک تھے جن سے کافی دن پہلے کی ملاقات نظام الدین کے رشتے سے تھی۔[1] غالباً مالک رام صاحب نے ڈاکٹر صاحب سے بھی ذکر کیا ہوگا۔ بہرحال کچھ دن بعد ایک خط ڈاکٹر صاحب کے دفتر سے آیا کہ آپ جب رابطے کے جلسے میں تشریف لیجا رہے ہوں تو ڈاکٹر صاحب کی خواہش ہے کہ آپ سے دہلی میں ملاقات ہو جائے۔ اس کا ماز یہ کھلا کہ آنے والے جلسے میں کشمیر کا مسئلہ رابطے کے اندر آنے کو تھا۔ اس لئے حکومت ہند کو اس بات میں دلچسپی تھی کہ ہندوستان کے نمائندوں کے خیالات اس بارے میں معلوم کرے اور ان سے خواہش کرے کہ وہ وہاں اپنی حکومت کے موقف کی حمایت کریں۔ بلا سان و گمان کے رابطے کی رکنیت آنا اور پھر پاسپورٹ کے سلسلے میں یہ غیر متوقع آسانیاں فراہم ہونا۔ اس سب سے میں نے یہ سمجھا ہے کہ یہ سب منجانب اللہ ہے اور ہر سال حج اور حسب توفیق عمروں کی سعادت کا جو یہ راستہ کھل رہا ہے۔ اسے نعمت خداداد کے طور پر بسر و چشم قبول کیا جانا چاہئے۔ چنانچہ اس دن سے رابطے کے جلسوں کے بہانے حج و زیارت اور عمروں کی مسلسل سعادت بھی اس گنہگار کا نصیب بن گئی۔ اور اللہ کی ذات کریمی سے امید ہے کہ بندہ جس چیز کو اپنے لئے سعادت سمجھے ہوئے ہے آخرت میں بھی اسے وہ سعادت ہی کی شکل میں پائے گا۔

ڈاکٹر ذاکر حسین خاں صاحب سے، مولانا علی میاں کی معیت میں

---

[1] مرحوم ڈاکٹر ذاکر حسین صاحب کو حضرت مولانا الیاس رحمۃ اللہ علیہ سے اسقدر عقیدت و محبت تھی کہ ڈاکٹر صاحب بیشتر صبح کی نماز بنگلہ والی مسجد (نظام الدین) آکر انہی کے پیچھے ادا کرتے تھے جمعہ کے دن تو خاص طور پر اسکا اہتمام کرتے تھے ــــ یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ اوکھلا سے نظام الدین تک ۲۰ میل کی مسافت ڈاکٹر صاحب پیدل ہی طے کرتے تھے۔

ملاقات ہوئی جس میں کشمیر کے مسئلے کی بات آئی تو اس سلسلے میں یہ عرض کردیا گیا کہ آپ تو ہم دونوں کو جانتے ہی ہیں۔ ہماری ہندوستانیت میں تو کسی کو شک وشبہ کی ضرورت نہیں ہے۔ البتہ ہم جو رائے اس سلسلے میں ابتک رکھتے آئے ہیں وہ حکومت ہند کی پوزیشن سے قدرے مختلف ہے اسلئے اگر مسئلہ آتا ہے تو ہم اپنی رائے کے خلاف پوزیشن تو نہیں اختیار کرسکتے لیکن اسی طرح ہمیں اپنی ہندوستانیت کا لحاظ بھی قدرتی طور پر عزیز ہوگا اور ایک جمہوری ملک میں کشمیریوں کی یہ پوزیشن قابل قبول ہونی چاہیے۔ اس طرح رابطہ عالم اسلامی کے رکن کی حیثیت سے حجاز مقدس کا یہ پہلا سفر ہوا۔ اور چوتھی بار حج وزیارت کی سعادت میسر آئی۔ اور پھر جبتک سفر سے معذوری نہ ہوگئی (جو دیوبند میں ایک ایکسیڈنٹ کی وجہ سے ٹانگ میں تکلیف پیدا ہوجانے کا نتیجہ ہے) اس وقت تک سعادت کا یہ دروازہ عملاً کھلا رہا۔ اور نظری طور سے آجتک بھی کھلا ہوا ہے۔ یعنی میں رابطہ کا بدستور ممبر ہوں۔ کم وبیش پندرہ سولہ حج اس دور میں میسر آئے اور عمروں کی تعداد تو بتانا مشکل ہے۔ یہ اس عاجز پر اللہ تبارک وتعالیٰ کا جتنا بڑا احسان ہے اس کا حقیقی اندازہ تو بس دو ہی طرح کے لوگ کرسکتے ہیں۔ ایک وہ جو عمر بھر اس سعادت کی آرزو میں دم گزار دیتے ہیں اور دوسرے وہ اہل دل جن کے لئے یہ سفر واقعی درِ محبوب کا سفر ہوتا ہے۔ اے اللہ تونے جس لطف وکرم سے یہ بے استحقاق حاضریاں نصیب فرمائیں اسی لطف وکرم سے ان کی قبولیت کا بھی فیصلہ فرما اور مجھے ان کے اخروی اجر سے محروم نہ فرما۔

دینی واصلاحی تصانیف کی توفیق

اس عاجز پر اللہ کے احسانات میں سے ایک بڑا احسان یہ بھی ہے کہ اسے متعدد ایسی کتابوں کی تصنیف و تالیف آسان فرمائی جس سے بندگانِ خدا کو بظاہر خاصا دینی فائدہ پہنچا ہے

اسلام کیا ہے؟

اِن میں سرِفہرست اُس کی سب سے سادہ و آسان کتاب "اسلام کیا ہے؟" ہے۔ جس کے بارے میں صرف اللہ ہی کو معلوم ہے کہ وہ واقعۃً کتنی تعداد میں اب تک شائع ہو چکی ہے۔ اس لئے کہ علاوہ مختلف زبانوں میں اسکے ترجمے کے خود اردو ہی میں مکتبہ الفرقان کے ازتیس [۳۴] اور دوسرے با علم و اجازت ایڈیشنوں کے علاوہ بے علم و اجازت ایڈیشن بھی کچھ کم نہیں نکل چکے ہیں۔

یہ کتاب تقسیم ہند (۱۹۴۷ء) کے بعد والے اُن حالات میں لکھی گئی تھی جن میں منقسم ہندوستان کے زمین و آسمان اسلام اور مسلمانوں کے دشمن نظر آ رہے تھے۔ اور لا ملجأ ولا منجا من اللّٰہ الا الیہ (اللہ کے عذاب سے پناہ اگر کہیں ہے تو وہ اللہ ہی کے دامن میں ہے) کی صورت تھی اس عاجز نے کوشش کی کہ ایک عام مسلمان کی ضرورت کے لئے پورا دین بہت آسان اور مؤثر دعوتی زبان میں قلم بند ہو جائے جو رجوع الی اللہ کا ذریعہ بنے۔ اور غیر مسلموں میں اسلام کی اصل صورت بھی واضح کرے۔ الحمدللہ کہ

دونوں ہی مقصد اپنی اہلیت و استحقاق سے کہیں زیادہ پورے ہوتے نظر آئے ہیں۔ ایک سفر میں اس عاجز نے ایک تعلیم یافتہ غیر مسلم کو اس کتاب کو پڑھتے اور روتے ہوئے بھی دیکھا۔ اور پھر وہ صاحب اس کے مصنف سے ملنے کی خواہش کے ساتھ اس عاجز کی طرف متوجہ بھی ہوئے کہ شاید اس کے ذریعہ مصنف کا پتہ چل جائے۔ فللّٰہ الحمد۔

دین و شریعت

اس کا موضوع وہی ہے جو اسلام کیا ہے کا ہے مگر وہ عوامی ذہن و فہم کی سطح کے مطابق تھی اور اس میں اُس سے اونچی ذہنی سطح کی ضرورتوں کو سامنے رکھا گیا ہے۔ یہ اصل میں ایک تربیتی اجتماع میں کی گئی تقریروں پر مبنی ہے۔ یہ تبلیغی جماعت کے خاص کارکنوں کا ایک ہفتے بھر کا تربیتی اجتماع تھا جس کا اہتمام لکھنؤ میں کیا گیا تھا۔

قرآن آپ سے کیا کہتا ہے؟

جیسا کہ نام سے ظاہر ہے۔ اس کتاب میں قرآن پاک کی عمومی دعوت کا خلاصہ مرتب کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ زبان بھی موضوع کے مطابق دعوتی ہی ہے۔

آپ حج کیسے کریں؟

یہ کتاب حج کی سعادت نصیب ہونے کے بعد یہ محسوس کر کے لکھی گئی تھی کہ ایک عام خواندہ عازم حج کے لئے ضرورت ہے کہ بالکل ایسی کوئی کتاب

لکھی جائے۔ جیسے کہ کوئی شخص کسی کو انگلی پکڑ کر حج کرا رہا ہے۔ اور حج کے اعمال کی ادائیگی کے وقت جن دینی و ایمانی جذبات سے حاجی کو سرشار ہونا چاہئے اُن جذبات کی تحریک کا سامان بھی اس کتاب میں پایا جاتا ہو۔ یہ عاجز مالک کا شکر گزار ہے کہ یہ کتاب ان ضرورتوں کے لحاظ سے مصنف کی توقع کے عین مطابق نہایت مفید ثابت ہوئی اور ہو رہی ہے اسکے کبھی کتنے ہی بلا اجازت چھپنے والے ایڈیشن ہندوستان و پاکستان کے بازار میں نظر آتے ہیں۔ یہ کتاب تمام تر اس عاجز کی تحریر پر مبنی نہیں ہے اس میں اسی نوعیت کا ایک نہایت روح پرور مضمون مولانا علی میاں کا بھی ہے اور کچھ مزید بھی۔

آسان حج

آپ حج کیسے کریں کے تجربے کی روشنی میں اس عاجز نے اپنے مضمون کو اور بہت زیادہ آسان اور کچھ مختصر کر کے ایک الگ کتابچے کی شکل میں شائع کرنا مفید سمجھا اور الحمدللہ وہ بھی عام عازمین حج کے لئے بہت نافع ثابت ہوا اور ہو رہا ہے۔ ان دونوں کتابوں کی بدولت امید ہے کہ سیکڑوں حجاج کی دعاؤں میں اس عاصی و عاجز کو بھی حصہ پانے کی سعادت مل گئی ہوگی اور انشاء اللہ ملتی رہے گی

ان کے علاوہ کلمۂ طیبہ کی حقیقت۔ نماز کی حقیقت نامی تالیفات کے بارے میں بھی عاجز کا گمان یہی ہے کہ ان مختصر رسالوں کے ذریعہ اللہ تعالٰی نے اپنے دین کی ایک اچھی خدمت کا موقع عطا فرمایا۔ اَللّٰھُمَّ صَدِّقْ ظَنِّیْ ھٰذَا۔

معارف الحدیث

آخری کتاب جو اس سلسلے میں بحمد شکر کے ساتھ قابل ذکر ہے وہ معارف الحدیث ہے جس کی سات جلدیں (ڈھائی ہزار صفحات پر مشتمل) الحمد للہ شائع ہو چکی ہیں۔ صرف ایک (آٹھویں) جلد کی اشاعت پر یہ کتاب ان شاء اللہ مکمل ہو جائے گی۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ اس آخری جلد کو بھی اپنے فضل و کرم سے مکمل کرا دے[1]۔ یہ کتاب اپنے زمانے کے خاص حالات اور ایک عام پڑھے لکھے آدمی کی ضرورت کو سامنے رکھتے ہوئے حدیث نبوی کے ضخیم دفتر سے ایک انتخاب ہے جو ترجمے کے ساتھ ایسی سادہ اور مختصر تشریح پر مبنی ہے جس سے حدیث کا اصل منزوحہ عام ذہن نشین اور دل نشین ہو اور عمل و روحانی اصلاح و ترقی کا ذریعہ بنے۔ اللہ کا احسان ہے کہ اس نے اس ضخیم تالیف کو تقریباً تکمیل کی منزل تک ہی نہیں پہنچا دیا۔ بلکہ اسکی افادیت اور مقبولیت کو بھی آنکھوں سے دکھا دیا۔ اس عاجز کے علم کے مطابق یہ کتاب ایسے متعدد حلقوں میں بھی باقاعدہ ترتیبی درس کے انداز میں پڑھی اور مطالعہ کی جاتی ہے جن حلقوں کا کوئی خاص تعلق اس عاجز سے نہیں ہے۔ مزید یہ کہ اس کتاب کی تالیف اگرچہ علمی نہیں بلکہ اصلاحی نقطۂ نظر سے کی گئی ہے مگر یہ بات کہنے میں کوئی مضائقہ نہیں کہ بہت سی علمی گرہیں جن پر درس حدیث میں اکثر لمبی بحثیں

---

[1] اس کی تکمیل کا کام اپنی معذوریوں میں اضافے کی وجہ سے عاجز کے لئے ممکن نہیں رہا تھا برادر زادۂ عزیز مولوی محمد زکریا استاذ حدیث دار العلوم ندوۃ العلماء کے سپرد کیا ہے کہ وہ اس کی تکمیل کریں۔ اور وہ الحمد للہ پوری دلچسپی سے کر رہے ہیں۔

ہوتی ہیں وہ اس کتاب میں بغیر اس کے کہ ان کو باقاعدہ موضوع بحث بنایا گیا ہو صاف طور پر حل ہوتی ملتی ہیں۔ حدیثوں کی بنیاد پر فقہی مسائل کے اختلافات کا تذکرہ صرف انتہائی ضرورت کے بقدر کیا گیا ہے اور وہ بھی حضرت شاہ ولی اللہؒ کے طرز پر ایسے انداز میں کہ اس سے افتراق باہمی کے رجحانات کی ہمت شکنی ہو۔ نہ یہ کہ ان رجحانات کو غذا ملے۔

ایرانی انقلاب، امام خمینی اور شیعیت

یہ اس عاجز کی سب سے آخری تالیف ہے۔ اور اس کی اپنی خاص نوعیت اور تاریخ کے اعتبار سے اس کی توفیق کو میں اللہ کا بہت ہی خاص بالخاص احسان اور انعام سمجھتا ہوں۔ یہ کتاب جس کی تیاری اس عاجز کے لئے خاصی محنت طلب یعنی ایک طویل مطالعہ اور گہرے غور و فکر کی محتاج تھی۔ اس کے لکھنے کا جن دنوں میں تقاضہ پیدا ہوا، اس وقت اس عاجز کی عمر اسّی سال سے اوپر ہو چکی تھی۔ اور کبرسنی کے ضعف کے علاوہ طرح طرح کے عوارض نے بھی گھیر رکھا تھا۔ خاص طور سے ہائی بلڈ پریشر کے مرض کی وجہ سے لکھنے پڑھنے کی صلاحیت بہت متاثر ہو گئی تھی۔

یہ تقاضہ سنہ ۱۹۸۳ء میں اس وقت پیدا ہوا جب ایران کے آیت اللہ روح اللہ خمینی صاحب نے ۱۹۷۹ء میں شاہ ایران کے خلاف اپنی تحریک میں کامیابی حاصل کر کے خالص شیعہ عقائد پر مبنی حکومت قائم کی۔ مگر اس کو ایک غیر فرقہ وارانہ خالص اسلامی حکومت اور اسلامی انقلاب کا نام دے کر ساری اسلامی دنیا میں غیر معمولی پیمانے پر پروپیگنڈہ کے ذریعے اپنی عالمی امامت تسلیم کرانے کی مہم چلائی۔ اور اسلامی دنیا کے وہ نوجوان خاص طور سے پروپیگنڈے

کہ اس سیلاب میں بہنے لگے جو مختلف اسلامی ملکوں میں چلنے والی اسلامی نظام حکومت کی تحریکوں کی کامیابی کا انتظار کرتے کرتے تھک گئے تھے اور کسی طرف سے کوئی اچھی خبر سننے کیلئے بے چین تھے ۔ مسلمان نوجوانوں کی فریب خوردگی کا یہ منظر کہ وہ شیعہ عقائد پر مبنی ایک حکومت کو اسلامی حکومت کی نظر سے ہی نہیں دیکھ رہے تھے بلکہ نہایت جوش و خروش سے خواہشمند اور دعا گو تھے کہ اس حکومت کا دائرہ ساری مسلم دنیا پر وسیع ہو جائے اس عاجز کے لئے ناقابل برداشت ہوا اور تقاضہ پیدا ہوا کہ کسی طرح دو باتیں لوگوں کو سمجھائی جائیں ۔ ایک یہ کہ خمینی صاحب کی حکومت خالص شیعہ مذہب کی بنیادوں پر مبنی ہے ۔ اور دوم یہ کہ شیعیت جس چیز کا نام ہے اگر کوئی غیر شیعہ مسلمان اس کو فی الحقیقت جان لے تو اسلام سے اس کا رشتہ جوڑنے کو وہ کبھی بھی قبول نہ کر سکے گا ۔ الا یہ کہ وہ باتوں کو سمجھنے کی صلاحیت ہی نہ رکھتا ہو یا کسی دنیاوی غرض سے مغلوب ہو ۔

اس کام کے لیے ضروری تھا کہ شیعیت کو اسکے مستند حوالوں سے پیش کیا جائے اور اس غرض کے لئے جو مطالعہ ضروری سمجھا گیا تھا وہ اس سے کہیں زیادہ محنت طلب اور صبر آزما ثابت ہوا جس کا شروع میں اندازہ کیا گیا تھا ۔ یہ ضعیف اور عاجز بندہ اسے صرف اللہ کی مدد کا کرشمہ سمجھتا ہے کہ سال بھر منہمک رکھنے والا یہ کام بالآخر تکمیل کو پہنچ گیا ۔ اور اللہ نے خمینی فتنے کے بارے میں نہ صرف یہ کتاب تیار کرادی ۔ بلکہ تقریباً پوری ہی اسلامی دنیا میں اسکا چرچا بھی آناً فاناً کرادیا ۔ اللہ ہی جانتا ہے کہ کتنے ملکوں میں اور کتنی زبانوں میں لوگوں نے از خود اسکا ترجمہ کیا اور پھیلایا ۔ اور مصنف کو ان کی دعائیں میسر آئیں ۔

یہ کتاب ابھی اردو میں بھی شائع نہیں ہوئی تھی بلکہ اسکا صرف ابتدائی حصہ ماہنامہ الفرقان میں قسط وار نکلا تھا کہ اس عاجز کے فاضل دوست مولانا سعید احمد اکبرآبادی مرحوم (مدیر برہان دہلی) جو برہان کے اداریوں میں خمینی صاحب کے اسلامی انقلاب کا زور دار خیر مقدم کر چکے تھے انھوں نے الفرقان کی یہ قسطیں پڑھ کر اکتوبر ۱۹۸۳ء کے برہان میں لکھا کہ

......اللہ تعالیٰ جزائے خیر عطا فرمائے ہمارے بلادر محترم مولانا محمد منظور نعمانی کو کہ انھوں نے نہایت محنت اور جاں نشانی سے اُن کتابوں کا براہ راست مطالعہ کیا جو خود علامہ خمینی کے قلم کی رہین منت ہیں۔ اور اس دقیق اور عمیق وکبیر مطالعہ کے نتائج صاف اور شستہ زبان میں نہایت سنجیدگی اور متانت کے ساتھ ماہنامہ الفرقان کی گزشتہ چند اشاعتوں میں شائع کر دیے ہیں۔

میں نے مولانا کے یہ مقالات بڑی دلچسپی سے از اول تا آخر پڑھے اور اب میں یہ اعلان کرتا ہوں کہ کہ ایرانی انقلاب یا موجودہ ایرانی حکومت کے متعلق میں نے اب تک برہان میں جو کچھ لکھا ہے میں اس سے رجوع کرتا ہوں۔

مولانا کے یہ مضامین، اس درجہ اہم اور بصیرت افروز ہیں کہ اُن کے مطالعہ کے بعد میں نہیں سمجھتا کہ کوئی بھی صحیح العقیدہ مسلمان ان سے اختلاف کی جرأت کر سکتا ہے .....؟

یہ کتاب اور سعودی علماء و حکام

اس کتاب کے سلسلے میں یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ ۱۹۸۳ء میں جب یہ کتاب تیار ہوئی تو یہ عاجز اپنے جسمانی عوارض کی بنا پر تقریباً ۲ سال سے

کہیں سفر کے قابل نہ رہا تھا۔ اور شدید ضرورت میں بہت اہتمام کے ساتھ ہی کوئی سفر کیا جاسکتا تھا۔ چنانچہ رابطہ عالم اسلامی کے جلسوں میں بھی شرکت بند تھی۔ مگر جس داعیے کے ماتحت یہ کتاب لکھی گئی تھی اس داعیے کی بنا پر یہ علم اور احساس بہت تکلیف دہ تھا کہ عرب ممالک خصوصاً حرمین شریفین کے ذمہ دار حضرات خمینی فتنے کے سلسلے میں بالکل ساکت و صامت ہیں حالانکہ اس فتنے کا سب سے اہم اور مقدم نشانہ حرمین شریفین پر قبضہ ہی تھا۔ اپنے اس احساس کے ماتحت ارادہ کیا کہ جس طرح بھی ممکن ہو اس سال (۱۴۰۶ھ) رابطے کے دعوت نامے پر سفر کیا جائے تاکہ وہاں کے ذمہ داروں تک اپنی بات پوری طرح پہنچائی جاسکے۔ چنانچہ عزیز القدر مولوی خلیل الرحمٰن سجاد اور برادرزادہ مولوی محمد زکریا کو ساتھ لے کر یہ سفر کیا، اور جس سے جو کچھ کہا جاسکتا تھا کہا گیا۔ مگر افسوس کے ساتھ ذکر کرنا پڑتا ہے کہ وہاں کے ذمہ داروں اور حکمرانوں پر اپنی دوسری مصلحتیں اتنی حاوی ہیں کہ خود اس کتاب کو بھی برسہا برس مملکت سعودیہ عربیہ میں داخلے کی اجازت نہ مل سکی۔ البتہ جب فتنہ بالکل ہی برہنہ ہو کر حملہ آور ہوا تب یہ بندش کھلی۔

دعا سے بالعموم مناسبت کا فضل

دعا کو حدیث نبوی میں "مُخُّ الْعِبَادَةِ" (عبادت کا مغز اور جوہر) کہا گیا ہے۔ اللہ کا اس گنہگار پر یہ غیر معمولی احسان ہے کہ اسے طبعی طور پر دعا سے مناسبت بخشی گئی ہے۔ اور وہ دعائیں جو آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم سے ماثور اور منقول ہیں ان کے بارے میں تو اللہ نے مزید یہ بات بھی نصیب

فرمائی ہے کہ وہ اس ضعیف الایمان کے ایمان میں مضبوطی اور ترقی کا ذریعہ بنتی ہیں۔ اور اگر ایمانی معاملات میں کوئی وسوسہ دل میں کبھی گھر کرنے لگتا ہے تو ان دعاؤں کا دھیان اسکے دفعیہ کے لئے سب سے زیادہ تیر بہدف نسخہ ہوتا ہے۔ ان دعاؤں کا ہر جزء اور ہر کلمہ اس عاجز کی نگاہ میں گواہی دے رہا ہے کہ جس بندے کی زبان سے یہ نکلی ہیں (یعنی حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم) اُن پر اللہ نے اپنی کامل معرفت کے تمام دروازے کھول دیئے تھے۔ اور اس طرح یہ مسنون دعائیں اللہ کی معرفت حاصل کرنیکا بہت ہی عجیب ذریعہ ہیں۔ دعا ہے کہ اسی مناسبت اور اس میں مزید ترقی کے ساتھ اس بندے کی زندگی کا خاتمہ ہو۔ وما ذالک علی اللہ بعزیز۔

ایک خاص دعا کی توفیق

اللہ کے بے شمار احسانات میں سے ایک خاص قابل ذکر احسان اس عاجز بندے پر یہ بھی ہے کہ اسے اپنے حق میں ہمیشہ اس مسنون دعا کی توفیق دی کہ

اَللّٰھُمَّ اجْعَلْنِیْ فِیْ عَیْنِیْ — اے اللہ مجھے میری اپنی نظر میں
صَغِیْرًا وَّفِیْ اَعْیُنِ النَّاسِ — چھوٹا اور دوسروں کی نظر میں
کَبِیْرًا — بڑا بنا دے۔

میرے جیسے لوگ جنہیں کچھ خاص حالات کی بنا پر شروع ہی سے تھوڑی بہت بڑائی لوگوں کی نظر میں ملنا شروع ہو جاتی ہے اور خود ان کے اوپر کوئی بڑا نگراں نہیں ہوتا۔ اُن کے لئے یہ وقت بڑی آزمائش کا ہوتا ہے کہ وہ خود غلط نہ ہو جائیں۔ میرے مالک کا بہت بڑا احسان ہے کہ گرچہ

وہ عجز و تواضع تو کبھی نصیب نہ ہوئی جو آدمی کی اصل بڑائی ہے، مگر اس حقیقت کے شعور سے اور اس کے لئے دعا کی توفیق سے بہر حال محرومی نہیں رہی۔ اور کیا عجب کہ وہ کریم مالک مرنے سے پہلے یہ دولت بھی نصیب فرما دے۔

مرحوم والدین، اہل حقوق و متعلقین اور عامۂ مومنین و مومنات کیلئے دعا کے اہتمام کی توفیق

دعا سے اس مناسبت کے طفیل اللہ نے اس بندے کیلئے یہ بھی آسان فرمایا کہ اپنے مرحوم والدین کیلئے دعائے رحمت و مغفرت کا اہتمام رکھے۔ اور ان کے ماسوا بھی جن لوگوں کا کوئی حق اس بندے پر آتا ہے، وہ چاہے قرابت کی وجہ سے ہو یا کسی اور وجہ سے، اور اُن سے بھی آگے تمام ہی اہل ایمان کیلئے بحمد اللہ دعائے خیر کے اہتمام کی توفیق رہتی ہے۔ اور اللہ نے اپنے کرم سے گویا اسے اس بندے کے روز مرہ زندگی کا جزو بنا دیا ہے۔ حق یہ ہے کہ ان میں سے ہر توفیق پر اگر میرا بال بال زبان شکر بن جائے تب بھی شکر کا حق ادا نہ ہوگا۔ اَللّٰھُمَّ لَکَ الحمدُ ولکَ الشکرُ لا احصی ثناءً علیک انت کما اثنیت علی نفسک۔

حصّہ دوم

بندگانِ حق کی یافت

شیخ الہند

حضرت مولانا محمود حسنؒ کی زیارت

میں ذکر کر چکا ہوں کہ ایک طالب علم کی حیثیت سے میں دار العلوم دیوبند میں شوال سنہ ۱۳۴۳ھ میں داخل ہوا تھا جبکہ حضرت شیخ الہندؒ کا وصال اس سے ۴-۵ سال پہلے اوائل سنہ ۱۳۳۹ھ میں ہو چکا تھا۔ مالٹا کی اسارت سے واپس آکر آپ صرف ۵-۶ مہینے حیات رہے تھے۔ میں اُن دنوں اپنے وطن سنبھل میں صرف نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھ رہا تھا، اس لئے اُس وقت میرے دیوبند جانے اور حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کرسکنے کا کوئی موقع ہی نہ تھا لیکن یہ سعادت میرے لئے مقدر تھی، الحمد للہ حاصل ہوئی اور عجیب طریقے حاصل ہوئی۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَاءُ۔

مالٹا سے حضرت کی واپسی رمضان المبارک سنہ ۱۳۳۸ھ کے اواخر میں ہوئی تھی ___ ٹھیک ان ہی دنوں میں میرے بارے میں فیصلہ ہوا کہ آگے کی تعلیم کے لیے مجھے حضرت مولانا کریم بخش صاحب (رحمۃ اللہ علیہ) کے سپرد کر دیا جائے، وہ اس زمانہ میں دہلی کے "مدرسہ عبد الرب" میں مدرس تھے اور رمضان مبارک کی تعطیل میں حسب معمول وطن تشریف لائے ہوئے تھے۔ حضرت مولانا سے ہم وطنی کے علاوہ قریبی رشتہ داری کا بھی تعلق تھا۔ ان سے جب میرے بارے میں عرض کیا گیا تو انھوں نے مجھے اپنے ساتھ رکھنا منظور فرما لیا اور بتلایا کہ شوال کی فلاں تاریخ کو میں دہلی کے لیے روانہ ہونے والا ہوں

حضرت مولانا کے ساتھ میرا جانا بھی طے ہو گیا۔

غالباً شوال کے پہلے ہفتہ کی کوئی تاریخ تھی، مولانا سنبھل سے دہلی کے لیے روانہ ہوئے، میں بھی ساتھ تھا۔ مولانا کے دو بڑے صاحبزادے بھی ساتھ تھے، ایک مولانا عبدالحق صاحب مرحوم جو اس وقت سیالکوٹ کے ایک مدرسہ میں مدرس تھے، دوسرے ان سے چھوٹے مولانا اضیار الحق صاحب مرحوم جو اس وقت کی ریاست جودھپور کے ایک قصبہ بیاوڑ میں مدرس تھے، ان دونوں حضرات کو اپنے اپنے مقام پر جانا تھا۔ سنبھل سے روانہ ہو کر ہم سب مرادآباد پہنچے، مجھے یہاں پہنچ کر معلوم ہوا کہ حضرت مولانا اور دونوں صاحبزادوں کے سفر کا پروگرام یہ ہے کہ پہلے اپنے استاذ و مخدوم حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے پھر وہاں سے اپنی اپنی منزلوں کے لیے روانہ ہوں گے (جیسا کہ ابھی ذکر کیا جا چکا ہے حضرت شیخ الہندؒ بس ہفتہ عشرہ پہلے ہی مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لائے تھے) مجھے جب سفر کا یہ پروگرام معلوم ہوا تو بےحد خوشی ہوئی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کی سعادت مجھے بھی حاصل ہوگی اُن دنوں ہر طرف حضرت کا ایسا چرچا تھا گویا کہ وہ ہندوستان کے "امام المسلمین" ہیں۔

ہم سب صبح کے قریب مرادآباد پہنچے تھے، وہاں سے دیوبند کے لیے ٹرین رات کو جانے والی تھی، مرادآباد کے "اسلامیہ مسافرخانہ" میں قیام کیا جو ریلوے اسٹیشن کے بالکل متصل اور سامنے تھا۔ اب تو ماشاءاللہ اس کی عالیشان دو منزلہ یا سہ منزلہ عمارت ہے، اُس وقت کچی خستہ سی عمارت تھی۔ چھوٹے چھوٹے برانے حجرے تھے یا کچے کچے کوٹھریاں تھیں جن کے آگے کھپریل کا سائبان تھا، مگر اچھی طرح یاد ہے کہ مسافرخانہ سے تعلق رکھنے والے چھوٹے بڑے سب

ملازمین میں گہری دینداری تھی اور خدمت کا جذبہ تھا۔ ایک درجہ میں خانقاہ کی سی فضا تھی ــــ یہ میرے لیے عمر کا سب سے پہلا سفر تھا، اس سے پہلے کبھی مرادآباد بھی آنا نہیں ہوا تھا، کسی مسافرخانہ کو دیکھنے اور اس میں ٹھہرنے کا بھی پہلا ہی موقع تھا۔ اتنا یاد ہے کہ یہاں کے آدمیوں کو اور اُن کی دینداری اور خدمت گزاری کو دیکھ کر کم عمری کے باوجود دل بڑا خوش ہوا تھا۔ اُس وقت کے اُس خستہ اور پُرانی سی عمارت اور کھپریل والے مسافرخانہ کی نورانی فضا اور بھلے غریب دربان اور محرر صاحب کی مولویانہ صورت نیک سیرت اور خوش اخلاقی، ۵۵ سال گزر جانے پر آج بھی حافظہ میں پوری طرح محفوظ ہے۔

مسافرخانہ کی جدید پختہ عمارت بننے کا فیصلہ اُس وقت ہو چکا تھا، صدر دروازہ پر لوہے کا قدآدم سیاہ بورڈ لگا ہوا تھا جس میں اُن چند حضرات کے نام تھے جنھوں نے جدید عمارت کے لیے رقوم دی تھیں، ان میں سب سے اوپر بہت جلی قلم سے "حضرت اقدس حکیم الامت مولانا اشرف علی تھانوی ظلہ العالی" کا نام نامی اُن ہی الفاظ میں تھا۔ اور چندہ کی رقم جہاں تک یاد ہے ۲۵ روپے لکھی تھی ــــ یہ بھی اس وقت معلوم ہوا تھا کہ حضرت تھانوی نے بارہا اس مسافرخانہ میں قیام فرمایا ہے۔

مرادآباد کے "اسلامیہ مسافرخانہ" کا یہ تذکرہ تو یوں ہی زبان قلم پر آ گیا اور جی چاہا کہ یہ پرانی لذیذ یاد بھی تحریر میں آ کر محفوظ ہو جائے ــــ ورنہ میں عرض یہ کر رہا تھا کہ ہمارے قافلہ کو دیوبند جانا تھا اور وہاں کے لیے ٹرین رات کو ملنے والی تھی، اُس وقت تک کے لیے ہم لوگ مسافرخانہ میں ٹھہرے ہوئے تھے۔ دیوبند کے لیے ٹکٹ بھی خرید لیے گئے تھے ــــ مغرب کچھ پہلے مرادآباد کی شاہی مسجد

مرادآباد کے اس وقت کے صدر مدرس (معلوم نہیں کہ اتفاقی طور پر یا حضرت مولانا کریم بخش صاحب کی اطلاع پاکر اُن سے ملاقات ہی کے لیے) مسافرخانہ میں تشریف لے آئے۔ اور جب ان کو معلوم ہوا کہ مولانا کا ارادہ حضرت شیخ الہند کی زیارت کے لیے دیوبند جانے کا ہے تو انھوں نے بتلایا کہ حضرت کا پروگرام آج فتح پور ہسوہ کے لیے روانگی کا ہے۔ اب اگر آج آپ دیوبند جائیں گے تو حضرت کی زیارت و ملاقات نہ ہو سکے گی ــ یہ معلوم ہو جانے کے بعد دیوبند کے ٹکٹ جو خریدے گئے تھے واپس کر دیے گئے، مولانا عبدالحق صاحب نے سیالکوٹ اور مولانا ضیاءالحق صاحب نے بیاز کا ٹکٹ خرید لیا اور حضرت مولانا کے اور میرے لیے دہلی کا ٹکٹ خرید لیا گیا ــ یاد ہے کہ دیوبند کے سفر کی اس وقت منسوخی کا مجھے بھی بڑا رنج ہوا تھا کیونکہ حضرت شیخ الہند کی زیارت کی جو امید بندھی تھی وہ ٹوٹ گئی۔

مرادآباد سے دہلی کے لیے ٹرین آدھی رات کے قریب چلتی تھی، ہم اسی سے روانہ ہوئے، صبح ۶ بجے کے قریب دہلی کے اسٹیشن پر اتر گئے، وہاں سے مدرسہ عبدالرب میں آئے، دیکھا کہ یہاں فرش وفروش کے غیر معمولی قسم کے کچھ انتظامات ہوئے ہیں، کچھ لوگ جمع ہیں اور ایک خاص قسم کی چہل پہل ہے ــ حضرت مولانا کریم بخش (رحمۃ اللہ علیہ) نے کسی سے پوچھا کہ یہ کیسے انتظامات ہیں؟ اُن صاحب نے بتایا کہ حضرت شیخ الہند تشریف لائے ہیں۔ اسٹیشن سے اتر کر ڈاکٹر انصاری کی کوٹھی پر تشریف لے گئے ہیں، وہاں سے ابھی یہاں مدرسہ میں تشریف لانے والے ہیں اور شام تک یہیں قیام فرمائیں گے رات کی ٹرین سے حضرت کا پروگرام فتح پور کے لیے روانگی کا ہے ــ یہ خبر سُن کر جیسی خوشی ہوئی ہوگی ناظرین اس کا کچھ اندازہ فرما سکتے ہیں۔

مدرسہ عبدالرب کے صدر مدرس اور روحِ رواں حضرت مولانا عبدالعلی میرٹھی قاسم العلوم حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ کے مشہور چار شاگردوں میں سے ایک اور حضرت شیخ الہند کے رفیق درس تھے فالج کے حملے نے چلنے پھرنے سے بالکل ہی معذور کر دیا تھا، خدام ہی اٹھاتے بٹھاتے تھے، لیکن مسندِ درس پر جب بٹھا دیا جاتا تو بالکل تندرستوں کی طرح پڑھاتے تھے ــــ حضرت شیخ الہند نے اپنے اس سفر کے پروگرام میں ایک دن دہلی کا قیام ان ہی کی زیارت و ملاقات کے لیے رکھا تھا۔

مدرسہ عبدالرب میں ہمارے پہنچنے کے تھوڑی ہی دیر بعد حضرت شیخ الہند مع اپنے رفقاء کے تشریف لے آئے اور اس طرح راقم سطور کو بھی نعمت غیر مترقبہ کے طور پر زیارت کی سعادت حاصل ہوئی۔

اس وقت تو عمر اور علم و شعور کی کمی کی وجہ سے اس لائق نہ تھا کہ اس شرف و سعادت کی قدر و قیمت سمجھتا، اس کے باوجود یاد ہے کہ صرف زیارت اور دیدار ہی سے بڑی خوشی ہوئی تھی ــــ بعد میں جب اللہ تعالیٰ نے ان باتوں کا کچھ شعور بخشا تو جانا کہ جہاد فی سبیل اللہ اور اعلاءِ کلمۃ اللہ کی تڑپ رکھنے والے اور اس کی رضا طلبی کی راہ میں اعداء اللہ اور اعداءِ اسلام کے ہاتھوں لرزہ خیز مصیبتیں اور تکلیفیں اٹھانے والے اور اس کی یاد اور چاہ میں اپنی ہڈیاں تک پگھلا دینے والے اس بندہ کی صرف زیارت ہی اللہ تعالیٰ کی کتنی عظیم نعمت تھی۔

حقیقت یہ ہے کہ خاصانِ خدا کو عقیدت اور محبت کے ساتھ صرف دیکھنے سے بھی ان کے ساتھ ایک نسبت قائم ہو جاتی ہے، اسی لئے جس کسی نے کسی صحابی کی صرف زیارت کی اس کو "تابعین" میں اور

جس نے کسی تابعی کی زیارت کی اس کو "اتباع تابعین" میں شمار کیا جاتا ہے ـــــ بلکہ حق یہ ہے کہ مقبولین بارگاہ خداوندی کی صرف زیارت بھی بڑی سعادت اور خوش بختی ہے اور کبھی اس کے بڑے غیر معمولی آثار و برکات ظاہر ہوتے ہیں۔

حضرت شیخ الہند کیا تھے اور اللہ تعالیٰ نے ان کو کن کمالات سے نوازا تھا اس کے جاننے کے لیے حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنی رحمۃ اللہ علیہ کی "نقش حیات" کا مطالعہ کرنا چاہیے۔

حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن رحمۃ اللہ علیہ

حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ منصب اور عہدہ کے لحاظ سے دار العلوم دیوبند کے مفتی اکبر (گویا بعد کی اصطلاح میں صدر مفتی) تھے، تفسیر یا حدیث کا کوئی سبق بھی پڑھا دیتے تھے، اسی کے ساتھ وہ نقش بندی مجددی طریقہ کے صاحب ارشاد شیخ بھی تھے، حضرت شاہ عبد الغنی مجددی مہاجر مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے خلیفہ حضرت مولانا شاہ رفیع الدین دیوبندی علیہ الرحمہ کی رہنمائی اور تربیت میں راہ سلوک طے کی تھی اور ان ہی کے مجاز تھے — وہ دار العلوم کے اُس وقت کے اکابر واساتذہ میں سب سے بڑے بلکہ سب کے بڑے تھے اور سب ہی اُن کا بڑا احترام کرتے تھے۔

حضرت مفتی صاحب میں جو کمال بہت ہی نمایاں تھا جس کو ہم جیسے صرف ظاہری آنکھیں رکھنے والے بھی دیکھتے تھے، وہ ان کی انتہائی بے نفسی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ اللہ کے اس بندہ کے اندر وہ چیز ہے ہی نہیں جس کا نام نفس ہے — یہ بات عام طور سے مشہور تھی کہ گھروں کے جو کام نوکروں اور نوکرانیوں کے کرنے کے ہوتے ہیں، حضرت مفتی صاحب عند الضرورت وہ سب کام (جیسے گھر میں جھاڑو دینا، برتنوں کا دھونا مانجھنا وغیرہ) یہ سب بے تکلف بلکہ بشاشت اور خوشی کے ساتھ کر لیتے ہیں، آس پڑوس کے غریب گھرانوں کا پیسے پیسے دو دو پیسے کا سودا بھی خرید کے بازار سے لا دیتے ہیں، دوسروں کے پھٹے ٹوٹے جوتے لے جا کر ان کی مرمت کرا لاتے ہیں۔

راقم سطور شہادت دے سکتا ہے کہ بے نفسی کا ایسا کوئی دوسرا نمونہ اس عاجز نے نہیں دیکھا۔

دارالعلوم کے اس وقت کے اکابر و اساتذہ میں ایک امتیازی فضیلت حضرت مفتی صاحب کی یہ بھی تھی کہ ان کی سند سب سے عالی تھی، اُن کو صحاح ستہ وغیرہ کتب حدیث کی اجازت حضرت مولانا شاہ فضل الرحمن گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ سے بھی حاصل تھی اور وہ حدیث میں براہ راست حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے، اگرچہ مشہور یہ بھی ہے کہ حضرت گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے شاگرد تھے اور ان سے بھی اجازت تھی، لیکن راقم سطور نے اس بارے میں حضرت مفتی صاحب سے دریافت کیا تو حضرت نے بتلایا کہ حضرت مولانا گنج مرادآبادی رحمۃ اللہ علیہ نے خود بیان فرمایا تھا کہ حدیث کی کتابیں میں نے حضرت شاہ محمد اسحاق صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے پڑھی ہیں اور ان ہی سے مجھے اجازت ہے، ہاں بچپن میں حضرت شاہ عبدالعزیز صاحب کی خدمت میں اور اُن کی مجالس میں حاضر ہوتا تھا، اس وقت میری عمر بہت کم تھی، چھوٹے بچوں کی طرح میں حضرت شاہ صاحبؒ کے گھر میں بھی آتا جاتا تھا۔

حضرت مفتی صاحبؒ کے علوِ سند کے اس امتیاز کی وجہ سے دورۂ حدیث کے بہت سے طلبا اُن سے حدیث کی خصوصی سند اور اجازت بھی لیتے تھے، اس عاجز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی، رجب ۱۳۳۳ھ میں جب دورۂ حدیث کی اکثر کتابیں ختم ہو چکی تھیں یہ ناچیز اور بعض اور رفقاءِ درس حضرت کی مسجد ہی میں حاضر ہوئے اور اجازت و سند کی درخواست کی، حضرت نے شیوخ حدیث کے طریقہ پر صحیح بخاری، صحیح مسلم، جامع ترمذی، سنن ابو داؤد، سنن نسائی

سنن ابن ماجہ، موطا امام مالک، موطا امام محمد اور امام طحاوی کی شرح معانی الآثار کے اوائل ہم لوگوں سے سنے اور ان سب کتابوں کی اور ان کے ساتھ حصن حصین کی بھی اجازت مرحمت فرمائی ـــــ اسی صحبت میں حدیث مسلسل بالاولیۃ بھی سنائی اور اس کی بھی اجازت دی اگرچہ اس کی اولیت کا تسلسل دوسری صدی ہجری میں ختم ہو چکا ہے۔

عرض کر چکا ہوں کہ دارالعلوم کے اُس وقت کے اکابر واساتذہ میں سب سے زیادہ عقیدت ومحبت تو اس عاجز کو حضرت شاہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے تھی، اُن کے بعد قلب میں سب سے زیادہ عظمت حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی تھی۔

دارالعلوم کی رسمی طالب علمی کا سلسلہ تو شعبان ۴۵ھ میں ختم ہو چکا تھا لیکن وہاں آمد ورفت کا سلسلہ اس کے بعد بھی برابر رہا، کسی نہ کسی تقریب یا بہانے سے سال میں دو چار دفعہ تو نوبت آ ہی جاتی تھی ـــــ ۱۳۴۶ھ کا غالباً کوئی مہینہ تھا، راقم سطور امروہہ میں مدرس تھا، دیوبند جانے کا کوئی محرک پیش آیا اور میں روانہ ہو گیا، جہاں تک یاد ہے شام کے وقت بازارات کے ابتدائی حصے میں دارالعلوم پہنچا ہوا، کسی نے بتلایا کہ حضرت مفتی صاحب سخت علیل ہیں، ارادہ کر لیا کہ انشاء اللہ صبح زیارت وعیادت کے لیے حاضر ہوں گا، لیکن اللہ کی مشیت کہ اس شب میں حضرت کا وصال ہو گیا، بعد نماز فجر غسل دیا گیا اُس وقت یہ عاجز اپنی خوش قسمتی سے حاضر تھا، غسل کے وقت اور پھر کفن پہنانے کے وقت قلب کو ایک عجیب سکینت کی کیفیت حاصل تھی جس کا کم از کم اس عاجز کو نہ کبھی اُس سے پہلے تجربہ ہوا تھا نہ اس کے بعد ہوا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عثمانی رحمۃ اللہ علیہ (مہتمم دارالعلوم دیوبند)

حضرت مفتی صاحب کے چھوٹے بھائی تھے۔ اُن کے پاس کرپ مکرر کے غلاف کے استر کا کبھی کا رکھا ہوا ایک ٹکڑا تھا قریباً سوا گز لمبا رہا ہوگا وہ کفنی کے بالائی حصے کے لیے کافی ہو سکتا تھا، یہ دیکھنے میں ایک خستہ پرانا سا کپڑا تھا، کبھی اس کو دھویا بھی نہیں گیا تھا (اور دھونا چاہیے بھی نہیں تھا) اس کو جوڑ کر کفنی بنائی گئی۔ جب غسل کے بعد وہ کفنی پہنائی گئی تو اس بظاہر خستہ پرانی بے دھلی فقیرانہ کفنی میں حضرت مفتی صاحب کو دیکھ کر دل پر ایک خاص اثر ہوا جس کو الفاظ میں ادا کرنا مشکل ہے ــــ پھر نماز جنازہ اور تدفین میں بھی شرکت کی سعادت نصیب ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب کے فرزند اکبر مولانا مفتی عتیق الرحمن عثمانی مرحوم کی درخواست پر دارالعلوم کے استاذ حدیث اور اپنے دور کے مسلم ولی اللہ حضرت مولانا سید اصغر حسین صاحب (عرف حضرت میاں صاحب) نے نماز پڑھائی۔ اس عاجز کو اس کی بڑی خوشی ہے کہ اللہ تعالیٰ نے محض اپنے فضل سے اس دن دیوبند پہنچا دیا ــــ یقیناً یہ بھی اس بندہ پر اللہ تعالیٰ کا خاص انعام تھا۔ فللہ الحمد ولہ الشکر

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ

راقم سطور شوال سنہ ۱۳۲۲ھ میں جب ایک طالب علم کی حیثیت سے دارالعلوم دیوبند میں داخل ہوا تھا تو اگرچہ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی صاحبؒ کو اس وقت کاغذات میں "نائب مہتمم دارالعلوم" دیوبند ہی لکھا جاتا تھا اور ضابطے میں اُن کا عہدہ اور منصب یہی تھا لیکن فی الحقیقت وہی مہتمم تھے، حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحبؒ جو عہدہ کے لحاظ سے اصل مہتمم تھے، کچھ مدت پہلے سے "مرحوم ریاست حیدرآباد" کے "مفتی عدالت عالیہ" کا منصب قبول فرما چکے تھے اور اس کی وجہ سے وہیں قیام فرما تھے۔ بلکہ کہا جاتا تھا کہ حضرت حافظ صاحب کے حیدرآباد تشریف لے جانے سے پہلے بھی اہتمام سے متعلق کاموں کا زیادہ تعلق حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب ہی سے رہتا تھا غالباً اس میں اس کو بھی دخل تھا کہ دونوں حضرات میں ایسا تعلق تھا کہ دوئی کا احساس ہی نہیں تھا۔

ایک دفعہ دارالعلوم کی میری طالب علمی ہی کے زمانہ میں ایک جلسہ میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا تھا کہ میں اپنے کو دارالعلوم کا نائب مہتمم کہتا اور لکھتا ہوں لیکن واقعہ یوں ہے کہ حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ نے جب مجھے اس خدمت کے لیے مامور اور مقرر کیا تھا تو مجھے "نائب مہتمم" نہیں بلکہ "مہتمم ثانی" بنایا تھا۔

بہرحال ہر قسم کی ذمہ داری اور عمل دخل کے لحاظ سے وہی اُس وقت

دارالعلوم کے مہتمم تھے اور حق یہ ہے کہ شانِ مہتمم تھے ـــــ ہر طرف سے یکسو ہو کر صرف دارالعلوم ہی کو انھوں نے اپنی زندگی کا مصرف اور موضوع بنا لیا تھا۔ اہل و عیال کے جھمیلوں سے بھی اللہ نے آزاد رکھا تھا، بس اپنی اکیلی زندگی تھی، دارالعلوم کا دارالاہتمام (یا دفترِ اہتمام) ہی ان کا مسکن تھا یہیں کے ایک کونے میں پلنگ پر اُن کا بستر لگا رہتا تھا ـــــ دیکھنے میں نہایت ضعیف اور نحیف تھے، معلوم ہوتا تھا کہ بوڑھی اور سوکھی ہڈیوں کا ایک کشیدہ قامت ڈھانچہ ہے جس پر کھال منڈھی ہوئی ہے، مگر آنکھوں میں غیر معمولی قسم کی ایک چمک تھی، چلتے پھرتے ہمیشہ تسبیح ہاتھ میں رہتی لب متحرک ـــــ لَایَزَالُ لِسَانُكَ رَطْبًا مِنْ ذِكْرِ اللّٰهِ کی تصویر نظر آتی۔

مشہور تھا کہ غذا برائے نام ہی ہوتی ہے، بس چائے اور دواؤں پر گزارا ہے۔ سنتے تھے کہ چائے بہت اعلیٰ قسم کی استعمال ہوتی ہے، ذوق نہایت لطیف ہے، دودھ بھی پیالی میں چھلنی سے چھان کر ڈالا جاتا ہے کہ بالائی کا کوئی ریشہ نہ آجائے۔ کیا عجب کہ ذوق کی یہ لطافت اپنے مرشد حضرت گنگوہیؒ کی خدمت کی برکات میں سے ہو ـــــ میں نے کئی بزرگوں سے یہ واقعہ سنا ہے کہ یہی حضرت مولانا حبیب الرحمٰن عثمانی ایک زمانہ میں حضرت گنگوہیؒ کے ہاں خادمانہ طور پر مقیم تھے، تہجد کے وقت حضرت کے لیے چائے تیار کرنے اور پلانے کی خدمت اپنے ذمے لے رکھی تھی۔ ایک رات کو چائے تیار کر کے حضرت کو پیش کی۔ حضرت نے چائے پینا شروع کی اور فرمایا، مولوی حبیب! آج چائے میں کچے پانی کا اثر ہے ـــــ اگلے دن انھوں نے چائے کے تیار کرنے میں خاص احتیاط کی، کیتلی کو پہلے کھولتے ہوئے پانی سے گرم کیا اُس کے بعد اُس میں چائے بنائی پھر پیالی تیار کر کے حضرت کی خدمت میں پیش کی۔ حضرت نے پیالی

منہ سے لگائی اور فرمایا مولوی حبیب آج بھی کچے پانی کا کچھ اثر ہے، انھیں سخت ندامت ہوئی اور تعجب بھی ہوا ___ اگلی رات کو انھوں نے پھر بہت احتیاط اور اہتمام سے چائے تیار کی اور مزید یہ کیا کہ پیالی کو دھو کر پہلے تولیہ سے خشک کیا، اس کے بعد اس میں چائے بنا کر حضرت کی خدمت میں پیش کی، حضرت نے چائے پی اور فرمایا۔ مولوی حبیب! آج کچے پانی کا وہ اثر نہیں ہے۔

حضرت گنگوہی قدس سرہٗ کی لطافتِ مزاج کے حضرت مرزا مظہر جانِ جاناںؒ کی طرح اس طرح کے بہت سے قصے مشہور ہیں، تو ممکن ہے کہ چائے کے بارہ میں حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کے ذوق و مزاج کی لطافت قیامِ گنگوہ کی برکات میں سے ہو۔

میں عرض یہ کر رہا تھا کہ مولانا حبیب الرحمٰن عثمانیؒ بہت ہی ضعیف اور نحیف تھے، اُن کے دُبلے پتلے اور سوکھے جسم کو دیکھ کر خیال ہوتا تھا کہ انکی رگوں میں خون بس برائے نام ہی ہوگا، مگر اس حالت میں بھی کارکردگی کا یہ عالم تھا کہ جب بھی کسی ضرورت سے دارالاہتمام کی طرف سے گزرنا ہوتا حضرت مولانا کو کام ہی میں معروف و منہمک دیکھا جاتا۔

اللہ تعالیٰ نے بڑا ہی تیقظ دیا تھا۔ اپنی جگہ بیٹھے بیٹھے دارالعلوم کے ہر گوشے اور شعبے کی خبر رکھتے تھے، سب بڑوں اور چھوٹوں پر اُن کا غیر معمولی اثر اور بڑا رعب تھا ___ طلبہ کے ساتھ اُن کا رویہ بڑا ہی مشفقانہ تھا، جو طالب علم اپنی کوئی ضرورت لے کر اُن کی خدمت میں حاضر ہوتا، پوری توجہ اور ہمدردی سے اس کی بات سنتے اور چاہے اس بیچارہ کا کام بالکل نہ ہو پاتا لیکن وہ یہ احساس اور تاثر لے کر واپس آتا کہ مجھ پر حضرت مہتمم صاحب کی خاص نظرِ عنایت ہے،

اللہ تعالیٰ نے یہ خاص کمال حضرت مورخ کو عطا فرمایا تھا ــــ خود اپنا ذاتی واقعہ عرض کرتا ہوں، میں ایک طالب علم کی حیثیت سے دو سال دارالعلوم میں رہا (میرا قیام چند اور طلبہ کے ساتھ دارالعلوم سے باہر مطبع قاسمی کے ایک خستہ سے کمرے میں تھا) میری برابر یہ خواہش اور کوشش رہی کہ دارالعلوم کے احاطہ کے اندر کسی مناسب حجرہ میں قیام کی جگہ مل جائے۔ کئی دفعہ حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں درخواست لے کر حاضر ہوا۔ خوب یاد ہے جب پہلی دفعہ اس ضرورت سے حاضری ہوئی اور درخواست پیش کی، حضرت ممدوح نے بڑی ہمدردی اور شفقت کا معاملہ فرمایا، درخواست پڑھ کر فوراً اس پر کچھ لکھا اور اپنے پیش کار مولوی عبدالاحد صاحب کو (جو برابر کے کمرے میں بیٹھ کر کام کرتے تھے) خود بلند آواز سے پکارا ــــ مولوی عبدالاحد! وہ فوراً حاضر ہوئے میری طرف اور میری درخواست کی طرف اشارہ کرتے ہوئے اُن سے فرمایا۔ "یہ حجرہ کے لیے مولوی صاحب کی درخواست ہے اس کو اپنے پاس رکھئے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ خالی ہو پہلے مولوی صاحب کو دی جائے۔" میں مطمئن بلکہ بہت خوش ہو کر واپس آ گیا۔ لیکن جب دو تین مہینہ تک کوئی انتظام نہیں ہوا تو پھر دوسری درخواست لے کر حاضر ہوا۔ حضرت مہتمم صاحب نے پھر ویسی ہی شفقت کا معاملہ فرمایا، پھر اسی طرح پیشکار مولوی عبدالاحد صاحب کو خود ہی پکار کے بلایا اور میری طرف اشارہ کرتے ہوئے ان سے فرمایا کہ "بھئی مولوی صاحب کی درخواست پہلے بھی آئی تھی، آپ کے لیے ابھی تک حجرہ کا انتظام نہیں ہو سکا؟" ــــ انھوں نے اپنے خاص انداز میں عرض کیا کہ حضرت ابھی تک کوئی اچھی جگہ خالی نہیں ہوئی ــــ حضرت مہتمم صاحب نے پھر فرمایا کہ "بھئی خیال رکھنا چاہیے اور جب بھی کوئی مناسب جگہ نکلے مولوی صاحب کو

پہلے دینا چاہیے ۔ اور میری دوسری درخواست بھی کچھ لکھ کر مولوی عبدالاحد صاحب کے حوالے کر دی گئی ، میں پھر مطمئن ہو کر واپس آ گیا اور میرے دل نے پوری طرح محسوس کیا کہ حضرت مہتمم صاحب کو میرا بڑا خیال ہے اور مجھ پر خاص نظرِ عنایت ہے اور اب تک مجھے جگہ نہ مل سکنے کا خود اُن کو بھی رنج اور قلق ہے۔

دارالعلوم کے دو سالہ قیام میں کم از کم ۳-۴ دفعہ اس طرح درخواست لے کر حضرت مہتمم صاحب کی خدمت میں حاضری کی نوبت ضرور آئی تھی ، اگرچہ نتیجہ یہ ہوا کہ اپنے قیام کے آخری دن تک بھی مجھے دارالعلوم کے احاطے میں جگہ نہیں مل سکی لیکن یہ خیال مجھے کبھی نہ ہوا کہ حضرت مہتمم صاحب نے بے توجہی برتی ، بلکہ میرا تاثر ہر دفعہ یہی رہا کہ ان کو تو میرے ساتھ بڑی ہمدردی اور بڑی مربیانہ فکر ہے لیکن اتفاق سے کوئی جگہ ہی نہیں نکل سکی ، یا نیچے کے حضرات نے دوسرے لوگوں کو ترجیح دی اور میں محروم رہا۔

بہر حال حضرت مہتمم صاحب کا رویہ اس قدر مشفقانہ تھا کہ اُن کی طرف سے دل میں شکایت کی کبھی لہر بھی نہیں پیدا ہوئی ۔

ایک دفعہ طلبہ میں دارالعلوم کے بعض انتظامی کارکنوں کے کسی نامناسب طرزِ عمل سے بڑا فرو خشگی پیدا ہوئی ، لیڈرانہ مزاج رکھنے والے کچھ طالب علموں نے اس کو ایک احتجاجی تحریک کی شکل دینے کی کوشش شروع کی ۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب نے طلبہ کو جمع کر کے خطاب فرمایا ۔ ان کی اس تقریر کے یہ الفاظ اب تک میرے کانوں میں گونج رہے

سن لو ! تم میرے جو لو میں تمہارا ہوں ، تم ہی میری اولاد ہو ، تمہارے ہی ساتھ جی رہا ہوں ، انشاء اللہ تمہارے ہی درمیان رہتے ہوئے مروں گا ، تم ہی میری تجہیز و تکفین کرو گے ، تم ہی میری نماز جنازہ پڑھو گے ، تم ہی مجھے دفن کرو گے ۔"

اس طرح اپنا یہ خطاب کرنے کے بعد تنبیہ بھی خوب فرمائی ۔۔۔ اُس وقت بالکل ایسا محسوس ہوا کہ شاید سب کے دلوں کا غسل ہو گیا۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب کوئی رسمی اور روایتی قسم کے واعظ اور خطیب نہیں تھے لیکن بڑی ٹھوس مدلل اور دلنشین تقریر فرماتے تھے۔ میں نے ان سے بہتر کسی سے مسلک جماعت دیو بند کی ترجمانی نہیں سنی۔

میری طالب علمی کے آخری سال میں پنجاب کے ایک بہت بڑے پیر صاحب جو ایک ایسی درگاہ کے صاحب سجادہ تھے جس کا حلقۂ اثر و عقیدت وہاں کی درگاہوں اور گدیوں میں غالباً سب سے زیادہ وسیع ہوگا، دار العلوم تشریف لائے۔ یہ پیر صاحب پنجاب کے اکثر سجادہ نشینوں کی طرح بے علم نہیں تھے، بلکہ صاحبِ علم تھے لیکن اندازہ کیا جاتا تھا کہ اگرچہ ان کے دل میں اکابر علماء دیو بند کا احترام ہے اور وہ بریلوی ذہن کے قطعاً نہیں ہیں تاہم کسی نہ کسی درجہ میں جماعت دیو بند کے بارہ میں اس قسم کی غلط فہمیوں میں مبتلا ہیں جن میں ناخدا ترس مخالفین کے پروپیگنڈہ سے بہت سے ناواقف مخلص حضرات بھی مبتلا ہو جاتے ہیں ۔۔۔ دو تین دن اُن کا قیام دار العلوم میں رہا، ایک دن غالباً اُن کے بعض رفقاء کی یہ خواہش معلوم ہونے پر کہ وہ یہاں کے حضرات اکابر سے کچھ سننا اور مستفید ہونا چاہتے ہیں، حضرت پیر صاحب کے اعزاز و اکرام میں دار العلوم کی طرف سے ایک خاص جلسہ ہوا اس میں حضرت الاستاذ العلامہ محمد انور شاہ کشمیریؒ اور حضرت مولانا سید محمد مرتضیٰ حسن صاحب چاندپوری نے بھی خطاب فرمایا۔ حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ نے بڑے مدلل انداز میں اور بڑے مؤثر و دلنشین طریقہ پر اپنے اکابر کے

مسلک و مشرب کی وضاحت فرمائی۔

جہاں تک یاد رہ گیا ہے اُس کا حاصل اور خلاصہ یہ تھا کہ ــــــ

ہم اور ہمارے اکابر عقائد اور اصول میں طریقہ اہل السنۃ والجماعۃ کے متبع ہیں اور پوری طرح مطمئن ہیں کہ وہی طریقہ ما انا علیہ واصحابی کا مصداق ہے۔

فروع میں ہم پوری بصیرت کے ساتھ فقہ حنفی کا اتباع کرتے ہیں اور اتباع ہوی اور اعجاب کل ذی رأی برأیہ کے اس دور میں عام امت کے دین کی حفاظت کے لیے اور فتنوں سے ان کو بچانے کے لیے ائمہ کی تقلید شخصی کو ہم پورے شرح صدر کے ساتھ ضروری سمجھتے ہیں۔

اور حضرات صوفیاء کرام کی نسبت احسان اور تزکیۂ اخلاق کو ہم روحِ دین سمجھتے ہیں۔

ان تینوں اصولی باتوں پر حضرت مہتمم صاحب نے پوری تفصیل اور بھرپور استدلال کے ساتھ روشنی ڈالی تھی۔ خاص کر تقلید شخصی کے بارہ میں جو کچھ اس تقریر میں فرمایا تھا وہ بہت ہی بصیرت افروز اور اطمینان بخش تھا۔ واقعہ یہ ہے کہ اس موضوع پر آج تک بھی میں نے ایسی اطمینان بخش نہ کوئی تحریر پڑھی نہ کسی کی تقریر سنی۔

حضرت مولانا حبیب الرحمٰن صاحب رحمۃ اللہ علیہ اس دور میں صرف دارالعلوم کے مہتمم اور انتظامی افسر ہی نہیں تھے بلکہ واقعہ یہ ہے کہ پوری جماعت کے زعیم وقائد، ترجمان اور گویا غیر رسمی امیر کا مقام بھی ان کو حاصل تھا۔ ہر اہم معاملہ میں وہی پالیسی طے فرماتے تھے، ان کو اطمینان رہتا تھا کہ پوری جماعت دارالعلوم

پیرے ساتھ ہے اور یہ المیان رحق ہوتا تھا۔ مگر افسوس ہے کہ آخری دور میں جماعت کی وحدت اور یگانگت کو نظر لگ گئی، باہمی اعتماد و اتحاد کی خاص برکات اٹھ گئیں اور ان کی جگہ اختلاف و انتشار کے نامبارک اثرات نے لے لی، اور جب صحابۂ کرام کی مقدس جماعت بھی نزاع باہمی کے خداوندی امتحان سے نہ بچ سکی تو کون طبقہ اور کون گروہ ہو سکتا ہے جو اس ابتلاء اور امتحان سے ہمیشہ محفوظ رہنے کا استحقاق رکھتا ہو۔ یفعل اللہ ما یشاء ویحکم ما یرید۔

۱۳۴۷ھ میں حضرت مولانا حافظ محمد احمد صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد مولانا حبیب الرحمٰن صاحب عہدہ اور منصب کے لحاظ سے بھی دارالعلوم کے مہتمم قرار پا گئے تھے لیکن اس کے بعد صرف ایک سال کے قریب حیات رہے اور ۱۳۴۸ھ میں وفات پا گئے۔

رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین

حکیم الامت حضرت مولانا

اشرف علی تھانوی قدس سرہٗ

پہلی زیارت اور پہلی حاضری

عربی تعلیم شروع ہونے کے بعد جس مدرسہ میں بھی پڑھنے کا اتفاق ہوا، وہاں اپنے اساتذہ سے اس دور کے بہت بڑے عالم و بزرگ اور شیخ وقت کی حیثیت سے سب سے زیادہ تذکرہ حضرت مولانا اشرف علی تھانویؒ ہی کا سُنا، غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ حضرت کے مواعظ ملفوظات اور دینی و اصلاحی کتابیں اُس وقت کثرت سے شائع ہو رہی تھیں اور مسلمانوں کی دینی اصلاح کے لیے حضرت ممدوح اُس زمانہ میں سفر بھی کثرت سے فرماتے تھے، شہروں شہروں وعظ ہوتے تھے، بیعت و ارشاد کا سلسلہ بھی اُس وقت کے مشائخ حق میں جہاں تک اندازہ ہے سب سے زیادہ وسیع تھا، اور جماعت دیوبند کے مخالفین اہل بدعت اپنی بدگوئی اور معاندانہ پروپیگنڈے کا نشانہ بھی سب سے زیادہ آپ ہی کی شخصیت کو بناتے تھے۔ ان سب وجوہات سے ہمارے مدارس عربیہ اور دینی حلقوں میں میری طالب علمی کے ابتدائی دور میں سب سے زیادہ تذکرہ حضرت تھانویؒ ہی کا رہتا تھا، لیکن پہلی دفعہ زیارت کی سعادت سنہ ۱۳۴۲ھ میں اُس وقت حاصل ہوئی جب میں دارالعلوم مئو (ضلع اعظم گڑھ) میں شرح عقائد، میر زاہد رسالہ اور

دیوان متنبی وغیرہ پڑھ رہا تھا ۔۔۔ حضرت کی تشریف آوری کی اطلاع پہلے سے ہو چکی تھی۔ جس ٹرین سے حضرت تشریف لانے والے تھے، وہ ٹھیک دوپہر کے وقت پہنچتی تھی۔ موسم بھی سخت گرمی کا تھا۔ اس کے باوجود ہمارے مدرسے کے قریباً سب ہی اساتذہ اور ذمہ دار حضرات اور طلبہ، اور قصبہ مؤ کے بہت سے علمائے کرام اور اصحاب وجاہت اور عام دیندار مسلمان بہت بڑی تعداد میں حضرت کی زیارت واستقبال کے لیے ریلوے اسٹیشن پہنچ گئے تھے۔

اس وقت لوگوں سے سنا تھا کہ حضرت کے ساتھ رفقاء سفر کی اچھی خاصی تعداد رہتی ہے۔ یہ سب مختلف مقامات کے مسترشدین اور طالبین اصلاح ہوتے ہیں جو صحبت سے استفادہ اور اپنی اصلاح وتربیت کے لیے حضرت سے اجازت لے کر سفر میں ساتھ ہو جاتے ہیں۔ ان میں سے ہر شخص اپنے مصارف کا بار خود ہی اٹھاتا ہے، یہاں تک کہ اپنے میزبان کو بھی مولانا اس کی اجازت نہیں دیتے کہ وہ آپ کے ان رفقاء کو بھی اپنا مہمان بنا لے۔ وہ لوگ ہر جگہ پہنچ کر اپنے قیام کا انتظام بھی حضرت سے الگ بطور خود کسی دوسری جگہ کرتے ہیں۔ یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ یہ سب پابندیاں اس لیے ہیں کہ کسی میزبان پر میزبانی وانتظام کا بار نہ پڑے۔ یہ بھی سنا تھا کہ ان سب باتوں کی بڑی سختی سے پابندی کی جاتی ہے۔

ٹرین اپنے وقت پر آئی۔ حضرت مولانا ٹرین سے اُترے تو پہلی مرتبہ زیارت کی، جیسا کہ پہلے سن لیا تھا، حضرت کے ساتھ رفقاءِ سفر کی بھی اچھی خاصی تعداد اتری، لوگوں کو پہلے سے کہہ دیا گیا تھا کہ زیارت ومصافحہ کے لیے ہجوم نہ کریں، اس ہدایت پر سب نے عمل کیا، حضرت ٹرین سے اتر کر پلیٹ فارم ہی پر ایک جگہ دیوار کے سایہ میں کھڑے ہو گئے اور یہاں سب نے سلام اور مصافحہ کیا۔

اس ناچیز کو بھی یہ سعادت حاصل ہوئی۔ اب تک یاد ہے کہ حضرت کا ہاتھ ایسا نرم معلوم ہوتا تھا کہ اس سے پہلے یا اس کے بعد بھی ایسا نرم کسی ہاتھ کا دیکھنا یاد نہیں۔ اس کے بعد حضرت اسٹیشن سے اپنی قیام گاہ تشریف لے گئے۔ دوسرے رفقاء کو جہاں جہاں جانا تھا وہ وہاں چلے گئے۔ ہم مدرسہ واپس آگئے۔

یہ معلوم ہو گیا تھا کہ نماز عصر کے بعد قیام گاہ پر حضرت سے ملاقات ہو سکے گی اس وقت مجلس بھی ہوگی اور رات کو بعد عشاء وعظ ہوگا۔ دار العلوم کے صدر مدرس حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی (علیہ الرحمۃ) جو گویا میرے سرپرست بھی تھے، زیارت و ملاقات کے لیے نماز عصر مدرسہ کی مسجد میں پڑھ کر حضرت کی قیام گاہ پر تشریف لے گئے، میں بھی ساتھ ہو گیا۔ حضرت حکیم الامتؒ حضرت مولانا کریم بخش صاحب سے اچھی طرح واقف تھے، کھڑے ہو کر مصافحہ فرمایا اور بڑے اکرام کا معاملہ فرمایا اور اصرار کر کے اپنے برابر میں بٹھایا۔ یہ مجلس کا وقت تھا۔ حضرت کے تمام رفقاء سفر بھی موجود تھے۔ ان کے علاوہ مئو کے علماء و خواص کی اچھی خاصی تعداد تھی۔ مغرب تک حضرت کی مجلس جاری رہی۔ مجلس سے اٹھ کر مغرب کی نماز حضرت کی اقتدا میں قریب کی مسجد میں پڑھی۔ حضرت حکیم الامت کی خدمت میں ناچیز راقم سطور کی یہ پہلی حاضری تھی اور یہ پہلی نماز تھی جو حضرت کی اقتدا میں پڑھی تھی۔ یہ یاد ہے کہ اس نماز میں حضرت کو اتنا پسینہ آیا تھا اور کرتے کا بالائی حصہ اس طرح تر بتر تھا کہ معلوم ہوتا تھا کہ پانی اوپر سے انڈیل دیا گیا ہے اسی وقت کسی سے سنا تھا کہ کسی زمانہ میں حضرت کو زہر دیا گیا تھا۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے زندگی تو ختم نہیں ہوئی لیکن اس کے اثر سے مزاج میں ایسی حدت اور گرمی پیدا ہو گئی ہے اور یہ پسینہ اسی کے اثر سے ہے۔ واللہ اعلم۔

پھر عشاء کے بعد حضرت کا وعظ ہوا۔ بہت ہی بڑا مجمع تھا، اور یہ پہلا وعظ تھا جو راقم سطور نے حضرت کا سنا تھا، اس کے کچھ مضامین اور دلچسپ لطیفے اب تک یاد ہیں۔

اس کے بعد تین سال طالب علمی میں گزرے۔ شعبان ۱۳۴۵ھ میں دارالعلوم کے دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اور شوال سے درس و تدریس کا دَور شروع ہوگیا۔ کچھ ہی دنوں پہلے یہ عظیم تاریخی واقعہ یا حادثہ ہو چکا تھا کہ مکہ مکرمہ کے شریف حسین کو (جو ترکی حکومت اور خلیفۃ المسلمین سے بغاوت و غداری کرکے برطانوی حکومت کی خاص مدد سے حجاز پاک کا فرماں روا بن گیا تھا) نجد کی سعودی حکومت کے سلطان عبدالعزیز بن سعود نے شکست دے کر حجاز مقدس پر قبضہ کر لیا اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں کے بہت سے مزارات کے اُن قبوں کو منہدم کر دیا جن کو وہ شرعاً منکر اور "واجب الازالہ" سمجھتے تھے۔ حجاز پاک میں ہونے والے اس واقعہ نے یہاں ہندوستان میں مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے متبعین اور قبر پرست مبتدعین کو اس کا موقع فراہم کر دیا کہ وہ اکابر علمائے دیوبند وغیرہ علمائے حق کے خلاف جن کو وہ وہابی کہتے تھے، فتنہ پردازی کا وہ بازار اور کاروبار پھر گرم کریں جو تحریک خلافت و ترک موالات کے اثر سے بالکل سرد پڑ گیا تھا ۔۔۔ بہرحال بریلوی فتنہ پردازوں نے نجد کی وہابی سعودی حکومت کے قبر شکنی کے واقعہ کو "قمیص حسین" بنا کر ہندوستان کے طول و عرض میں پھر ایک طوفان برپا کر دیا۔ اور اکابر علمائے حق، خاص کر حضرت تھانوی کو اپنی تکفیر بازی کا خاص نشانہ بنایا۔ اس زمانہ میں ہمارا ضلع مراد آباد بریلوی فرقہ کے مشہور زعیم و رہنما مولوی نعیم الدین صاحب مراد آبادی کی وجہ سے اس فتنہ کا خاص مرکز تھا، گلی کوچے بلکہ گھر گھر اس کا چرچا تھا، میری نوعمری کا زمانہ تھا،

میں نے اس حملہ کی مدافعت اور اس فتنہ کے مقابلہ کا فیصلہ کیا اور درس و تدریس کے ساتھ اس زمانہ میں یہ بھی میرا مستقل شغل بن گیا۔ اس سلسلہ میں قلم سے بھی کام لینا پڑا اور زبان سے بھی۔ دوبدو مناظروں کی بھی بار بار نوبت آئی۔ (جن کی مفصل روئدادیں بھی اسی زمانہ میں چھپ کر شائع ہوئی تھیں) چونکہ وہ لوگ سب سے زیادہ حملے حضرت حکیم الامت پر کرتے تھے اس لیے قدرتی طور پر مجھے انہی کی طرف سے مدافعت اور جواب دہی زیادہ کرنی پڑتی تھی، مگر اس کا مجھے کوئی علم نہیں تھا کہ یہ جو کچھ ہو رہا ہے، خود حضرت کو بھی اس کی کوئی خبر ہے یا نہیں اگرچہ جی چاہتا تھا کہ حضرت کو اس کی اطلاع ہو، لیکن اس سلسلہ میں نہ کبھی حضرت سے خط و کتابت کی نہ اس موضوع سے متعلق اپنا کوئی رسالہ یا کسی مناظرہ کی روئداد کبھی حضرت کی خدمت میں بھیجی۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ یہ بات ہمارے حلقہ میں عام طور سے مشہور تھی کہ حضرت کو بریلویوں کی افترا پردازی کی طرف مطلق التفات نہیں ہے اور وہ ان ظالموں کے مسئلہ کو سپرد خدا کر کے اس اصول پر عامل ہیں کہ "باخدا وا رہیم کار و باخلائق کار نیست"۔

غالباً ۱۳۴۹ھ میں بریلویوں کے تمام مشہور الزامات و اعتراضات کے جواب میں راقم سطور نے ایک جامع کتاب "سیف یمانی" کے نام سے لکھی تھی جس میں حضرت تھانوی پر عائد کیے جانے والے بہت سے الزامات و اعتراضات کا جواب تھا، لیکن حضرت سے متعلق پنجاب کے کسی عقیدت مند شخص کے اس خواب کی بحث بہت مفصل تھی جس کی بنا پر بریلویوں کی طرف سے حضرت کے خلاف بہت ہی غلیظ پروپیگنڈا بڑے وسیع پیمانہ پر کیا گیا تھا اور اس کو سن کر بہت سے خالی الذہن عقیدت مند بھی اپنی ناواقفی کی وجہ سے پریشان ہو جاتے تھے۔۔۔ اللہ تعالیٰ کی خاص مدد و توفیق سے "سیف یمانی" میں یہ بحث ایسی ہو گئی تھی جو میرے

نزدیک بہت ہی تشفی بخش تھی اور اس سے مسئلہ بالکل صاف ہو جاتا تھا۔ مجھے اس بحث کے بارہ میں بڑا اطمینان تھا اور بڑی خوشی تھی کہ اللہ تعالیٰ نے مجھے اس کی توفیق دی۔

اس کتاب (سیف یمانی) کے تیار ہو جانے پر میرا جی چاہا کہ حضرت تھانوی سے کوئی تعارف نہ ہونے کے باوجود گزارش کروں کہ وہ اس بحث کو ملاحظہ فرمالیں اور اپنی رائے سے مطلع فرمائیں۔

میں نے سنا تھا کہ حضرت حکیم الامت خط کتابت میں بھی بے ضرورت طوالت اور تکلف و تصنع کو بہت ناپسند کرتے ہیں۔ چاہتے ہیں کہ جو کوئی بات کرے یا خط لکھے تو ضرورت کے مطابق مختصر الفاظ میں صاف اور سیدھی بات کہے۔ میں نے حضرت کی خدمت میں "سیف یمانی" کا ایک نسخہ ڈاک سے بھیجا اور اس کے ساتھ عریضہ بھی لکھا، جس کا مضمون تقطیعی خطاب اور تحیہ مسنونہ کے بعد یہ تھا۔

"مجھے حضرت سے تعارف کی سعادت حاصل نہیں ہے، اس لئے غالباً حضرت مجھ سے بالکل واقف نہ ہوں گے۔ میں دارالعلوم دیوبند کا چند سال پہلے کا ایک طالب علم ہوں۔ آج کل امروہہ کے مدرسہ اسلامیہ (محلہ چلہ) میں کچھ اسباق پڑھاتا ہوں۔ بریلوی جماعت نے ہمارے اکابر کے خلاف جو طوفانی فتنہ آج کل برپا کر رکھا ہے ایک ضروری دینی خدمت سمجھ کر اس کی تردید و مدافعت کا کچھ کام بھی اللہ تعالیٰ کی مدد و توفیق سے کر لیتا ہوں۔ اسی سلسلہ میں ایک کتاب "سیف یمانی" حال ہی میں لکھی ہے۔ اس کا ایک نسخہ آج ہی ڈاک سے ارسال خدمت کیا ہے۔ اگر حضرت کے اوقات و اشتغال میں گنجائش ہو اور زحمت

نہ ہو تو میرا دل چاہتا ہے کہ حضرت والا اس کتاب کو یا کم از کم اس کی صرف اس بحث کو جو حضرت ہی کے متعلق ایک صاحب کے شہور خطاب کے بارے میں کی گئی ہے اور جو کتاب کے فلاں صفحے سے فلاں صفحہ تک ہے، ملاحظہ فرمالیں اور اگر اصول کے خلاف نہ ہو اور کسی قسم کی گرانی اور زحمت نہ ہو تو حضرت اپنی رائے گرامی سے بھی مطلع فرمادیں، لیکن اگر اوقات میں گنجائش نہ ہو یا کسی وجہ سے اس کا ملاحظہ باعث زحمت ہو تو مجھے بالکل اصرار نہیں ہے۔ اور اس صورت میں بھی کتاب کی واپسی کی زحمت فرمانے کی ضرورت نہیں۔ میں نے محض ہدیہ کی نیت سے یہ کتاب حضرت کی خدمت میں بھیجی ہے۔ اگر قبول فرمالی جائے تو میرے لیے باعث منت و سعادت ہوگا ورنہ کسی کو بھی عنایت فرمادی جائے۔"

حضرت حکیم الامت کی خدمت میں یہ میرا سب سے پہلا عریضہ تھا۔ میں نے جواب کے لیے لفافہ ٹکٹ لگا کر رکھ دیا تھا۔ چوتھے یا پانچویں دن حضرت کا جواب آیا۔ اپنے عام اصول و معمول کے مطابق میرے اس خط ہی پر جواب تحریر فرمایا تھا۔ اس جواب کے جو قابل ذکر اجزاء یاد رہ گئے ہیں وہ یہ تھے۔

"آپ کا خط پڑھ کے اس بات سے بڑی خوشی ہوئی کہ آپ نے بغیر کسی تکلف کے اپنی بات صاف سیدھے انداز میں لکھ دی اور میرے اوقات اور اصول و مزاج کی بھی پوری رعایت کی۔ اس پر دل سے دعا نکلی۔

میں آپ سے ناواقف نہیں ہوں۔ آپ کا اور آپ کے کاموں کا ذکر سنتا رہا ہوں۔ اس لیے آپ سے غائبانہ محبت و تعلق ہے اور دعا کرتا ہوں۔

آپ کی تطییب خاطر کے لیے لکھتا ہوں کہ میں نے آپ کے ہدیہ کو دل سے قبول کیا، کتاب کو اس ارادہ سے کھولا کہ جستہ جستہ اس کے نقل والوں کا اور خواب والی جس بحث کے لیے آپ نے خاص طور لکھا تھا اس کو پورا پڑھوں گا۔ لیکن جب کتاب پڑھنی شروع کی تو اس کے کسی حصے کو بھی چھوڑنے کو جی نہ چاہا اور جب تک پوری کتاب ختم نہ کرلی، اپنے مقررہ معمولی کاموں کے سوا کوئی دوسرا کام درمیان میں نہیں کیا۔ پوری کتاب سے جی بہت ہی خوش ہوا جزاکم اللہ تعالیٰ۔

خواب والی بحث کو خاص طور سے غور سے پڑھا۔ بے تکلف لکھتا ہوں کہ اگر میں خود کوشش کرتا تو مسئلہ کی ایسی اطمینان بخش وضاحت نہ کرسکتا۔ بارک اللہ تعالیٰ فی عمرکم وعملکم۔

حضرت نے اپنے معمول کے مطابق یہ جواب میرے عریضہ ہی پر لکھا تھا، افسوس ہے کہ وہ خط محفوظ نہیں رہا لیکن اپنے عریضہ کا مضمون اور حضرت کے جواب کے یہ اجزاء اچھی طرح یاد ہیں اور حافظہ کی مدد ہی سے یہاں لکھے ہیں۔ اس کے علاوہ حضرت نے اس کے "سیف یمانی" پر مختصر تقریظ بھی تحریر فرمائی جو اس کے ساتھ اسی وقت چھپ گئی تھی۔

جیسا کہ عرض کیا، حضرت حکیم الامت قدس سرہ کے ساتھ خط و کتابت کا یہ پہلا رابطہ تھا۔

پہلی حاضری: غالباً ۱۳۵۰ھ (۱۹۳۱ء) میں بریلویوں کے ایک مشہور و بدنام، نہایت بدزبان اور فتنہ پرداز مقرر و مناظر رنگون (برما) پہنچے۔ (برما اس وقت ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا، کی

وجہ سے وہاں سخت فتنہ برپا ہوگیا۔ ہمارے اکابر سے تعلق رکھنے والے وہاں کے احباب مخلصین نے مجھے خطوط لکھے اور تار پہ تار دیئے۔ میں رنگون پہنچا بریلوی مقرر صاحب کی فتنہ پردازی کے نتیجہ میں وہاں اُن کے ایک جلسہ میں بلوہ اور فساد بھی ہوگیا اور معاملہ عدالت میں چلا گیا۔ وہاں کے دوستوں نے اصرار کیا کہ جب تک یہ قضیہ ختم نہ ہوجائے، تم یہاں سے نہ جاؤ۔ میرے لیے طویل قیام بہت مشکل تھا۔ وہاں کے ہماری جماعت کے بعض حضرات نے جو حضرت حکیم الامۃ سے خاص نیازمندانہ تعلق رکھتے تھے، حضرت کی خدمت میں لکھا کہ حضرت والا اپنی طرف سے مجھے (محمد منظور نعمانی کو) تحریر فرمادیں کہ جب تک یہاں رنگون میں ضرورت ہو، وہ اس وقت تک یہاں قیام کرے حضرت نے اس بارے میں مجھے براہ راست تو کچھ تحریر نہیں فرمایا لیکن اپنے سے خاص تعلق رکھنے والے ایک بزرگ عالم کو تحریر فرمایا کہ وہ مجھے حضرت کا یہ پیام پہنچا دیں کہ رنگون کے مخلص احباب اس قضیے کے ختم ہونے تک وہاں آپ کا قیام ضروری سمجھتے ہیں۔ اور وہ بے چارے ہمدردی اور رعایت کے مستحق ہیں۔ پس اگر اس میں آپ کا کوئی خاص حرج نہ ہو اور واپسی کی کوئی خاص ضرورت نہ ہو تو میں بھی اس کی سفارش کرتا ہوں۔

حضرت کا یہ پیام ملنے کے بعد میں نے قیام کا ارادہ کرلیا۔ اور غالباً حضرت کو بھی لکھ دیا اور پھر کئی مہینے رنگون میں رہنا پڑا۔

رنگون کے اس قیام کے زمانہ میں ارادہ کرلیا تھا اور غالباً حضرت کو لکھ بھی دیا تھا کہ یہاں سے واپسی پر انشاء اللہ تھانہ بھون حاضر ہوں گا۔ چنانچہ کئی مہینے کے بعد جب واپسی ہوئی تو تھانہ بھون حاضر ہوا۔ حضرت حکیم الامت کی خدمت میں یہ پہلی حاضری تھی، صرف ایک دو دن قیام کیا

حضرت نے بڑی عنایتیں فرمائیں ـــــ اب تک حضرت کے بارے میں جو کچھ سنا تھا، اس سے کچھ ایسا خیال قائم ہوگیا تھا کہ حضرت کے یہاں بڑی سختی ہے۔ بات بات پر داروگیر ہوتی ہے لیکن مشاہدہ اور تجربہ سے معلوم ہوا کہ یہ بات بہت ہی غلط ہے۔ ہاں! یہ ضرور محسوس ہوا کہ لوگوں کی بے وقوفیوں اور بے اصولیوں سے اور تصنع اور بناوٹ سے (جس کا عام رواج ہوگیا ہے) حضرت کو سخت اذیت اور ناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے لوگوں پر ڈانٹ بھی پڑجاتی ہے۔

دوسری حاضری اور ایک غیر معمولی واقعہ

میری تعلیم دارالعلوم دیوبند کی تھی اور اس سے پہلے جن دوسرے مدارس میں پڑھا تھا، ان کے اساتذہ بھی دارالعلوم ہی کے فیض یافتہ تھے، اسی وجہ سے میرا سیاسی ذہن وہی تھا جو حضرت شیخ الہند رحمۃ اللہ علیہ کے اثر سے اور پھر خلافت کی تحریک سے جماعت دیوبند کا بن گیا تھا، اسی بنا پر شروع ہی سے "جمعیۃ العلماء" سے تعلق رہا۔ اگرچہ جمعیۃ کی سیاسی سرگرمیوں میں میرا کوئی قابل ذکر عملی حصہ کبھی نہیں رہا، لیکن جس زمانہ کی میں اس وقت بات کر رہا ہوں اس زمانہ میں میرا ذہنی اور فکری تعلق جمعیۃ سے خاصا گہرا تھا۔ اس کے صدر حضرت مفتی کفایت اللہ صاحبؒ اور ناظم (آج کی زبان میں جنرل سکریٹری) حضرت مولانا احمد سعید صاحب خاص عنایت و شفقت کا معاملہ فرماتے تھے۔ الفرقان اس زمانہ میں چونکہ دہلی میں چھپتا تھا، اس لیے ہر مہینہ چار پانچ دن کے لیے مجھے وہاں جانا پڑتا تھا اور وہاں قیام زیادہ تر جمعیۃ العلماء کے دفتر میں اور کبھی جامع مسجد کے قریب حضرت مفتی صاحب رحمۃ اللہ علیہ کے کتب خانہ رحیمیہ کی بالائی منزل پر ہوتا تھا، اس وجہ سے ان بزرگوں کی خدمت میں حاضری اور گفتگوؤں کا بہت موقع ملتا تھا۔

اپنے بزرگوں کے سامنے بھی بولنے کی اور اگر رائے میں اختلاف ہو تو دفعاً سے اس کو بھی عرض کر دینے کی، بُری یا اچھی، میری عادت شروع سے رہی ہے۔ حضرت مفتی صاحبؒ غالباً اس کی قدر فرماتے تھے۔ اور اگرچہ میں مرکزی جمعیۃ کی عاملہ کا رکن بھی نہیں رہا مگر اس کے اہم جلسوں میں بھی حضرت مفتی صاحبؒ اکثر طلب فرما لیتے تھے۔ جمعیۃ کے اس وقت کے نظام میں تیسری اہم شخصیت حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ (نائب امیر شریعت بہار) کی تھی، جمعیۃ کے کام ہی کے سلسلہ میں مہینوں ان کا قیام دہلی جمعیۃ کے دفتر ہی میں رہتا تھا۔ اس کی وجہ سے ان سے باتیں کرنے کا بہت موقع ملتا تھا۔ میں ان کے علمی رسوخ اور فقیرانہ زندگی سے بہت متاثر تھا۔ اور خاص کر ہندوستان کے مسلمانوں کے مسائل سے متعلق ان کی سیاسی بصیرت کا بہت قائل اور معتقد تھا۔

انڈیا ایکٹ ۱۹۳۵ء کی بنیاد پر ۱۹۳۷ء میں جنرل الیکشن ہو چکا تھا اور اس کے نتیجہ میں صوبوں میں عوامی حکومتیں قائم ہو چکی تھیں جن میں سے سات صوبوں میں کانگریسی حکومتیں تھیں، جنھوں نے اس شرط کے ساتھ حکومت قبول کی تھی کہ گورنر ان کے کاموں میں دخل نہیں دے گا (اور ان صوبوں کے گورنروں نے یہی رویہ اختیار کر لیا تھا) اُس وقت یہ بات کھل کر سامنے آگئی تھی کہ ہندوستان جلدی ہی کامل آزادی حاصل کرے گا۔ اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہوگی یعنی عوام کے منتخب نمائندوں کی پارلیمنٹ اقتدار کی مالک ہوگی۔

اور یہ بات بھی بالکل ظاہر تھی کہ وہ حکومت کانگریس ہی کی ہوگی (آج کانگریس کے علاوہ جو سیاسی پارٹیاں کسی قدر نمایاں ہیں اُن کا اُس وقت وجود ہی نہیں تھا۔)

شروع سے جمعیۃ العلماء کے سامنے سب سے اہم مقصد یہ رہا تھا کہ آزاد ہندوستان میں شرعی نصب العین کے مطابق مسلمانوں کے لیے نظام شرعی قائم ہو سکے۔ آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ جمعیۃ کی شرکت کا یہ ایک خاص محرک تھا لیکن یہ شرکت یا جمعیۃ کے بہت سے ارکان کا مقامی کانگریس کمیٹیوں کا ممبر بن جانا کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہونے کے لیے کافی نہیں تھا ___ اس حقیقت کو سامنے رکھ کر حضرت مولانا محمد سجادؒ نے ایک اسکیم تیار کی اس کا حاصل اور خلاصہ جو اب یاد رہ گیا ہے یہ تھا کہ جمعیۃ العلماء مسلمانوں کی ایک عوامی جماعت قائم کرے جس کے نظام میں جمعیۃ کو مؤثر دخل ہو (غالباً اس کا نام "نظام ملت" تجویز کیا گیا تھا) کانگریس کی طرح اس کی ممبری کی فیس ہو۔ اور بہت ہلکی بس برائے نام ہو ہر عاقل بالغ مسلمان کو اس کا ممبر بنانے کی کوشش کی جائے اور یہ شرط ہو کہ جو آدمی اس کا ممبر بنے، وہ لازمی طور پر کانگریس کا بھی ممبر بنے اس طرح مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کو کانگریس کے نظام میں شریک کیا جائے اور ان سب کا رابطہ "نظام ملت" کے واسطے سے جمعیۃ العلماء سے بھی رہے۔ خیال تھا کہ اس راستے سے جمعیۃ العلماء کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں پر اثر انداز ہو سکے گی (یہ ملحوظ رہے کہ جمعیۃ العلماء اس وقت نہ عوامی جماعت تھی اور نہ انتخابی، اس کے نام اور عنوان کے مطابق عموماً علمائے کرام ہی اس کے ارکان ہوتے تھے)

حضرت مولانا محمد سجادؒ کا خیال تھا کہ اس طرح کی کسی تدبیر اور کوشش کے بغیر آزاد ہندوستان میں ہم اپنے وہ مذہبی و ملی مقاصد حاصل نہیں کر سکیں گے۔ جن کے لیے اور جن کی امید پر ہم نے اور ہمارے بزرگوں نے

قربانیاں دی ہیں اور دے رہے ہیں۔ مولانا موصوف نے یہ اسکیم بڑی تفصیل کے ساتھ مرتب کی تھی اور ابھی اس پر وہ خود اور حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب اور مولانا احمد سعید صاحبؒ غور فرما رہے تھے (یہ ۱۹۴۲ء کا ذکر ہے) ان ہی دنوں میرا دہلی جانا ہوا۔ حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے پہلے زبانی اپنے اس خیال کا ذکر فرمایا، پھر بتلایا کہ انھوں نے اس کا پورا خاکہ تحریری شکل میں بھی مرتب کر لیا ہے۔ میرے عرض کرنے پر وہ مجھے مطالعہ کے لیے عنایت بھی فرما دیا میں نے اس کو بہت غور سے پڑھا اور میرے دل نے اس کو پوری طرح سے قبول کر لیا۔ ساتھ ہی شدت کے ساتھ دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ اس اسکیم کو بروئے کار لانے کے لیے جو کچھ کیا جا سکتا ہو وہ سب کیا جائے ——— میں نے سوچا کہ سب سے پہلے یہ کوشش کرنی چاہیے کہ اپنی جماعت کے وہ اکابر بھی اس سے اتفاق کر لیں جو جمعیۃ العلماء اور اس کی سیاسی طرز کی سرگرمیوں سے کوئی تعلق نہیں رکھتے ہیں بلکہ ان کو ایک گونہ بُعد یا اختلاف رہا ہے۔ ان اکابر میں میری نظر میں سب سے اہم اور باعظمت شخصیت حکیم الامۃ حضرت تھانوی قدس سرہ علیہ کی تھی۔ میں نے طے کر لیا کہ تھانہ بھون حاضر ہو کر حضرت کی خدمت میں اس مسئلہ کو رکھوں۔ جمعیۃ العلماء کے طریق فکر اور طرز کار سے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کا ذہنی اور ذوقی اختلاف مجھے اچھی طرح معلوم تھا اور اس کی وجہ سے امید کی کچھ زیادہ گنجائش نہیں تھی، لیکن حضرت کے اخلاص، للٰہیت اور فہم و فراست کی بنا پر یہ یقین تھا کہ اگر تفصیل کے ساتھ حضرت کے سامنے پورے مسئلہ کو رکھا جا سکا تو اس پر غور ضرور فرمائیں گے اور اگر ذہن نے قبول کر لیا تو ان شاء اللہ اتفاق بلکہ کھلی تائید و حمایت پر بھی آمادہ ہو جائیں گے۔

میں نے اپنے اس خیال یا خیال کا کسی سے ذکر بھی نہیں کیا، اور اگلے دن

صبح کو جیرت کے دفتر سے سیالشاہ رہ آیا اور وہاں سے تھانہ بھون روانہ ہوگیا۔ ٹرین میں بیٹھ کر راستے میں حضرت سے گفتگو کرنے کے لیے ایک مفصل نوٹ تیار کیا تاکہ وقت پر کوئی ضروری بات رہ نہ جائے۔

غالباً ظہر کی نماز کے بعد حضرت سے ملاقات ہوئی۔ حسب معمول شفقت و عنایت کے ساتھ مصافحہ فرمایا، خیریت دریافت کی، اور فرمایا کہ "کیا اس وقت کسی خاص ضرورت سے آنا ہوا؟" میں نے عرض کیا کہ ایک خاص معاملے کے بارے میں حضرت سے کچھ عرض کرنا ہے۔ فرمایا "کیا اسی وقت؟" میں نے عرض کیا نہیں، میں قیام کروں گا۔ آج یا کل جس وقت حضرت کو فرصت و فراغت ہو ۔۔۔ فرمایا کہ "پھر آج ہی انشاء اللہ مغرب کے بعد"۔

یہ حضرت کی مجلس کا وقت تھا، شعبان کی غالباً ۲۰ تاریخ تھی، ہمارے عربی مدارس میں تعلیم و تدریس کا کام عام طور سے شعبان سے پہلے ہی ختم ہو جاتا ہے اس لیے حضرت سے بیعت اور اصلاح و تربیت کا تعلق رکھنے والے بعض مدارس کے اساتذہ بھی آئے ہوئے تھے اور مجلس میں شریک تھے۔ (جن میں سے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری رحمۃ اللہ علیہ خاص طور سے یاد ہیں) حضرت نے مجھے اپنے برابر میں بیٹھنے کا حکم فرمایا، میں تعمیل حکم میں بیٹھ گیا، لیکن جیسا کہ چاہئے تھا، ادب سے بیٹھا، ارشاد فرمایا بے تکلف ہو کر آرام سے بیٹھئے! اس سے مجھے انشراح ہوگا، میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی ۔۔۔ پھر مجلس کے پورے وقت میں حضرت کا خاص التفات رہا۔ (اور اس کے علاوہ بھی جب کبھی حاضری ہوئی حضرت کا یہی طرز عمل رہا، لیکن الحمد للہ کبھی بھی حضرت کے اس رویہ کی وجہ سے اپنے بارے میں کوئی غلط فہمی نہیں ہوئی، اُس وقت بھی یہی احساس تھا اور آج بھی یقین ہے کہ یہ کار حضرت کے

ادنیٰ خادموں کی صف میں بیٹھنے کے لائق بھی نہیں تھا)

مغرب کی نماز کے بعد خانقاہ کی مسجد ہی کے ایک کونے چٹائی پر حضرت بیٹھ گئے، وہیں مجھے یاد فرمایا، میں حاضر ہوگیا ـــــ سب سے پہلے میں نے عرض کیا کہ میں اس وقت جو کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں اس کے بارے میں خود مجھے شبہ ہے کہ شاید حضرت اس کو پسند نہ فرمائیں، لیکن بہت غور کرنے کے بعد میں نے اپنے لیے یہ ضروری سمجھا ہے کہ حضرت کی خدمت میں اس کو عرض کردوں، حضرت نے بڑی عنایت و شفقت کے ساتھ فرمایا کہ آپ پوری بے تکلفی کے ساتھ اپنی بات کہیں، میں بالکل خالی الذہن ہوکر سنوں گا اور غور کروں گا۔

میں نے جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر وہ سب باتیں میں نے نمبروار نوٹ کرلی تھیں جو مجھے حضرت کے سامنے عرض کرنی تھیں ـــــ حضرت نے اس پر خوشی اور تحسین کا اظہار فرمایا کہ میں نے گفتگو کے لیے اہتمام سے تحریری یادداشت مرتب کرلی ہے۔ اس کے بعد میں نے اپنی بات شروع کی، جس کا سلسلہ قریباً ایک گھنٹہ تک جاری رہا۔ حضرت نہایت توجہ کے ساتھ سنتے رہے درمیان میں کبھی کبھی یہ فرمادیتے کہ "اس بات کو ذرا پھر سے کہہ دیجئے" ـــــ میں دوبارہ عرض کردیتا ـــــ میں نے جو کچھ عرض کیا تھا وہ سب تو اب محفوظ نہیں لیکن اس کے اہم اجزاء جہاں تک یاد ہے یہ تھے۔

(الف) انڈیا ایکٹ سنہ ۳۵ء[1] کی کچھ وضاحت اور یہ کہ اس کے ذریعہ حکومتی اختیارات کا کتنا بڑا حصہ ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آگیا ہے اور کتنا

---

[1] انڈیا ایکٹ سنہ ۳۵ء کا اردو ترجمہ جو ایک ضخیم کتاب کی شکل میں چھپ چکا تھا اس کو میں دیکھ چکا تھا۔

حکومت برطانیہ نے اپنے ہاتھ میں رکھا ہے۔

(ب) اب یہ بات یقینی نظر آتی ہے کہ جلدی ہی انگریزی اقتدار کلی طور پر ختم ہوجائے گا اور سارے اختیارات ہندوستانیوں کے ہاتھ میں آجائیں گے اور یہاں قومی جمہوری حکومت ہوگی۔ جس طرح اس وقت صوبوں میں جمہوری حکومتیں قائم ہیں۔

(ج) یہ بھی ظاہر ہے کہ الکشن کے ذریعہ یہاں حکومت کانگریس ہی کی قائم ہوگی اور سارے اختیارات اس کے ہاتھ میں ہوں گے۔

(د) آزاد ہندوستان میں مسلمانوں کے لیے ہم جو کچھ چاہتے ان میں خصوصیت سے اُن کے لیے اپنے نظام شرعی کے قیام کا حق۔ اس کا ظاہر اس کے سوا کوئی راستہ نہیں ہے کہ کانگریس کے فیصلوں اور پالیسیوں میں دینی مزاج کے مسلمانوں کا بھی عمل دخل ہو۔

(ہ) اس کے بعد میں نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کی تجویز اور اسکیم کا کسی قدر تفصیل سے ذکر کیا اور عرض کیا کہ یہ اسی صورت میں کامیاب ہوسکتی ہے جب اس کو ہمارے دینی حلقوں کی زیادہ سے زیادہ تائید و حمایت حاصل ہو اور ہم سب اس کے لیے کوشش اور محنت کریں جو کانگریسی مسلمان دینی ذہن کے نہیں ہیں وہ تو اس کی مخالفت کریں گے۔

آخر میں میں نے عرض کیا کہ حضرت اس مسئلہ پر غور فرمائیں اور اگر حضرت کی رائے اس سے متفق ہو اور اس بارے میں شرح صدر ہوجائے کہ یہ کوشش اسلام اور مسلمانوں کے لیے ان شاء اللہ مفید ہوگی تو پھر حضرت اس کی تائید فرمادیں۔ پھر ان شاء اللہ مخلص اور دیندار مسلمانوں کی بہت بڑی تعداد کا تعاون حاصل ہوجائے گا اور اس وسیع پیمانے پر کام ہوسکے گا جس کی ضرورت ہے۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں، میری یہ گفتگو بہت طویل اور مفصل تھی۔ اس کے یہ چند اجزاء اور الفاظ تھے جو یاد رہ گئے ہیں۔

جب میں نے اپنی بات ختم کی اور عرض کیا کہ جو مجھے عرض کرنا تھا وہ میں عرض کر چکا، تو حضرت نے فرمایا۔ "میں نے آپ کی بات اور مقصد کو سمجھنے کی پوری کوشش کی ہے۔ اللہ تعالیٰ آپ کو جزائے خیر دے، مجھے اس وقت بہت سی ایسی باتیں معلوم ہوئیں جن کا معلوم ہونا ضروری تھا۔ میرا طریقہ یہ ہے کہ میں جلدی رائے قائم نہیں کرتا ہوں۔ پہلے خود اچھی طرح غور کرتا ہوں، پھر ضرورت سمجھتا ہوں تو ان دوستوں سے مشورہ بھی کرتا ہوں جن کو مخلص اور صاحب رائے سمجھتا ہوں، اس لیے اپنی رائے تو اس وقت ظاہر کر سکوں گا جب قائم ہو جائے گی، لیکن میرا حال اس وقت یہ ہے کہ آپ کی بات نے میرے دل کو بہت متاثر کیا ہے اور میرا جی چاہتا ہے کہ اس سے پوری طرح اتفاق کر لوں، لیکن میں غور کر کے رائے قائم کروں گا اور ان شاء اللہ کل صبح بتلاؤں گا کہ میری رائے کیا قائم ہوئی"۔

اگلے دن صبح فجر کی نماز کے بعد حضرت نے مسجد ہی میں مجھ سے فرمایا۔ "میں نے غور کیا، میری وہی رائے ہے جو میں نے رات ظاہر کی تھی، اب میں یہاں کے اپنے خاص احباب سے مشورہ کروں گا لیکن اس کی صورت یہ ہوگی کہ آپ نے جس طرح میرے سامنے پوری تفصیل سے بات رکھی تھی، اسی طرح ان کے سامنے بھی آپ رکھیں، میں ان کو اطلاع دوں گا کہ وہ آٹھ بجے یہاں خانقاہ ہی آ جائیں۔

وہ حضرات آٹھ بجے جمع ہو گئے۔ ان میں ایک حضرت مولانا ظفر احمد صاحب تھانوی تھے۔ دوسرے مولانا مفتی عبدالکریم صاحب گمتھلوی مرحوم تھے، جو

حضرت حکیم الامت کے ممتاز اصحاب علم خلفاء میں سے تھے، تیسرے صوبہ بہار کے ایک عالم تھے جو اس زمانہ میں خانقاہ کے مدرسہ میں غالباً صدر مدرس تھے (ان کا نام اب یاد نہیں) ان کے علاوہ حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری بھی تھے۔ غالباً صرف یہی چار حضرات تھے ــــ حضرت حکیم الامت نے ان حضرات سے مخاطب ہو کر میرا نام لے کر ارشاد فرمایا کہ رات انھوں نے ایک بہت اہم مسئلہ پر مجھ سے بات کی، میں نے آپ حضرات کو اس وقت اس لیے جمع کیا ہے کہ آپ بھی اس کو سنیں، اس پر غور کریں اور مشورہ دیں ــــ اس کے بعد میری طرف مخاطب ہو کر ارشاد فرمایا کہ جو بات آپ نے جس طرح تفصیل کے ساتھ مجھ سے کہی تھی اسی طرح ان حضرات کے سامنے بھی آپ وہ بات رکھیں۔

میں نے اس مجلس میں بھی پوری تفصیل اور وضاحت کے ساتھ مسئلہ کو رکھا۔ جب میں اپنی بات پوری کر چکا تو حضرت نے ان حضرات سے فرمایا کہ اب آپ حضرات اس مسئلہ میں اپنی اپنی رائے ظاہر فرمائیں ــــ یہ سب حضرات خاموش رہے، کچھ دیر کے بعد حضرت نے دوبارہ یہی فرمایا، اس پر بھی کسی نے بھی کوئی رائے ظاہر نہیں کی اور خاموشی ہی رہی، تو حضرت نے فرمایا کہ میں نے رات سے اب تک اس مسئلہ پر جو کچھ غور کیا ہے اس کی بنا پر میرا رجحان تو یہ ہے کہ مولانا نے (یعنی راقم سطور محمد منظور نعمانی نے) جو بات ہمارے سامنے رکھی ہے وہ صحیح ہے اور ہمیں اسے قبول کر لینا چاہیے! یہ خیال ہمارے لیے مانع نہیں ہونا چاہیے کہ تحریکات کے بارے میں اب تک ہمارا جو طریقہ اور مسلک رہا ہے یہ اس کے خلاف ہے۔ ہماری اب تک جو رائے رہی اور ہم نے جو کچھ کیا، حق سمجھ کر کیا اور اللہ کے لیے کیا۔ اور اب اگر یہ رائے قائم ہو جائے کہ یہ دوسرا طریقہ جمعیۃ علماء والے حضرات کا صحیح ہے اور اس سے اسلام اور مسلمانوں کے حق میں خیر کی

امید ہے تو اس کو بھی ہم الشوریٰ کے لیے اختیار کریں گے"۔ اس کے بعد ارشاد فرمایا۔ "اگر اس رائے کے بارے میں اطمینان اور شرحِ صدر ہو جائے تو پھر میں اپنی ذات سے اس کے لیے تیار ہوں کہ جمعیۃ العلماء میں شامل ہو جاؤں اور کانگریس کا بھی ممبر بن جاؤں"۔

حضرت کی زبان سے یہ آخری بات سن کر میں حیران رہ گیا، اس حد تک تو میرا وہم و خیال بھی نہیں جا سکتا تھا۔ میں تو زیادہ سے زیادہ بس تائید اور حمایت ہی کی توقع کر سکتا تھا، میری طرح اور سب حاضرین کو بھی حضرت کی یہ بات سن کر حیرت ہوئی ہوگی، لیکن اس مرحلہ پر بھی کسی نے اختلافِ رائے کا اظہار نہیں کیا۔

حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری نے اصولی طور پر حضرت کی رائے سے اتفاق ظاہر کرتے ہوئے عرض کیا کہ میری گزارش یہ ہے کہ حضرت اپنی ذات کے بارے میں تو ابھی کوئی اقدام اور اعلان نہ فرمائیں، بس زیادہ سے زیادہ تائید فرما دیں لیکن اپنے خاص معتمد چند حضرات کو ارشاد فرما دیں کہ وہ شامل ہو جائیں اور دو یا تین مہینے کی مدت مقرر کر دی جائے، اس مدت میں وہ جمعیۃ العلماء کے حضرات کے ساتھ کام کر کے حضرت کی خدمت میں اپنا تجربہ اور اپنی رائے عرض کریں، اس کے بعد اپنی ذات کے بارے میں حضرت کوئی فیصلہ فرمائیں۔

میں نے حضرت مولانا جالندھری کی اس رائے کی تائید کی۔ حضرت نے بھی اس کو پسند فرمایا اور اس حد تک بات اس مجلس میں گویا طے پا گئی۔

اس کے بعد حضرت نے فرمایا کہ اب اس کی ضرورت ہے کہ خود جمعیۃ العلماء کے حضرات سے بھی گفتگو ہو۔ میں نے عرض کیا کہ حضرت ارشاد فرمائیں تو میں وہاں چلا جاؤں اور ان حضرات سے عرض کروں، انشاء اللہ وہ ضرور تشریف

لے آئیں گے، چنانچہ پیر کا دہلی جانا طے ہوگیا۔ مجھے حضرت نے ایک رقم بھی عنایت فرمائی۔ یہ میرے اور اُن اکابر جمعیت کے کرایہ کے لیے تھی۔

پھر حضرت نے فرمایا کہ یہ بہتر ہوگا کہ دیوبند اور سہارنپور کے حضرات بھی اس مشورہ میں شریک ہوں چنانچہ طے ہوگیا کہ فلاں صاحب حضرت کا خط لے کر سہارنپور اور دیوبند جائیں گے۔

صرف ایک دن درمیان میں چھوڑ کے دوسرے دن صبح کا وقت اس مشاورت کے لیے مقرر کیا گیا۔

میں اسی دن دہلی روانہ ہوگیا، سب سے پہلے جمعیت کے دفتر پہنچا، وہاں مولانا سجاد صاحب تشریف فرما تھے، ان کو تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روئداد سنائی اور عرض کیا کہ آپ کو حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا احمد سعید صاحب کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے۔ میں اسی لیے آیا ہوں۔

مولانا کو یہ سن کر کہ حضرت تھانوی اس حد تک آمادہ ہو گئے ہیں، بڑی حیرت ہوئی اور مولانا اسی وقت مجھے اپنے ساتھ لیے "کوچہ چیلاں" حضرت مفتی صاحب کے ہاں پہنچے، وہاں بھی میں نے پوری تفصیل سے تھانہ بھون کے اپنے سفر کی روئداد سنائی، حضرت مفتی صاحب نے بھی بڑی حیرت و استعجاب کا اظہار فرمایا۔ میں نے عرض کیا کہ آج ہی شام کو آپ حضرات کو تھانہ بھون تشریف لے چلنا ہے، کل صبح آٹھ بجے کا وقت گفتگو کے لیے مقرر ہے، سہارنپور اور دیوبند کے حضرات کو بھی بلایا گیا ہے۔

حضرت مفتی صاحب اور ان کے ساتھ ہم دونوں (راقم سطور اور حضرت مولانا محمد سجاد) مولانا احمد سعید صاحب کے مکان پہنچے جو وہیں کوچہ چیلاں میں قریب ہی تھا، وہ اُس وقت نگینہ کے سفر کے لیے تیار ہو کر گھر سے نکلنے ہی والے تھے

حضرت مفتی صاحب نے ان سے میرے تھانہ بھون کے سفر کا مختصر طور پر تذکرہ کر کے فرمایا کہ آج ہی شام کو ہم تینوں کو (یعنی حضرت مفتی صاحب، مولانا سجاد صاحب اور مولانا احمد سعید صاحب کو) تھانہ بھون کے لیے روانہ ہونا ہے۔ مولانا احمد سعید صاحب نے فرمایا کہ میں تو اسی وقت نگینہ جا رہا ہوں، حافظ ابراہیم صاحب کے الکشن[1] کے سلسلہ میں مجھے دو تین جگہ جانا ہے، مولوی حفظ الرحمٰن کے دو تار آ چکے ہیں، الکشن کا بالکل آخری وقت ہے، اس لیے میرے لیے اس وقت تھانہ بھون چلنے کا کوئی امکان نہیں ہے۔ بس آپ دونوں حضرات تشریف لے جائیں۔ حضرت مفتی صاحب نے اس کے بعد بھی فرمایا کہ میری رائے میں تو تھانہ بھون کا سفر مقدم ہے لیکن مولانا احمد سعید صاحب نے پھر مولانا حفظ الرحمٰن صاحب کے تار کا حوالہ دے کر معذرت کی اور اُسی وقت اسٹیشن کے لیے روانہ ہو گئے ــــ پھر اسی دن شام کو حضرت مفتی صاحب، مولانا محمد سجاد صاحب اور یہ عاجز شاہدرہ سہارنپور اسٹیشن سے تھانہ بھون کے لیے روانہ ہو گئے۔ وہاں ٹرین رات کو پہنچتی تھی حضرت تھانویؒ نے میرے وہاں سے چلتے وقت یہ فرما دیا تھا کہ اُن حضرات کو اس میں راحت رہے گی کہ قیام مولوی شبیر علی صاحب کے مکان پر رہے۔ یہ حضرات بستر وغیرہ ساتھ لانے کی زحمت نہ اٹھائیں ــــ ہم لوگ اسٹیشن پر اترے، خانقاہ کے خادم خلیفہ اعجاز صاحب ہاتھ میں لالٹین لیے موجود تھے۔ اُن کے ساتھ ایک دو آدمی اور بھی تھے۔ اسٹیشن سے راستہ پیدل ہی کا تھا، خلیفہ صاحب کی رہنمائی میں ہم پیدل

---

[1] یہ حافظ ابراہیم مرحوم کا وہ الکشن تھا جو انھوں نے ۱۹۳۷ء میں یوپی کی کانگریس حکومت میں وزارت قبول کرنے کے بعد مسلم لیگ کے مطالبہ اور چیلنج پر اسمبلی کی ممبری سے استعفا دینے کے بعد دوبارہ لڑا تھا اور جس میں بھی کامیابی حاصل کر لی تھی۔ مولانا احمد سعید صاحب اسی الکشن کے سلسلہ میں نگینہ جا رہے تھے۔

مولانا شبیر علی صاحب کے مکان پر پہنچے، وہاں بستر لگے ہوئے تھے، خاصا کھانے کا بھی بندوبست تھا لیکن ہم سب فارغ ہو چکے تھے اس لیے معذرت کردی اور سو گئے صبح فجر کی نماز کے لیے خانقاہ پہنچے، حسب معمول حضرت تھانویؒ نے خود نماز پڑھائی نماز سے فارغ ہو کر ملاقات ہوئی۔ حضرت مفتی صاحب اور مولانا سجاد صاحب سے حضرت نے مصافحہ بھی فرمایا، مزاج پرسی ہوئی، حضرت نے فرمایا کہ آپ حضرات کی راحت کے لیے میں نے مولوی شبیر علی صاحب کا مکان قیام کے لیے تجویز کیا ہے۔ اس مکان میں راحت کے انتظامات زیادہ ہیں۔

چائے ناشتہ بھی مولانا شبیر علی صاحب ہی کے یہاں ہونا تھا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، مجلس اور گفتگو کے لیے آٹھ بجے کا وقت مقرر تھا، ہم لوگ کچھ پہلے خانقاہ پہنچ گئے۔ حضرت تشریف لا چکے تھے، سہارنپور سے حضرت مولانا حافظ عبداللطیف صاحبؒ، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا صاحب، حضرت مولانا اسعد اللہ صاحب بھی تشریف لے آئے تھے، وہیں ملاقات ہوئی۔ حضرت مولانا ظفر احمد صاحب، مولانا مفتی عبدالکریم صاحب اور حضرت مولانا خیر محمد صاحب بھی موجود تھے۔

مجلس کا آغاز ہوا۔ حضرت نے مجھ سے ارشاد فرمایا کہ اس وقت ہم سب کے یہاں جمع ہونے کا آپ ہی باعث ہوئے ہیں، اس کا جو مقصد ہے اور جس مسئلہ پر غور کرنا ہے آپ ہی اس کو ان سب حضرات کے سامنے رکھیں۔

میں نے بات شروع کی اور تمہید کے طور پر اپنے تھانہ بھون حاضر ہونے اور حضرت کی خدمت میں اپنا ایک خاص خیال عرض کرنے کا اجمالی تذکرہ کیا اور بتلایا کہ آخر میں یہ مناسب سمجھا گیا کہ اس مسئلہ کو آپ سب حضرات کے سامنے رکھا جائے اور سب حضرات غور فرمائیں ـــــ اس کے بعد میں نے اپنی جیب سے وہ کاغذ نکالا جس پر میں نے موضوع سے متعلق نمبروار نوٹ لکھ لیے تھے اور پھر

جس تفصیل سے میں نے پہلے دن حضرت کی خدمت میں اور دوسرے دن خانقاہ کی خصوصی مجلس میں اپنے خیالات عرض کئے تھے۔ اسی تفصیل و وضاحت سے اس تیسری مجلس میں بھی اپنے خیالات پیش کیے۔

میں بات ختم کر چکا تو مولانا ظفر احمد صاحب نے گفتگو شروع فرمائی۔ اور آزادی کی جنگ میں کانگریس کے ساتھ اشتراک سے فقہی بنیاد پر اپنا اختلاف ظاہر کیا، جہاں تک یاد ہے۔ مولانا کی تقریر کا حاصل یہ تھا کہ فقہ حنفی کی کتابوں میں یہ مسئلہ مصرح ہے کہ اگر دو فریقوں میں جنگ ہو اور مسلمانوں کو یہ امید ہو کہ ان میں سے فلاں فریق کا ساتھ دینے کے نتیجہ میں کلمۃ اسلام یعنی اسلامی اقتدار قائم ہو جائے گا تو مسلمانوں کو اس میں شریک ہونا چاہیے اور اگر جنگ کے نتیجہ میں کلمۃ اسلام کی بلندی اور اسلامی اقتدار کے قائم ہونے کی امید نہ ہو تو اس جنگ میں مسلمانوں کو شریک ہونا اور قربانی دینا جائز نہیں ــــــ مولانا ظفر احمد صاحب نے اس سلسلہ میں فقہ حنفی کی کسی کتاب کی عبارت بھی پڑھی تھی جو اس وقت اُن کے ساتھ تھی اور غالباً امام محمد کی سیر کبیر تھی ــ حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے فرمایا کہ اس وقت ہم ہندوستانی مسلمانوں کے سامنے مسئلہ کی جو نوعیت ہے، کتاب کی اس عبارت کا اس سے کوئی تعلق نہیں ہے۔ اس وقت ہمارے سامنے مسئلہ یہ ہے کہ کانگریس اپنے خاص طریقہ پر انگریزی حکومت کے خلاف طویل مدت سے جنگ کر رہی ہے۔ اس کی یہ جنگ اسلحہ سے نہیں ہے۔ کانگریس کی اس جنگ نے برطانوی حکومت کو مجبور کر دیا ہے کہ وہ حکومتی اختیارات ہندوستانیوں کے حوالہ کرے، وہ اختیارات کا کافی حصہ دے بھی چکی ہے اور حالات جس رفتار سے چل رہے ہیں اُن سے اندازہ یہ ہے کہ مستقبل قریب ہی میں برطانوی حکومت باقی اختیارات بھی

ہندوستانیوں کے حوالے کرنے پر مجبور ہو جائے گی اور یہاں قومی جمہوری حکومت اُس کی جگہ لے گی۔ ہم مسلمان کانگریس کا ساتھ دیں جب بھی یہی ہوگا، اور کانگریس کا ساتھ نہ دیں جب بھی یہی ہوگا، زیادہ سے زیادہ کچھ دیر سویر کا فرق پڑے گا۔ یہاں جو جمہوری حکومت قائم ہوگی ہمیں ہرگز یہ غلط فہمی نہیں ہے اور کسی کو بھی یہ غلط فہمی نہ ہونی چاہیے کہ وہ اسلامی حکومت ہوگی ــــــ وہ ہندوستانی جمہوری حکومت ہوگی۔

اب ہم مسلمانوں کے سامنے دو راستے ہیں، ایک یہ کہ ہم آزادی کی اس جنگ میں کوئی حصہ نہ لیں، اس صورت میں جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ظاہر ہے کہ ہم اس میں مؤثر نہیں ہو سکیں گے اور ہمارے اندر احساسِ کمتری کا اور شرمندگی کا احساس ہوگا، ہم خود اپنے کو برابر کا شریک اور حقدار نہیں سمجھیں گے اور زور اور قوت سے اپنے حقوق کا مطالبہ بھی نہیں کر سکیں گے۔

اور دوسرا راستہ یہ ہے کہ ہم آزادی کی جنگ میں شریک ہوں، اس صورت میں ہمیں یہ امید ہے کہ جب ملک آزاد ہوگا اور یہاں جمہوری حکومت قائم ہوگی تو ہم اس میں مؤثر اور دخیل ہوں گے، وہ اسلامی حکومت تو نہیں ہوگی لیکن ہمارے دینی مقاصد کے لیے بھی موجودہ انگریزی حکومت سے ہمارے لیے وہ بہتر ہوگی، اور ہماری حیثیت اُس میں ایک ایسے شریک کی ہوگی جو جنگ اور قربانی میں بھی شریک رہا ہے۔

حضرت مفتی صاحب نے اپنے اس نقطۂ نظر کی وضاحت کے بعد فرمایا۔ ہم نے جہاں تک غور کیا ہے ہم مسلمانوں کے لیے اس دوسرے راستہ کو صحیح سمجھتے ہیں اور فیما بیننا و بین اللہ اس پر مطمئن ہیں۔

حضرت مولانا محمد سجاد صاحب نے اس پر اتنا اور اضافہ فرمایا "لتکون کلمۃ اللہ ھی العلیا" (کلمۂ اسلام کے بلند ہونے کا) اعلیٰ درجہ تو بے شک یہ ہے کہ صحیح دینی اصولوں پر اسلامی حکومت قائم ہو۔۔۔ اس کا تو ہندوستان میں کسی کے نزدیک بھی کوئی امکان اس وقت نہیں ہے، لیکن اس کا ایک دوسرا درجہ یہ بھی ہے کہ مذہبی امور اور معاملات کے لحاظ سے اس وقت ہماری جو حالت ہے، اس سے بہتر حالت ہو جائے، ہم جو کچھ کر رہے ہیں اسی امید پر کر رہے ہیں اور اس کا راستہ ہمارے نزدیک یہی ہے۔

حضرت مفتی کفایت اللہ صاحب نے غالباً اسی مرحلہ پر یہ بھی فرمایا کہ میں اس سلسلہ میں یہ بات بھی اس مجلس میں ظاہر کر دینا ضروری سمجھتا ہوں کہ اس راستہ میں جس کو ہم مسلمانوں کے لیے صحیح سمجھتے ہیں اور جس کو ہم نے اختیار کیا ہے، بعض منکرات بھی پیش آتے ہیں، مثلاً ہم کانگریس کی میٹنگ میں شریک ہیں، اس کے ارکان اور ممبران میں عورتیں بھی ہیں وہ بھی اس میٹنگ میں شریک ہوں گی، بحث مباحثہ میں حصہ لیں گی، جلسہ میں تقریر بھی کریں گی یہ سب کچھ ہماری موجودگی میں اور ہمارے سامنے ہوگا، اگر ہم شرکت ضروری سمجھتے ہیں تو ہمارے لیے اس کے سوا کوئی چارہ نہیں ہے کہ ہم شریک رہیں، اور کارروائی میں حصہ لیں اور اللہ تعالیٰ سے استغفار کرتے رہیں۔۔۔ ہم نے اس پر بھی بار بار غور کیا ہے اور فیما بیننا وبین اللہ، ہم مطمئن ہیں کہ ان منکرات کے باوجود ہمیں کانگریس میں شریک ہونا چاہئے۔۔۔ اس سلسلہ میں مفتی صاحب نے یہ بھی فرمایا کہ۔۔۔ اس طرح کے منکرات سے واسطہ تو مسلم لیگ کے جلسوں میں بھی پڑتا ہے۔

اس گفتگو میں جہاں تک اب یاد ہے حضرت مولانا ظفر احمد صاحب

اور حضرت مفتی صاحب اور حضرت مولانا محمد سجاد صاحب کے سوا حاضرین میں سے کسی نے کوئی خاص حصہ نہیں لیا، حضرت تھانویؒ نے بھی اس دن اس سلسلہ میں اپنے کسی رجحان کا اظہار نہیں فرمایا ـــــ اس سے مجھے یہ خیال پیدا ہوا کہ پہلی دو گفتگوؤں کے آخر میں حضرت نے اپنے جس تاثر اور رائے کا اظہار فرمایا تھا اب اس میں غالباً فرق پڑ چکا ہے اور حضرت کا موقف وہ نہیں رہا ہے جو میرے دہلی جانے سے پہلے تھا یا کم از کم یہ کہ میں نے جو سمجھا تھا۔

حضرت مولانا حافظ عبد اللطیف صاحب (ناظم مظاہر علوم سہارنپور) نے بھی اس مجلس میں کچھ گفتگو فرمائی تھی اور مولانا مفتی عبد الکریم صاحب گمتھلوی مرحوم نے بھی ایک مختصر تحریر پڑھ کر سنائی تھی جو وہ قلم بند کر کے لائے تھے، لیکن یہ دونوں چیزیں مجلس کے اصل موضوع سے غیر متعلق تھیں اور اب اُن کا ذکر کرنا غالباً مناسب بھی نہ ہوگا۔

یہ بات ذکر سے رہ گئی کہ مجلس کے شرکاء میں جناب مولانا محمد طیب صاحب مہتمم دار العلوم دیوبند بھی تھے، حضرت نے ان کو بھی بلوایا تھا لیکن جہاں تک یاد ہے وہ اس وقت پہنچ سکے تھے جب بات شروع ہو چکی تھی۔

یہ مجلس قریباً ۳-۴ گھنٹے جاری رہی، آخر میں حضرت تھانویؒ نے فرمایا کہ اب کافی وقت ہو گیا اور مسئلہ سے متعلق سارے پہلو سامنے آ گئے، اب آپ حضرات کھانے سے فارغ ہو لیں اور آرام فرما لیں ـــــ چنانچہ مجلس برخاست ہوئی۔ ہم لوگوں نے مولانا شبیر علی صاحب مرحوم کے مکان پر آ کر کھانا کھایا اور آرام کیا ـــــ یہ شعبان کی ۱۵ تاریخ تھی، خود حضرت تھانویؒ کا اور وہاں کے اکثر دوسرے حضرات کا بھی اور غالباً سہارنپور سے آنے والے حضرات کا بھی اُس دن روزہ تھا ـــــ ظہر کی نماز ہم لوگوں نے خانقاہ میں پڑھی

ظہر کے بعد حسب معمول حضرت کی مجلس ہوئی۔ جہاں تک یاد ہے سب حضرات نے مجلس میں شرکت فرمائی۔

رات کے کھانے کا اہتمام خود حضرت نے اپنے بڑے گھر پہ کیا تھا ــــــ صحیح گنتی تو یاد نہیں لیکن یہ یاد ہے کہ کھانے کی انواع و اقسام بہت تھیں، اور حضرت نے بڑا اہتمام فرمایا تھا۔

مجلس کے موضوع پر پھر کسی گفتگو کی نوبت نہیں آئی ــــــ میں نے حضرت مولانا خیر محمد صاحب جالندھری سے (جو خانقاہ کے اس مجمع میں اور حضرت کے خاص متوسلین میں میرے خیالات سے نسبتاً قریب تھے) تنہائی میں دریافت کیا کہ آپ کا کیا اندازہ ہے، حضرت نے پرسوں کی مجلس میں اپنے جس رجحان کا اور آخر میں جس رائے کا اظہار فرمایا تھا جس میں جمعیۃ العلماء اور کانگریس میں شرکت تک کی بات بھی فرمائی تھی، کیا اب حضرت کی رائے وہ نہیں رہی؟ ــــــ انھوں نے فرمایا کہ میرا اندازہ یہی ہے کہ اب حضرت کو اس رائے پر اطمینان نہیں رہا اور مزید غور و فکر کی ضرورت محسوس فرماتے ہیں۔

اُسی رات میں یا اگلے دن صبح کی ٹرین سے ہم لوگوں کی تھانہ بھون سے واپسی ہوگئی ــــــ اُس کے بعد دوسرے ذرائع سے مجھے یہ بات معلوم ہوگئی کہ حضرت کی رائے کے بارے میں میرا اور مولانا خیر محمد صاحب کا اندازہ صحیح تھا۔

جیسا کہ میں پہلے عرض کرچکا ہوں حضرت نے میری بات سن کر جو غیر معمولی اثر فوری طور پر لیا تھا اور اس کی بنا پر جو رائے ہوگئی تھی، جس کا پہلی مجلس میں اظہار بھی فرمایا تھا، وہ حضرت کے عمر بھر کے طرز فکر اور طرز عمل اور ذوق و مزاج کے بالکل خلاف نیز حضرت کے پورے ماحول کے بھی بالکل خلاف ہونے

کی وجہ سے خود میرے لیے بھی انتہائی حیرت کا باعث ہوا تھا اس لیے اُس رائے میں تبدیلی واقع ہو جانے کی اطلاع سے اگرچہ قدرتی طور پر مجھے افسوس ہوا لیکن کوئی تعجب نہیں ہوا۔

جیسا کہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے، یہ واقعہ ۱۹۳۸ء کا ہے جبکہ صوبوں میں کانگرسی حکومتوں کو قائم ہوئے چند مہینے ہی گزرے تھے، بعد میں ان حکومتوں کے رویے سے مسلمانوں میں عام طور سے کانگرس سے بدظنی اور دوری بڑھتی ہی رہی، ان ہی چند مہینوں میں خاص کر ہمارے صوبہ یوپی میں مسلم لیگ کا زور شروع ہوا اور اُس نے کانگریس اور اس کی حکومتوں کے خلاف وسیع پیمانہ پر پروپیگنڈے کی مہم شروع کی (جس کے لیے کسی حد تک مواد کانگرسی حکومتوں کے رویے نے بھی فراہم کیا) اس صورتحال نے حضرت مولانا محمد سجاد صاحبؒ کی "نظام ملت" والی اسکیم کی کامیابی کے امکانات کو بڑی حد تک ختم کر دیا اور غالباً اسی وجہ سے پھر جمیعۃ العلماء کے کسی جلسہ میں بھی باضابطہ اُس پر غور و بحث کی نوبت نہیں آئی۔

حالات کی اس رفتار نے قدرتی طور پر حضرت تھانویؒ کے اس احساس کو اور آگے بڑھایا کہ کانگرس کے بارے میں ہمارا جو طرزِ عمل اور طرزِ فکر رہا ہے وہی صحیح تھا اور صحیح ہے اور اس طرح مسلم لیگ کے ساتھ ایک طرح کا ذہنی قرب اور ہمدردی کا جذبہ بڑھتا رہا اور بعد میں تو کھلی حمایت کا بھی فیصلہ فرمایا۔

قُلْ كُلٌّ يَّعْمَلُ عَلٰى شَاكِلَتِهٖ فَرَبُّكُمْ اَعْلَمُ بِمَنْ هُوَ اَهْدٰى سَبِيْلًا

دارالعلوم دیوبند کے میرے خاص متعارف اساتذہ میں ایک صاحب مولانا سید حسن صاحب دیوبندی مرحوم تھے۔ بڑے صالح عالم دین تھے۔ حضرت

حکیم الامت قدس سرہٗ سے بیعت اور اصلاح و تربیت کا تعلق تھا۔ جلدی جلدی تھانہ بھون حاضر ہونے کا اُن کا معمول تھا۔ حضرتؒ کے وصال کے بعد ایک دن انھوں نے مجھ سے بیان کیا کہ میں ایک دفعہ حضرت کی مجلس میں تھانہ بھون حاضر تھا۔ حضرت نے تم سے متعلق کسی واقعہ کا کچھ ذکر کیا جس کا تعلق جمعیۃ العلماء اور کانگریس سے تھا اور تمھارے بارے میں فرمایا کہ ـــــ "میں اُس کی قوت ان کے اخلاص سے مغلوب ہو گیا" ـــــ مولانا سید حسن صاحب مرحوم نے یہ بات بیان کر کے مجھ سے دریافت کیا کہ وہ کیا واقعہ تھا؟ حضرت نے مجلس میں واقعہ تفصیل سے بیان نہیں فرمایا تھا، اور پوچھنے کی میری ہمت نہ ہوئی، اگر آپ کو یاد ہو تو بتلایئے! ـــــ مجھے مولانا سید حسن صاحب مرحوم کے اس بیان سے یہ معلوم کر کے کہ حضرت قدس سرہٗ نے مجھے اس درجہ کا مخلص گمان کیا، بے حد خوشی ہوئی۔ اللہ تعالیٰ نے حضرت کے اس حسن ظن کو میرے حق میں واقعہ بنا دے ـــــ میں نے مولانا سید حسن صاحب کو یہ واقعہ پوری تفصیل سے سنایا۔ انھوں نے غالباً فرمائش کی کہ اس کو اسی تفصیل سے لکھ دو" ـــــ ان کے علاوہ بھی بہت سے حضرات جن کے سامنے یہ واقعہ بیان کرنے کی کبھی نوبت آئی، انھوں نے بھی یہی فرمائش کی، خود میں بھی ضروری سمجھتا تھا کہ اس واقعہ کو لکھ کے محفوظ کر دیا جائے کیونکہ اس کے سارے اجزاء اور اس سلسلہ کی ساری کڑیاں میرے سوا کسی بھی دوسرے کے علم میں نہیں تھیں اور نہیں ہیں ـــــ آج قریباً ۳۰ سال کے بعد اس کو حوالۂ قلم کرنے کی توفیق ملی ہے۔

اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کا ایک خاص انعام و احسان یہ بھی ہے کہ اس طرح کے واقعات اپنی پوری تفصیلات کے ساتھ محفوظ رہتے ہیں۔ اَللّٰهُمَّ لَكَ الْحَمْدُ وَلَكَ الشُّكْرُ لَا اُحْصِيْ ثَنَاءً عَلَيْكَ اَنْتَ كَمَا اَثْنَيْتَ عَلٰى نَفْسِكَ!

تیسری حاضری اور ایک قابلِ ذکر واقعہ

گزشتہ صفحات میں حضرت حکیم الامت کی خدمت میں سنہ ١٩٣٧ء کی حاضری کا وہ غیر معمولی واقعہ تفصیل سے ذکر کیا جا چکا ہے جو بہت سوں کے لیے موجب حیرت ہوا ہوگا۔ اور اسی کے ضمن میں یہ بات بھی ذکر کی جا چکی ہے کہ اسی وقت سے ملک میں مسلم لیگ کا زور عوامی پیمانہ پر شروع ہوا۔ اس سے پہلے مسلم عوام سے اُس کا کوئی رابطہ اور تعلق نہیں تھا۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت تھانوی نے ہمارے دوسرے اکابر کے طرزِ عمل کے برخلاف اپنے کو سیاسی تحریکات سے ہمیشہ الگ رکھا تھا اور اپنے لیے اسی کو بہتر سمجھا تھا۔ اس کے باوجود یہ واقعہ ہے کہ حضرت کا ذہن اور ذوق جمعیۃ العلماء کے سیاسی مسلک سے مختلف اور مسلم لیگ کے طرزِ فکر اور طرزِ عمل سے قریب تھا اور سنہ ١٩٣٧ء کے بعد یہ قرب جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے، بڑھتا ہی گیا۔

اسی زمانہ میں (یعنی سنہ ١٩٣٨ء و سنہ ١٩٣٩ء میں) یہ ہوا کہ کانگریسی حکومتوں کے بعض معاملات اور کارروائیوں پر مسلمانوں کے تعلق سے

"الفرقان" میں سخت تنقیدیں کی گئیں۔ اسی کے ساتھ جمعیۃ العلماء سے تعلق رکھنے والے بعض ایسے حضرات کے رویہ سے (جن کو ہم لوگ اُس زمانہ میں جمعیۃ کا "بایاں بازو" اور "فارورڈ بلاک" کہا کرتے تھے) کھل کر اختلاف کا اظہار کیا گیا ــــ الفرقان کے ان مضامین کو مسلم لیگ کے حامی بعض اخبارات نے بھی نقل کیا۔ غالباً ان باتوں کی وجہ سے بعض حضرات نے یہ خیال کر لیا کہ راقم سطور مسلم لیگ سے قریب ہو گیا ہے ــــ اُس وقت کے اس ماحول اور اس صورتحال کو ذہن میں رکھ کر مندرجہ ذیل واقعہ پڑھیے۔

سنہ اور مہینہ ٹھیک یاد نہیں، غالباً ۱۹۳۸ء کے اواخر یا ۱۹۳۹ء کے اوائل کی بات ہے، راقم سطور بریلی رہتا تھا، الفرقان وہیں سے نکلتا تھا، ایک دن حضرت حکیم الامت قدس سرہٗ کا تار ملا جس کا مضمون یہ تھا کہ "ایک مشورہ کے لئے تمہاری ضرورت ہے" ــــ میں غالباً اسی دن تھانہ بھون کے لیے روانہ ہو گیا۔ حضرت سے ملاقات ہوئی، حسب معمول سلام و مصافحہ ہوا، اسی وقت فرمایا کہ ایک معاملہ میں بات کرنے کی ضرورت تھی اس لیے میں نے آپ کو تکلیف دی ہے، لیکن وہ بات آپ سے مولوی ظفر کریں گے، وہ میری ہی بات ہوگی، میں نے اس لیے مناسب سمجھا ہے کہ آپ زیادہ آزادی اور بے تکلفی سے بات کر سکیں ــــ مولانا ظفر احمد صاحب بھی اس وقت تشریف رکھتے تھے۔ انھوں نے عرض کیا کہ حضرت ان کو اجازت دے دیں یہ رات کا کھانا میرے یہاں کھالیں اور وہیں رات کو آرام کریں، اس طرح باتیں زیادہ اطمینان سے ہو سکیں گی ــــ یہی طے ہو گیا ــــ کھانے سے اور عشاء کی نماز سے فارغ ہو کر وہ گفتگو ہوئی۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے فرمایا کہ ابھی چند روز پہلے نواب اسمٰعیل خاں[1] اور ڈاکٹر جمشید علی خاں یہاں آئے تھے انھوں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ جمعیۃ العلماء اور خاص کر مولانا حسین احمد صاحب اپنی پوری طاقت کے ساتھ کانگریس کے ساتھ ہیں اور مسلمانوں کو اس کی حمایت کی دعوت دے رہے ہیں، اس کا مسلمانوں پر بہت اثر پڑ رہا ہے اور یہ سمجھا جا رہا ہے کہ ہمارے تمام علماء کرام کی رائے یہی ہے، اس کی وجہ سے مسلم لیگ کے کام میں بہت رکاوٹ پڑ رہی ہے ہم یہ درخواست لے کر حاضر ہوئے ہیں کہ حضرت کی طرف سے بھی مسلم لیگ کی کھلی تائید و حمایت ہو۔ اس کے لیے حضرت ایک بیان تحریر فرمادیں اور ہم کو اس کی اشاعت کی اجازت دے دیں" ــــ حضرت نے فرمایا کہ "اگرچہ مجھے مسلم لیگ سے اور آپ حضرات سے ہمدردی ہے لیکن جس طرح کی تائید آپ چاہتے ہیں اُس کے لیے جیسا اطمینان قلب ہونا چاہئے وہ مجھے نہیں ہے اس لیے اس سے معذور ہوں" ــــ اُن دونوں حضرات نے عرض کیا کہ حضرت کے اطمینان کے لیے جو شرط ہو ہم اُس کو پورا کرنے کی کوشش کریں گے ــــ حضرت نے مسلم لیگ کے نظام اور فیصلوں کے طریقہ کار کے بارہ میں اُن سے دریافت کیا تو انھوں نے بتلایا کہ فیصلوں کا زیادہ تر دار و مدار ورکنگ کمیٹی پر ہوتا ہے،

---

[1] نواب اسمٰعیل خاں مرحوم (میرٹھی) اس وقت جناب صوبہ یوپی کی مسلم لیگ کے صدر اور مسلم لیگ کی اہم شخصیتوں میں سے تھے اور سیاسی طور پر مسلمانوں کے صاحب کی کار لیڈر تھے۔ کرنل حمید اللہ خاں مرحوم (دانپت) بھی یوپی مسلم لیگ کی نمایاں شخصیتوں میں تھے، حضرت حکیم الامت رحمۃ اللہ علیہ سے عقیدت کا خاص تعلق تھا اور آمد و رفت بھی رکھتے تھے۔

حضرت نے فرمایا: اگر آپ حضرات یہ طے کرلیں کہ ورکنگ کمیٹی میں ایک آدمی وہ ہوگا جس کو میں منتخب کروں گا اور دینی معاملات میں اُسی کی رائے کو فیصلہ کن سمجھا جائے گا تو میں اس طرح کی تائید کرسکوں گا جس طرح کی آپ چاہتے ہیں۔" (مولانا ظفر احمد صاحب نے بیان فرمایا کہ) اس بارہ میں دیر تک گفتگو رہی، آخر میں انھوں نے عرض کیا کہ اس کا قطعی جواب چند روز کے بعد ہم دے سکیں گے ـــــ چند دن کے بعد وہ پھر (تھانہ بھون) آئے اور عرض کیا کہ حضرت کی شرط مان لی گئی ہے البتہ یہ گزارش ہے کہ جن صاحب کو حضرت نامزد فرمائیں وہ سیاسی مسائل و معاملات اور ہماری مشکلات سے واقف ہوں ـــــ حضرت نے فرمایا میں اس بات کا پورا لحاظ رکھوں گا اور اب غور کرکے نام کے بارے میں اطلاع دوں گا۔"

مولانا ظفر احمد صاحب نے یہ واقعہ سنانے کے بعد مجھے بتلایا کہ اس کے بعد حضرت نے ہم لوگوں سے مشورہ فرمایا، متعدد حضرات کے نام سامنے آئے لیکن کسی کے بارے میں فیصلہ نہیں ہوسکا، آخر میں خود حضرت نے تمھارا نام لیا تو سب نے اطمینان ظاہر کیا اور یہی طے ہوگیا ـــــ حضرت نے تم کو تاسی لیے بلوایا ہے کہ تمھاری منظوری کے بعد تمھارا نام وہاں بھیج دیا جائے۔"

مولانا ظفر احمد صاحب کے اس بیان سے اپنے بارے میں حضرت حکیم الامت کا اس درجہ حسنِ ظن اور اعتماد معلوم کرکے مجھے قدرتی طور پر بے حد خوشی ہوئی اسی کے ساتھ انتہائی حیرت بھی ہوئی کہ میرے بارہ میں ایسی غلط فہمی کیوں ہوگئی میں اُس وقت جمعیۃ علماء سے باضابطہ وابستہ تھا اور ہندوستانی مسلمانوں کیلئے اسی کے سیاسی مسلک کو اصولی اور بنیادی طور پر صحیح سمجھتا تھا، اگرچہ بعض معاملات میں میری مستقل ذاتی رائے تھی۔

میں نے مولانا ظفر احمد صاحب سے عرض کیا کہ میرے بارہ میں حضرت کو اور آپ حضرات کو غالباً غلط فہمی ہوئی ہے۔ میں تو مسلم لیگ کے راستہ کو اصولی طور پر صحیح نہیں سمجھتا۔ اس لیے جو کچھ آپ حضرات نے سوچا ہے اس کا تو کوئی امکان ہی نہیں ہے۔ میں تعمیل نہیں کر سکوں گا۔ اس کے علاوہ میں عرض کرتا ہوں کہ اس زمانہ میں کوئی بھی سیاسی یا قومی جماعت کسی ایک آدمی کو اور وہ بھی مجھ جیسے ایک غریب مولوی کو ایسا اختیار اور بالاتر مقام ہرگز نہیں دے سکتی۔ مجھے تو شبہ ہے کہ شاید اس بارہ میں بھی کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے۔ میں نہیں سمجھ سکتا کہ مسٹر جناح نے اس کے لیے کمٹمنٹ کی دی ہو، اور مسلم لیگ میں اصل شخصیت اُن ہی کی ہے۔

مولانا ظفر احمد صاحب نے مجھے سمجھانے کی اور اپنی بات منوانے کی کوشش فرمائی لیکن میں اپنی رائے اور موقف پر قائم رہا ــــ اس گفتگو کا سلسلہ دیر رات تک جاری رہا تھا۔ آخر میں مولانا نے فرمایا کہ اس وقت کے اپنے جواب کو آخری جواب قرار مت دو۔ آج رات کو استخارہ بھی کرو اور آخری جواب مجھے صبح دو ــــ میں نے عرض کیا کہ استخارہ تو وہاں ہوتا ہے جہاں کسی معاملہ میں تردد اور تذبذب ہو لیکن جس معاملہ میں قطعیت کے ساتھ ایک رائے قائم ہو وہاں استخارہ کی بات کچھ سمجھ میں نہیں آتی ــــ لیکن مولانا نے اس کے بعد بھی استخارہ کے لیے فرمایا۔

اب مجھے یاد نہیں کہ میں نے استخارہ کیا یا نہیں۔ صبح کو مولانا نے دریافت فرمایا تو میں نے عرض کیا کہ جواب وہی ہے جو رات عرض کر چکا ہوں۔ مولانا ظفر احمد صاحب نے میری اور اپنی گفتگو کا ذکر حضرت حکیم الامت سے کر دیا ہو گا خود حضرت نے اس سلسلہ میں مجھ سے کوئی بات نہیں فرمائی۔

غالباً صرف اس لیے کہ میرے دل پر کوئی بوجھ نہ پڑے۔ مجھے اس کا بڑا قلق رہا کہ حضرت نے جس مقصد سے مجھے تار دے کر طلب فرمایا تھا وہ میرے ذریعہ پورا نہ ہو سکا لیکن دل کو اطمینان رہا کہ میرے اس رویہ سے حضرت کو ذرہ برابر گرانی نہ ہوئی ہوگی بلکہ اس سے خوشی ہوئی ہوگی کہ جس بات کو میں نے صحیح نہیں سمجھا اس کے قبول کرنے سے معذرت کردی ۔۔۔ پھر مجھے یہ معلوم نہیں ہو سکا کہ اس مسئلہ کا آخری انجام کیا ہوا، راقم سطور کا یہ خیال ہے کہ پھر اس تجویز پر غالباً عمل ہی نہیں ہوا ۔۔۔ تاہم جیسا کہ پہلے بھی ذکر کیا جا چکا ہے، بعد میں حضرت نے اپنے خاص انداز میں شرعی قیود و تحفظات کے ساتھ مسلم لیگ کی کھل کر تائید و حمایت بھی فرمائی ۔۔۔ اور ظاہر ہے کہ مسئلہ اجتہادی تھا جس میں غلطی ہونے کی صورت میں بھی ۔۔۔ بشرط اخلاص اجر موعود ہے۔

حضرت حکیم الامتؒ کا مستقل معمول تھا کہ صبح (غالباً ناشتہ وغیرہ سے فارغ ہو کر) خانقاہ تشریف لے آتے تھے اور دوپہر تک پورے انہماک و یکسوئی کے ساتھ تصنیف و تحریر کے کام میں مشغول رہتے، کسی غیر معمولی ضرورت اور خاص استثناء کے بغیر اس وقت میں کسی سے ملاقات بھی نہیں فرماتے تھے جس رات کو مولانا ظفر احمد صاحب نے اپنے مکان پر مذکورہ بالا گفتگو فرمائی اس کی صبح کو میں خانقاہ کے ایک حجرہ میں تھا۔ ۹ بجے کا وقت ہوگا، حضرت کے ایک خادم حضرت کا یہ پیام لائے کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ آج میں اس وقت فارغ ہوں اگر جی چاہے تو آجائیں۔ حیرت ہوئی اور میں نے اس کو حضرت کی خاص الخاص عنایت ہی سمجھا ۔۔۔ میں اسی وقت حاضر ہو گیا۔

جہاں تک یاد ہے اس وقت کوئی اور صاحب حضرت کے پاس نہیں تھے۔ حضرت نے بغیر کسی تمہید و تقریب کے اور بغیر میرے سوال کے سلوک اور تزکیہ کی ضرورت اور دین میں اس کی اہمیت پر ایک تقریر شروع فرمائی یہ تقریر تسلسل کے ساتھ کم از کم ایک گھنٹہ سے زیادہ جاری رہی ــــ اگر وہ قلمبند کی گئی ہوتی تو اس موضوع پر ایک کافی شافی تصنیف ہو جاتی، میں خاموشی اور توجہ سے صرف سنتا رہا۔

یہاں میں اپنا یہ حال بھی ظاہر کر دوں کہ یہ وہ زمانہ تھا جبکہ میں سلوک و تصوف سے ذہنی طور پر کچھ دور ہو گیا تھا اور میرے اندر اس کی کوئی طلب بھی نہیں تھی اور غالباً طلب کے اس فقدان ہی کا نتیجہ تھا کہ حضرت حکیم الامت کی اس نہایت مبسوط اور مدلل تقریر کا بھی مجھ پر وہ اثر نہیں ہوا جو ہونا چاہیے تھا اور وہ فائدہ اس سے میں نے اس وقت نہیں اٹھایا جو اٹھانا چاہیے تھا۔ بلاشبہ یہ بڑی محرومی تھی ــــ لیکن اس کے کچھ ہی دنوں کے بعد اللہ تعالیٰ کا فضل ہوا اور رائے پور کی خانقاہ میں وہ واقعہ پیش آیا جو ناظرین کرام چند ہی ورق کے بعد حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں اس عاجز کی حاضری کے سلسلے میں انشاء اللہ پڑھیں گے اور بفضلہ تعالیٰ اس ذہنی بیماری سے نجات مل گئی۔ فالحمد للہ الذی هدانا لهذا وما کنا لنهتدی لولا ان هدانا الله۔

چوتھی بار حاضری

حضرت حکیم الامت کی وفات سے قریباً دو سال پہلے کی بات ہے، کافی عرصے سے حضرت کی علالت اور مزاج کی ناسازی کا سلسلہ چل رہا تھا۔ ناچیز راقم سطور نے زیارت اور عیادت ہی کی نیت سے تھانہ بھون کا سفر کیا بریلی سے سہارنپور پہنچا۔ وہاں سے تھانہ بھون جانے والی چھوٹی لائن کی ٹرین کے ایک ڈبہ میں سوار ہو گیا۔ اتفاق سے اسی ڈبے میں دو صاحب اور بھی تھے جو حضرت کی زیارت ہی کے لیے جا رہے تھے، ان میں ایک صاحب بجنور کے کسی کالج یا اسکول کے استاد تھے جن کو میں نے اس سے پہلے بھی کئی بار تھانہ بھون میں دیکھا تھا ـــ وہ حضرت حکیم الامت سے بیعت تھے اور خاص درجہ کا تعلق رکھنے والوں میں سے تھے۔ افسوس ہے اس وقت مجھے ان کا نام یاد نہیں آیا ـــ دوسرے صاحب جو ان کی رفاقت میں جا رہے تھے غالباً سیوہارا ضلع بجنور کے ایک مولوی صاحب تھے، یہ دارالعلوم دیوبند کے فارغ تھے اور آج پہلی ہی دفعہ حضرت کی زیارت کے لیے تھانہ بھون جا رہے تھے۔ حضرت کے جلالی مزاج کے بارے میں جو عام شہرت ہمارے حلقہ میں بھی تھی یہ مولانا صاحب اس کی وجہ سے بہت خائف تھے اور ان کے رفیق ان کو بتلا رہے

تھے کہ یہ شہرت بالکل غلط ہے۔ حضرت کے مزاج میں تو بڑی شفقت ہے۔ ہاں! بے اصولیوں اور بے عنوانیوں سے حضرت کو تکلیف وناگواری ہوتی ہے اور اس کی وجہ سے کبھی مزاج میں برہمی بھی آجاتی ہے، وہ ان کو بتلاتے تھے کہ آپ بس ان چند باتوں کا لحاظ رکھیں۔

مجھے چونکہ ہمیشہ حضرت کی عنایتوں اور شفقتوں ہی کا تجربہ ہوا تھا اور اپنے بارہ میں یہ بھی خوش گمانی تھی کہ حضرت کے مزاج کو میں نے سمجھ لیا ہے اس لیے خواہ مخواہ میں بھی ان مولوی صاحب کا اتالیق بن گیا۔ اور حضرت کی عنایتوں، شفقتوں کے تجربے ان کو سنا سنا کر مطمئن کرنے لگا۔ اور حضرت کے کسی بڑے مزاج داں صحبت یافتہ کی طرح ان کو مشورے بھی دینے لگا۔ لیکن تھوڑی ہی دیر بعد تھانہ بھون پہنچ کر اپنی حقیقت معلوم ہوگئی۔

ظہر کی نماز جماعت سے خانقاہ کی مسجد میں پڑھی، اس سے پہلے حضرت سے ملاقات نہیں ہو سکی۔ حضرت جب نماز سے فارغ ہو کر مسجد سے اپنی نشست گاہ کی طرف جانے لگے تو ابھی حضرت صحن مسجد ہی میں تھے اور سخت ضعف ونقاہت کی وجہ سے حضرت کے قدم بہت ہی آہستہ آہستہ اٹھ رہے تھے کہ مجھ سے یہ بے تمیزی سرزد ہوگئی کہ بجائے اس کے کہ اس کا انتظار کرتا کہ حضرت اپنی نشست گاہ پہنچ کر اطمینان سے بیٹھ جائیں فرط شوق سے راستہ ہی میں حضرت کے سامنے آکر سلام عرض کیا اور مصافحہ کے لیے ہاتھ بڑھا دیے حضرت نے ٹھہر کر مصافحہ تو فرما لیا لیکن ساتھ ہی بڑے مظلومانہ انداز سے فرمایا۔

بیمار پر تو رحم کھانا چاہیے

حضرت کے ان الفاظ سے اس وقت دل کی جو کیفیت ہوئی اور اپنی

بے تمیزی کے احساس سے قلب پر جو بوجھ پڑا اس کو لفظوں میں ادا نہیں کیا جا سکتا ــــ بہر حال میں اپنی غلطی کے احساس اور اس سے پیدا ہونے والے تاثر میں ڈوب گیا۔ حضرت خانقاہ کی سہ دری میں اپنی نشست گاہ پر جا کر تشریف فرما ہو گئے، دوسرے سب لوگ بھی مجلس کے معمول کے مطابق بیٹھ گئے۔ میں پیچھے اس طرح بیٹھا کہ حضرت کی نظر نہ پڑے۔ حضرت نے حاضرین پر نظر ڈالی اور میرا نام لے کر فرمایا کہ "میرا خیال ہے کہ وہ بھی تھے" میں نے عرض کیا۔ حضرت میں حاضر ہوں۔ حضرت نے بڑی شفقت اور عنایت کے ساتھ قریب بلایا اور بالکل برابر میں بیٹھنے کے لیے حکم فرمایا۔ مجھے تعمیل کرنی پڑی لیکن جیسا کہ چاہیے تھا۔ ادب سے غالباً دو زانو بیٹھا حضرت نے فرمایا بے تکلف آرام سے بیٹھیے۔ اس سے مجھے انشراح ہو گا۔ میں نے اس حکم کی بھی تعمیل کی۔ لیکن اپنی غلطی اور بے تمیزی کا بے حد اثر تھا۔ حضرت نے غالباً اسی کے ازالہ ہی کے لیے اس دن کی مجلس میں اس نالائق پر بہت ہی غیر معمولی عنایت مبذول فرمائی۔

جب عصر کی اذان پر مجلس ختم ہوئی تو قیام کے بارے میں دریافت فرمایا۔ میں نے عرض کیا آج رہوں گا کل واپسی کا ارادہ ہے ــــ فرمایا کہ آج کل میں بیماری اور ضعف کی وجہ سے صرف ظہر اور عصر کی نمازیں یہاں (خانقاہ کی مسجد میں) پڑھتا ہوں۔ مغرب عشاء اور فجر کی نماز میں نہیں آتا۔ اگر طبیعت اچھی رہی تو میں مغرب کے بعد آپ کو اطلاع کروں گا۔ آپ کا جی چاہے تو اس وقت گھر پر ہی آجائیں۔ مجھ جیسے بے مایہ اور ذلیل آدمی پر عنایت و شفقت کی یہ آخری حد تھی ــــ ورنہ جہاں تک معلوم ہے بہت ہی خاص استثنائی صورتوں کے علاوہ حضرت کا یہ معمول بالکل نہیں تھا۔

میں نے مغرب کی نماز خانقاہ کی مسجد میں پڑھی جب نوافل سے فارغ ہوا تو مولانا جمیل احمد تھانوی تشریف لائے اور مجھ سے فرمایا کہ حضرت نے ارشاد فرمایا ہے کہ میری طبیعت اس وقت اچھی ہے، اگر آپ کا جی چاہے تو میرے پاس آجائیں ـــــ میں حاضر ہو گیا۔

حضرت ایک تخت پر تشریف فرما تھے۔ اس کے بالکل برابر میں پلنگ تھا، جو تخت سے قریباً ایک بالشت اونچا رہا ہوگا۔ سرہانے ایک بڑا سا تکیہ لگا ہوا تھا۔ میں حاضر ہوا تو حضرت نے مجھے اس پلنگ ہی پر بیٹھنے کے لیے ارشاد فرمایا۔ مجھے یہ بات اپنے لیے کچھ خلافِ ادب معلوم ہوئی کہ میں حضرت سے بلند جگہ پر بیٹھوں، اس لیے مجھے کچھ تامل ہوا۔ حضرت نے محسوس فرمایا اور پھر پلنگ ہی پر بیٹھنے کے لیے فرمایا، مجبوراً تعمیل کی۔ قریباً ایک گھنٹہ یہ حاضری نصیب ہی، طبیعت کی ناسازی اور سخت ضعف و نقاہت کے باوجود ارشادات کا سلسلہ مسلسل جاری رہا۔

اس زمانہ میں میرا حافظہ ایسا تھا کہ اگر دو چار دن کے بعد بھی اس صحبت کے ملفوظات قلمبند کرنے کی کوشش کرتا تو بڑی حد تک حضرت ہی کے الفاظ میں قلمبند کر لیتا۔ لیکن افسوس اُس وقت یہ اندازہ نہیں تھا کہ کچھ مدت کے بعد حافظہ میں اتنا فرق پڑ جائے گا۔

اُس مجلس اور اس صحبت کا ایک ملفوظ اب تک بھی اچھی طرح یاد ہے لیکن اب روایت بالمعنی ہی ہوگی۔ سلسلۂ کلام میں اپنی اصول و اوقات کی پابندی کی عادت کے بارے میں فرمایا کہ بعض اوقات دوستوں کو اس سے شکایت پیدا ہوتی ہے اور وہ سمجھتے ہیں کہ میں دوسروں کی رعایت نہیں کرتا حالانکہ میں اپنے نزدیک رعایت کی پوری کوشش کرتا ہوں۔ اس

یہ بھی چاہتا ہوں کہ اپنے اصول و اوقات کی بھی حتی الوسع پابندی کریں اس سے کام میں بڑی برکت ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ واقعہ بیان فرمایا کہ ایک دفعہ حضرت مولانا محمود حسن صاحب دیوبندی رحمۃ اللہ علیہ جو میرے استاد تھے تشریف لائے۔ میرے ہی یہاں قیام تھا۔ میں ان دنوں میں (مثنوی شریف کی شرح) "کلید مثنوی" لکھ رہا تھا اور اس کا ایک وقت مقرر کر لیا تھا۔ لکھنے کی جگہ بھی مقرر تھی، جب اس کے لکھنے کا وقت آیا تو میرے دل میں اس کا تقاضا پیدا ہونے لگا، پہلے تو میں نے سوچا کہ آج ناغہ کر دوں پھر خیال ہوا کہ دل ادھر لگا رہے گا اور اس کا وقت گزر جانے کے بعد بھی دل پر ناغہ کا اثر رہے گا اور جیسی یکسوئی اور فراغ قلب کے ساتھ حضرت کی خدمت میں بیٹھنا چاہیے، وہ بات نصیب نہ ہوگی تو میں نے طے کیا کہ حضرت مولانا سے اپنا حال عرض کر دوں۔ پھر جو فرما دیں اس پر عمل کر دوں، چنانچہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ میں مثنوی شریف کی شرح لکھ رہا ہوں اور اس کے لیے یہ وقت مقرر کر لیا ہے، عادت کے مطابق اس وقت بھی دل میں اس کا تقاضا ہے۔ لیکن اس کے لیے بھی دل آمادہ نہیں کہ حضرت یہاں تشریف فرما ہوں اور میں کسی کام کے لیے الگ جا کر بیٹھ جاؤں۔ حضرت نے فرمایا کہ اس وقت جا کر وہی لکھو۔۔۔۔ اس کے بعد میں نے سوچا کہ جتنی دیر میں غیر حاضر رہوں گا اتنے وقت میں حضرت کو کیا ضرورت پیش آ سکتی ہے، جو کچھ سمجھ میں آیا اس کا میں نے انتظام کیا پھر ایک عزیز کو جو میرے نزدیک فہیم بھی تھے سب سمجھایا اور ان سے کہا کہ میری واپسی تک وہ حضرت کی خدمت میں رہیں، اس کے بعد میں "کلید مثنوی" لکھنے چلا گیا لیکن اس دن صرف ایک شعر کی شرح لکھی، اس سے آگے لکھنے کے لیے خود دل آمادہ نہیں

ہوا اور جلدی ہی حضرت کی خدمت میں آ گیا۔ حضرت نے دریافت فرمایا کہ اتنی جلدی کیوں آ گئے؟ میں نے عرض کیا کہ بس ایک شعر کی شرح لکھ کر دل کا تقاضا ختم ہو گیا۔ اس کے آگے لکھنے کے لیے دل ہی نہ چاہا، اس لیے چلا آیا۔

اسی سلسلۂ کلام میں اس سیہ کار کے بارے میں ایک بات ایسی ارشاد فرمائی جس کا مصداق میں اپنے کو کسی طرح نہیں پاتا۔ اللہ تعالیٰ اپنے خاص کرم سے حضرت کی زبان کی برکت سے وہ چیز نصیب فرمائے۔ وما ذٰلک علی اللہ بعزیز ــــ

اس دفعہ کی حاضری میں حضرت قدس سرہٗ کی جو خاص الخاص اور غیر معمولی عنایات نصیب ہوئیں، میرا خیال ہے کہ سب اس کا طفیل تھا کہ مجھ سے ایک بے تمیزی سرزد ہوئی جس پر حضرت نے یہ فرما کر کہ "بیمار پلاؤ کم کھانا چاہیے" مصلحانہ تنبیہ فرمائی جس سے مجھے اپنی غلطی اور بے تمیزی کا شدید احساس ہوا اور میں اس احساس و تاثر میں ڈوب گیا۔ حضرت نے اس کے ازالہ کے لیے اور میری تطییب خاطر کے لیے یہ غیر معمولی عنایتیں کیں۔ اس طرح اپنی ایک غلطی اور بے تمیزی بھی اتنے عظیم خیر کا وسیلہ بن گئی ــــ واقعہ یہ ہے کہ کریمانہ اخلاق تو بس ان اللہ والوں ہی کا حصہ ہے۔ اللہ تعالیٰ تخلقوا باخلاق اللہ کی نعمت کا کوئی حصہ اس سیہ کار کو بھی نصیب فرمائے۔

آخری حاضری

مرض، جو بالآخر مرضِ وفات ثابت ہوا، اس کا سلسلہ تو کئی سال سے چل رہا تھا، لیکن آخری چند مہینوں میں ضعف بہت بڑھ گیا تھا ــــ یہ عاجز حضرت کی وفات (۱۶ رجب ۱۳۶۲ھ م ۱۹ جولائی ۱۹۴۳ء) سے غالباً دو ڈھائی مہینے پہلے زیارت اور عیادت ہی کی نیت سے تھانہ بھون حاضر ہوا۔ ان دنوں حضرتؒ خانقاہ کسی وقت بھی تشریف نہیں لاتے تھے اور تشریف نہیں لا سکتے تھے ــــ دولت کدہ کے قریب ہی ایک مکان کی بیرونی نشست گاہ میں ظہر کے بعد کچھ وقت کے لیے تشریف لاتے تھے، اور مجلس ہوتی تھی ــــ یہ مکان حضرت خواجہ عزیز الحسن صاحبؒ کا تھا (جو حضرت حکیم الامت کے عاشق اور محبوب خلیفہ تھے اور انھوں نے کچھ عرصہ پہلے سے تھانہ بھون ہی میں رہائش اختیار کر لی تھی۔)

یہ عاجز ظہر سے کچھ پہلے پہونچا تھا، خانقاہ کی مسجد میں ظہر پڑھ کے وہیں حاضر ہو گیا، جو حضرات مجھ سے پہلے پہنچ چکے تھے وہ وہاں کے ضابطے کے مطابق بیٹھ گئے تھے، حضرت ابھی تشریف نہیں لائے تھے، میں بھی پیچھے ایک طرف بیٹھ گیا اور بالارادہ اس طرح بیٹھا کہ جو جاننے پہچاننے والے

حضرات مجلس میں تھے اُن کو بھی میری حاضری کی خبر نہیں ہوئی. اس وقت میں نے کسی وجہ سے یہی مناسب سمجھا تھا. میرے پہنچنے کے چند ہی منٹ بعد خواجہ صاحب نے کھڑے ہو کر اعلان فرمایا کہ حضرت تشریف لانے والے ہیں کوئی صاحب کھڑے نہ ہوں اور مصافحہ کی کوشش نہ فرمائیں. حضرت خود ہی حاضرینِ مجلس کو سلام کریں گے. آپ حضرات جواب دے دیں. اگر خود حضرت کسی صاحب سے کچھ دریافت فرمائیں تو وہ جواب دے دیں ـــــ

خواجہ صاحب یہ اعلان کر کے بیٹھ گئے اور حضرت فوراً ہی تشریف لے آئے. ایک ہاتھ میں عصا تھا جس کے سہارے چل کر آ رہے تھے اور صاف محسوس ہوتا تھا کہ شدتِ ضعف کی وجہ سے بہت مشقت سے چل رہے ہیں. دوسرے ہاتھ میں ٹین کا ایک گول اور لانبا سا ڈبہ تھا جس میں خطوط رہتے تھے ـــــ مجلس میں داخل ہوتے ہی فرمایا السلام علیکم. حاضرین نے جواب عرض کیا. ایک چوکی بچھی ہوئی تھی اس پر تکیہ بھی لگا ہوا تھا. حضرت اس پر خود ہی بیٹھ گئے. میں نے دیکھا کہ شدتِ ضعف کی وجہ سے بہت مشقت اور تکلیف سے بیٹھ سکے. غالباً کسی کو اس کی اجازت نہ تھی کہ بیٹھنے میں سہارا دے. یہ اصول اور معمول تھا کہ جہاں تک ممکن ہو اپنے لیے کوئی زحمت کسی کو نہ دی جائے اور حتی الوسع ذاتی خدمت نہ لی جائے.

ڈاک کا ڈبہ کھول کر خطوط نکالے جو خاصی تعداد میں تھے ـــــ ایسا اندازہ ہوا کہ حضرت ان خطوط کو (جو اسی دن کے آئے ہوئے ہوں گے) ملاحظہ فرما چکے ہیں. جن خطوں کے مضامین کا ذکر کرنا حاضرین کے لیے مفید ہو سکتا تھا اُن کا اور اکثر اُن کے جواب کا بھی مجلس میں ذکر فرمایا ـــــ علالت کے اس آخری دور میں شدتِ ضعف کی وجہ سے ساری ڈاک کا جواب حضرت خود تحریر نہیں فرماتے

تھے۔ کسی خصوصیت اور اہمیت کی وجہ سے جس خط کا جواب خود ہی لکھنا ضروری سمجھتے تھے وہ تو خود ہی تحریر فرماتے تھے باقی ڈاک خواجہ صاحب کے سپرد فرمادی جاتی تھی اور جواب سے متعلق اشارات فرما دیتے تھے۔ اس دن بھی ڈاک کا خاصا حصہ خواجہ صاحب کے سپرد فرمایا ــــ سب حاضرین خاموشی سے حضرت کے ارشادات صرف سنتے رہے، سوائے خواجہ صاحب کے غالباً کسی نے کوئی بات نہیں کی ــــ

حضرت کے ضعف کی حالت دیکھ کر میں نے طے کر لیا کہ بس اس خاموش زیارت ہی پر قناعت کر دوں گا اور حضرت کو اپنی حاضری کی بھی اطلاع نہیں دوں گا۔ کیونکہ میرا خیال تھا کہ اگر اطلاع دوں تو حضرت ازراہِ شفقت و عنایت گفتگو فرمائیں گے اور اس سے خواہ مخواہ مشقت اور تعب میں اضافہ ہی ہوگا۔

ان دنوں میں غالباً ایک گھنٹہ اس مجلس کا معمول تھا، جب مقررہ وقت پورا ہو گیا تو خواجہ صاحب پھر کھڑے ہوئے اور اعلان فرمایا کہ اب حضرت تشریف لے جائیں گے، کوئی صاحب نہ تو کھڑے ہوں نہ مصافحہ فرمائیں البتہ جو صاحبان آج ہی باہر سے تشریف لائے ہیں وہ اپنا نام بتلا دیں اور یہ کہ کہاں سے تشریف لائے ہیں ــــ ۳۔۴ حضرات میرے علاوہ اور بھی اس روز زیارت کے لیے مختلف مقامات سے تشریف لائے تھے، انھوں نے اپنا نام اور مقام بتلا دیا۔ سب کے آخر میں میں نے بھی عرض کیا کہ "محمد منظور بھی بریلی سے حاضر ہوا ہے" ــــ (اس زمانہ میں میرا قیام بریلی تھا اور الفرقان بھی وہیں سے نکلتا تھا۔)

حضرت نے بڑے ہی خاص انداز میں ارشاد فرمایا ــــ مولانا آپنے

آج غضب کر دیا، آپ تشریف رکھتے تھے اور نہ آپ نے مجھے بتایا، اور نہ کسی اور نے بتلایا، میں برابر اپنے اندر ایک خاص قسم کی کشش کی کیفیت محسوس کر رہا تھا اللہ کو نہیں پتا تھا کہ کیا بات ہے اب معلوم ہوا کہ آپ تشریف رکھتے ہیں ۔۔۔ مولانا! قواعد و ضوابط تو ہوتے ہیں لیکن اُن میں استثنارات بھی تو ہوتے ہیں۔۔

(اسی سلسلہ میں ارشاد فرمایا) یہ بھی ایک سنّت ہے کہ آدمی مجمع میں اس طرح بیٹھے کہ پہچانا نہ جائے۔ بعض دفعہ حضور کی خدمت میں باہر سے آنے والے حضرات کو پوچھنا پڑتا تھا کہ "من محمد فیکم" ؟ یا "ایکم محمد" ؟ (آپ لوگوں میں محمد کون ہیں ؟) ایک دفعہ ایک آنے والے نے پوچھا تو حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ نے حضور کی طرف اشارہ کر کے فرمایا "ھذا الابیض المتکئ" "یہ گورے رنگ والے جو ٹیک لگائے بیٹھے ہیں"۔ پھر حدیث کے لفظ "متکئ" کی تشریح کرتے ہوئے فرمایا کہ بعض لوگ "متکئ" کا ترجمہ کرتے ہیں "تکیہ لگائے ہوئے" میرے خیال میں یہ ٹھیک نہیں ہے، اگر وہ مراد ہوتا تو اس کے لیے "متوسدا" کا لفظ زیادہ بہتر تھا ۔۔ متکئ کا صحیح ترجمہ ہے دیوار وغیرہ کسی چیز سے ٹیک لگائے ہوئے ۔۔ (اسی سلسلہ میں فرمایا) ایک دوسری حدیث میں ہے "لا آکل متکئا" مطلب یہ ہے کہ میں کھانے کے وقت کسی چیز سے ٹیک لگا کے نہیں بیٹھتا، یہ کھانے کے ادب کے خلاف ہے۔ کھانے کے لیے، اللہ کے عاجز بندے اور فقیر کی طرح بیٹھنا چاہیے۔ حدیث شریف میں ہے "آکل کما یاکل العبد" یعنی میں ایسے کھاتا ہوں جیسے غلام کھاتا ہے ۔۔ کھانا کھاتے وقت یہ دھیان ہونا چاہیے کہ اللہ تعالیٰ مجھے کھلا رہے ہیں اور میں اُن کے خوان پر کھا رہا ہوں اس لیے پوری عاجزی اور ادب کے ساتھ بیٹھنا چاہیے۔

پھر قریباً آدھا گھنٹہ اور تشریف فرما رہے اور برابر ارشادات اور ملفوظات سے نوازتے رہے اور یہ سیہ کار خصوصیت کے ساتھ مخاطب رہا۔

حضرت کے تشریف لے جانے کے بعد خواجہ صاحب نے مجھ سے شکایت فرمائی کہ آپ ایسے چپکے اور چھپ کے بیٹھے کہ ہم میں سے کسی نے نہیں دیکھا اور نہ پہچانا ــــ حاضرین میں سے متعدد حضرات نے دعائیں دیتے ہوئے فرمایا کہ تمہاری وجہ سے آج مجلس بہت طویل ہوگئی اور استفادۂ ارشادات وملفوظات کا سنا نصیب ہوگیا۔

حضرت حکیم الامت نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں اس عاجز کی یہ آخری حاضری اور آخری زیارت تھی۔

حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی خدمت میں

اللہ کی رحمتیں ہوں مولانا حبیب الرحمٰن لدھیانوی کی روح پر سب سے پہلے انہی سے حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے حالات بار بار سُن کر دل میں حضرت کی عظمت اور عقیدت پیدا ہوئی ___ پھر ۱۹۳۹ء کے اواخر میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی اور ایک دوسرے ایسے ہی ہم مشرب و مسلک اور ہم ذوق دوست الحاج عبدالواحد (ایم۔ اے) کے ساتھ حضرت کی خدمت میں رائے پور پہلی حاضری ہوئی اور دو دن حضرت کی خانقاہ میں قیام رہا جو آبادی اور آبادیوں کے شور و شغب سے الگ جنگل میں واقع ہے، پورا ماحول نہایت شاداب باغات اور سرسبز کھیتوں کا ہے، قریب ہی ندی بہ رہی ہے اس لحاظ سے بھی بڑا دلکش ماحول ہے۔

جیسا کہ معلوم ہے حضرت قدس سرہٗ ایک مشہور شیخ طریقت اور مرشد تھے اور آپ کی شخصیت اور خانقاہ کا یہی خاص موضوع تھا، لیکن ہماری یہ حاضری سلوک و تصوف کی طلب میں نہیں تھی، بلکہ ایک دوسرے مقصد سے

ہم لوگوں نے یہ سفر کیا تھا۔ مگر ہم تینوں ہی حضرت کی شخصیت سے بہت متاثر ہوئے اور ہم نے خانقاہ کی فضا میں بہت ہی غیر معمولی درجہ کا روحانی سکون و سرور محسوس کیا ـــــ اس کے تقریباً ڈیڑھ دو سال بعد مجھے ایک سخت ذہنی اور روحانی صدمہ پہنچا اور شاید اسی کے اثر سے میں بیمار پڑ گیا بیماری نے بہت طول کھینچا، آخر میں میرے ساتھیوں نے مجھے مشورہ دیا کہ میں کچھ دنوں کے لیے کسی ایسی جگہ چلا جاؤں جہاں ذہن پر کسی فکر کا بوجھ نہ پڑے اور روحانی و قلبی سکون و اطمینان کی زیادہ امید ہو ـــــ اس کے لیے میں نے رائے پور کی خانقاہ کو سب سے بہتر مقام سمجھا حضرت قدس سرہٗ کی عنایتوں اور شفقتوں کا ایک دفعہ تجربہ ہو چکا تھا اس لیے بغیر اس کے کہ پہلے خط و کتابت کر کے اجازت حاصل کی جائے میں نے رائے پور جانے کا پروگرام بنا لیا اور حضرت کی خدمت میں حاضر ہو گیا جیسا کہ اندازہ تھا حضرت نے بڑی ہی عنایت اور شفقت کے ساتھ خصوصی مہمان بنا لیا۔ غالباً میں نے پہلے ہی دن اپنی حاضری کی وجہ اور غرض بھی عرض کر دی تھی۔

یہاں اپنا یہ حال بھی عرض کر دوں کہ چونکہ میری تمام تر تعلیم اُن مدارس میں ہوئی تھی جن کے اساتذہ دارالعلوم دیوبند کے فیض یافتہ تھے اور آخر میں دو سال دارالعلوم ہی میں وہاں کے اُن اکابر و اساتذہ کے قدموں میں رہا تھا جو شریعت و طریقت کے جامع تھے، اس لیے ان کے اتباع و پیروی میں دین کے دوسرے شعبوں کی طرح تصوف و سلوک کے بارے میں بھی میرا خیال و فکر وہی تھا جو میں نے اپنے ان اکابر و اساتذہ کا دیکھا اور سمجھا تھا ـــــ لیکن رائے پور کی اس حاضری سے کچھ پہلے بعض

خاص حالات واسباب کی وجہ سے میرے اندر یہ ذہنی تغیر پیدا ہو گیا تھا کہ تصوف کے اصل مقصد اور اس کی روح کو تو میں دین کا ایک ضروری شعبہ سمجھتا تھا لیکن ذکر وشغل وغیرہ کے جو خاص خاص طریقے خانقاہوں میں (ہمارے سلسلہ کی بھی خانقاہوں میں) عام طور سے رائج اور معمول ہیں اُن کو میں صحیح نہیں سمجھتا تھا بلکہ اجتہادی قسم کی غلطی سمجھتا تھا، اس سلسلہ میں یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل تھا کہ قلب میں ان بزرگوں کی جو عظمت تھی اور ادب کا جو رویہ تھا اس میں فرق نہیں آیا تھا ___ بہرحال جب میں رائے پور کی خانقاہ میں کچھ دن قیام کی نیت سے حاضر ہوا ہوں تو میرا یہ حال اور خیال تھا ___ اب آگے سنئے!

غالباً پہلا ہی دن تھا کہ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ مغرب کی نماز سے فارغ ہو کر خانقاہ کے صحن میں ایک پلنگ پر تشریف فرما تھے۔ ازراہ شفقت وعنایت مجھے بھی اپنے ساتھ ہی بٹھا لیا تھا۔ جہاں تک یاد ہے کوئی تیسرا شخص اس وقت وہاں پر نہیں تھا۔ قریب ہی خانقاہ کی مسجد میں چند حضرات "نفی اثبات" کا اور بعض اُن میں "اسم ذات" کا ذکر کر رہے تھے۔ یہ سب اچھے خاصے جہر کے ساتھ ذکر کرتے تھے اور خاص طریقہ سے قلب پر ضرب لگاتے تھے۔ میں جہر وضرب کے اس طریقہ سے اپنے اندر انقباض محسوس کر رہا تھا۔ میں نے ادب واحترام کے ساتھ حضرت کی خدمت میں عرض کیا۔

حضرت! ساری عمر دین کے بارے میں جو کچھ پڑھا ہے اور کتابوں میں جو دیکھا ہے اس سے یہ سمجھا ہوا ہے کہ اصل دین وہی ہے جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اللہ تعالیٰ کی طرف سے لائے

اور جس کی تعلیم آپ نے صحابۂ کرام کو دی اور پھر صحابہ کرام سے بعد والوں نے سیکھا اور جو صحیح نقل روایت کے ساتھ ان سے ہم تک پہنچا اور ـــــ (سہ دری میں ذکر کرتے ہوئے حضرات کی طرف اشارہ کرتے ہوئے میں نے کہا کہ) ـــــ یہ حضرات جس طرح جہر و ضرب کے ساتھ ذکر کر رہے ہیں، جہاں تک اپنا علم ہے نہ تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے صحابہ کرام کو تعلیم فرمایا تھا نہ صحابہ کرام نے تابعین سے اس طریقہ پر ذکر کرایا اور نہ تابعین نے اپنے بعد والوں کو یہ طریقہ بتلایا تھا۔ اس لیے ذکر کے اس طریقہ کے بارے میں مجھے خلجان ہے اور میں چاہتا ہوں کہ میرا یہ خلجان اگر کسی غلط فہمی کی وجہ سے ہو تو اس کی تصحیح اور اصلاح ہو جائے۔"

حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے میری توقع کے بالکل خلاف ایک عجیب انداز میں فرمایا :-

"مولوی صاحب! یہ بچارے جو یہاں میرے پاس آتے ہیں یہ اور کسی کام کے نہیں ہوتے بس اسی کام کے ہوتے ہیں اور اسی کے واسطے آتے ہیں، اس لیے میں ان کو یہی بتلا دیتا ہوں۔ آپ جو کام کرتے ہیں (یعنی تحریر و تقریر سے دین کی خدمت) یہ بہت بڑا کام ہے، آپ تو یہی کرتے رہیں اور اس چکر میں نہ پڑیں۔"

ظاہر ہے کہ یہ میرے سوال کا جواب نہ تھا، لیکن حضرت نے میری بات کے جواب میں اتنا فرمایا اور مجھے کچھ اور عرض کرنے کی ہمت دیئے بغیر

ہندوستانی مسلمانوں کے بعض اجتماعی مسائل اور ان کے مستقبل پر گفتگو کا ایک نیا سلسلہ شروع فرما دیا۔ حضرت کا رویہ دیکھ کر پھر سے اپنے سوال کی طرف توجہ دلانا میں نے مناسب نہ سمجھا اور عشاء کے قریب مجلس ختم ہو گئی۔

اگلے دن مغرب بعد پھر یہی ہوا کہ ذاکرین نے اسی دھن کے ساتھ سہ دری میں اپنا ذکر شروع کیا۔ آج بھی حضرت نے مجھے اپنے ساتھ ہی پلنگ پر بٹھایا تھا۔ مجھ سے پھر نہ رہا گیا اور میں نے کل کا اپنا سوال پھر دوہرایا، لیکن حضرت نے آج بھی وہی کل والا رویہ اختیار فرمایا کہ میری بات کو بالکل نظر انداز فرما کر ہندوستانی مسلمانوں کی ماضی اور حال کی مختلف تحریکوں پر گفتگو کا ایک لمبا سلسلہ شروع فرما دیا اور میرا سوال پھر رہ گیا۔

حضرت کے اس رویے میں اس غلط فہمی میں تو مبتلا نہیں ہوا کہ چونکہ میرے سوال کا کوئی جواب اُن کے پاس نہیں ہے اس لیے یہ اس سے پہلو تہی فرما رہے ہیں بلکہ مجھے یہ خیال ہوا کہ غالباً میرے سوال کو ایک طالب صادق کا سوال نہیں سمجھا گیا بلکہ ایک مبتلائے زعم و کبر کا اعتراض سمجھ کر اس کو اس طرح نظر انداز فرمایا جا رہا ہے اور اس میں شبہ نہیں کہ اس وقت اس سوال سے اپنی تشفی مقصود بھی نہ تھی بلکہ نیت تنقید ہی کی تھی۔

نماز عشاء وغیرہ سے فارغ ہو کر میں خانقاہ کے اُس حجرہ میں جا کر لیٹ گیا جہاں میرے سونے کا انتظام تھا اور تصوف کے اس قسم کے اعمال و اشغال پر خود ہی غور کرنے لگا۔ اس غور و فکر میں خود ہی مسائل

تھا اور خود کی عجیب۔ ذہنی بحث و مباحثہ میں مجھے دیر تک نیند نہیں آئی میں چاہتا تھا کہ اس مسئلہ میں ذہن بالکل یکسو ہو جائے، اگر میرے سوچنے میں کوئی غلطی ہو رہی ہے تو اس کی تصحیح ہو جائے اور اگر میں ٹھیک سمجھ رہا ہوں تو اس بارے میں مجھے ایسا یقین و اطمینان حاصل ہو جائے کہ میں پوری قوت سے ان چیزوں کا رد و انکار کر دوں اور ان باتوں کے غلط ہونے پر ایک سچے حق پرست کی طرح اصرار کر دوں۔

اسی غور و خوض میں دیر کے بعد میرا ذہن اس طرف منتقل ہوا کہ تصوف کے ان خاص اعمال و اشغال کو (مثلاً ذکر و مراقبہ کے ان مخصوص طریقوں کو جو مشائخ کے تجویز کیے ہوئے ہیں اور سنت سے ثابت نہیں ہیں) میرا بدعت و نادرست سمجھنا اگر صحیح ہو تو اس کا لازمی نتیجہ یہ ہوگا کہ حضرت مجدد الف ثانیؒ، حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ اور ان سے بھی پہلے ان جیسے بہت سے حضرات کو مجدد یا مصلح نہیں بلکہ بدعت کا حامی اور رواج دینے والا ماننا پڑے گا کیونکہ ان حضرات نے صرف اتنا ہی نہیں کہ کسی مصلحت یا وقت کے تقاضہ سے ان چیزوں کے بارے میں تسامح اور تساہل ہی برتا ہو۔ بلکہ ان کی تعلیم سے ان کی کتابیں بھری ہوئی ہیں اور ساری عمر اپنے پاس آنے والے طالبین کو انھوں نے ان ہی طریقوں سے ذکر و شغل کرا کے ان کا سلوک طے کرایا ہے بلکہ ان حضرات میں سے اکثر کی زندگی میں جس قدر یہ پہلو نمایاں ہے، غالباً کوئی دوسرا پہلو اتنا نمایاں نہیں۔

ذہن کے اس طرف منتقل ہونے کے بعد دل نے یہ فیصلہ تو جلد ہی کر لیا کہ مجھ جیسے کم فہم اور ناقص العلم کا کسی مسئلہ کے سمجھنے میں غلطی کرنا زیادہ

ممکن اور زیادہ قرین قیاس ہے بہ نسبت اس کے کہ امام ربانی مجدد الف ثانیؒ اور حضرت شاہ ولی اللہؒ، حضرت سید احمد شہیدؒ اور شاہ اسمٰعیل شہیدؒ جیسے اکابر دین کی طرف غلطی کو منسوب کیا جائے۔ اور وہ بھی ایک ایسے فن سے متعلق مسئلہ میں جس کے ساتھ ہمارا تعلق تو صرف نظری اور فکری ہے اور ان حضرات کا ساری عمر اس کے ساتھ گہرا عملی تعلق رہا ہے۔
دل نے اپنے خلاف یہ فیصلہ جلدی اور آسانی سے اس لیے کر لیا کہ ان حضرات کی تصانیف کے مطالعہ اور ان کے حالات اور اصلاحی و تجدیدی خدمات سے کچھ واقفیت کی وجہ سے ان کے رسوخ فی العلم، تفقہ فی الدین اور عنداللہ مقبولیت کا میں پہلے ہی سے پوری طرح قائل تھا اور میرا دل کسی طرح یہ قبول نہیں کر سکتا تھا کہ یہ سب حضرات اپنے اپنے زمانے میں اسرار دین کے عارف اور امت کے مجدد ہونے کے باوجود چند بدعتوں کو قرب خداوندی کا ذریعہ سمجھ کر خود بھی ساری عمر ان میں مبتلا رہے اور اللہ کے ہزاروں لاکھوں بندوں کو بھی ان میں مبتلا کرتے رہے ـــــ یہ صحیح ہے کہ مجدد نبی کی طرح معصوم اور صاحب وحی نہیں ہوتا لیکن وہ بدعات کا داعی اور رواج دینے والا بھی نہیں ہو سکتا۔ خاص کر دین کے جس شعبہ میں اس کو دین کے سب شعبوں سے زیادہ انہماک ہو اور وہ اس کا داعی ہو اور اسی کے ذریعہ صلاح و تجدید کا کام کر رہا ہو اس میں اگر وہ بدعت اور غیر بدعت میں امتیاز نہ کر سکے گا تو وہ یقیناً اصلاح سے زیادہ افساد اور ہدایت سے زیادہ ضلالت کا باعث ہوگا۔
بہر حال یہ چند خیالی نکتے تھے جن تک پہنچ کر میرے ذہن کی الجھن کچھ کم ہوئی اور میں نے مان لیا کہ غالباً مجھ سے ہی اس مسئلہ کو

سمجھنے میں کچھ غلطی ہو رہی ہے اور اب مجھے اپنی ہی غلطی کو پکڑنے اور اسے دور کرنے کی کوشش کرنا چاہیے ـــــ رات کافی گزر چکی تھی، اس نتیجہ پر پہنچ کر میں نے اس غور و فکر کا سلسلہ اُس وقت ختم کر دینے کا ارادہ کر لیا۔ اور سو گیا۔

حضرت پھولپوری قدس سرہٗ کا روزانہ کا معمول تھا کہ فجر کی نماز کے بعد دو تین میل چلتے تھے۔ اس وقت حضرت کے خاص خادم مولانا عبدالمنان صاحب ساتھ ہوتے تھے۔ ایک دن پہلے کی آئی ہوئی ڈاک ان کے ہاتھ میں ہوتی تھی۔ وہ ایک ایک خط حضرت کو سناتے تھے۔ حضرت ہر ایک کا جواب بتلاتے تھے، واپس آ کر وہ یہ جوابات لکھتے تھے ـــــ اس معمول کے مطابق صبح کو فجر کی نماز کے بعد حضرت تشریف لے چلے، مولانا عبدالمنان صاحب بھی ساتھ تھے، میں بھی اُس دن ساتھ ہو لیا۔ تھوڑی دور چلنے کے بعد مولانا عبدالمنان صاحب غالباً حضرت کا کوئی اشارہ پا کر واپس ہو گئے اور میں تنہا حضرت کے ساتھ رہ گیا۔ میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ میں نے جو سوال حضرت سے کیا تھا اس کے بارے میں میں نے خود گزشتہ رات بہت غور کیا۔ میرے دل و دماغ نے یہ تو مان لیا ہے کہ تصوف و سلوک کے ان اعمال و اشغال کے بارے میں اب تک میں نے جو سمجھا ہے غالباً وہ صحیح نہیں ہے اور اس کے بارے میں مجھے ہی کوئی غلط فہمی ہو رہی ہے لیکن میں ابھی تک اس غلطی کو سمجھ نہیں سکا ہوں۔ چونکہ طبیعت طالب علمانہ پائی ہے اس لیے جی چاہتا ہے کہ وہ غلطی معلوم ہو جائے۔

میری یہ بات سن کر حضرت نے مسکراتے ہوئے فرمایا۔
"مولوی صاحب! آپ کو شاید یہی تو شبہ ہے کہ یہ چیزیں بدعت ہیں، یہ بتلائیے کہ بدعت کی تعریف کیا ہے۔"
میں نے عرض کیا، علماء نے بدعت کی تعریف کئی طرح سے کی ہے لیکن جو زیادہ منقح اور محقق معلوم ہوتی ہے وہ یہ ہے کہ دین میں کسی ایسی چیز کا اضافہ جس کے لیے کوئی شرعی دلیل نہ ہو۔
حضرت نے فرمایا۔
"ہاں! ٹھیک ہے۔ لیکن یہ بتلائیے کہ اگر دین میں کوئی چیز مقصود اور مامور بہ ہو اور اللہ و رسول نے اس کا حاصل کرنا ضروری قرار دیا ہو لیکن زمانے کے حالات بدل جانے کی وجہ سے وہ اس طریقہ سے حاصل نہ کی جا سکتی ہو، جس طریقے سے رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانہ میں حاصل ہو جایا کرتی تھی بلکہ اس کے واسطے کوئی اور طریقہ استعمال کرنے کی ضرورت پڑ جائے تو کیا اس نئے طریقے کے استعمال کو بھی آپ "دین میں اضافہ" اور "بدعت" کہیں گے؟ ـــــ (پھر اپنے مقصد کو اور زیادہ واضح کرنے کے لیے فرمایا) مثلاً دین سیکھنا سکھانا ضروری ہے اور اس کا نہایت تاکیدی حکم ہے۔ اور آپ جانتے ہیں کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابہ کرام کے زمانے میں اس کے لیے صرف صحبت کافی ہو جاتی تھی۔ تعلیم کا کوئی مستقل نظام نہیں تھا، نہ مدرسے تھے، نہ کتابیں تھیں، لیکن بعد میں حالات ایسے ہو گئے کہ اس مقصد کے لیے صحبت کافی نہیں رہی

بلکہ کتابوں کی اور پھر مدرسوں کی بھی ضرورت پڑگئی تو اللہ کے بندوں نے کتابیں لکھیں، اور مدرسے قائم کیے اور اس کے بعد دینی تعلیم کا سارا سلسلہ اسی سے چلا۔ تو کیا تعلیم اور تعلّم کے طریقہ میں اس تبدیلی کو بھی دین میں "اضافہ" اور "بدعت" کہا جائے گا؟

میں نے عرض کیا۔۔۔ نہیں دین میں اضافہ جب ہوتا ہے جب کہ مقصود اور امر شرعی سمجھ کر کیا جائے لیکن اگر کسی دینی مقصد کے حاصل کرنے کے لیے قدیمی طریقہ کے ناکافی ہو جانے کی وجہ سے کوئی نیا جائز طریقہ اختیار کر لیا جائے تو اس کو دین میں اضافہ نہیں کہا جائے گا اور نہ وہ بدعت ہوگا۔

حضرت نے فرمایا:۔

"مولوی صاحب! سلوک کے جن اعمال و اشغال پر آپ کو بدعت ہونے کا شبہ ہے اُن سب کی نوعیت بھی یہی ہے۔ ان میں سے کوئی چیز بھی مقصد سمجھ کر نہیں کی جاتی، بلکہ یہ سب اللہ سے وہ تعلق پیدا کرنے کے لیے کرایا جاتا ہے جو دین میں مقصود اور مامور بہ ہے۔

مثلاً یوں سمجھئے کہ اللہ تعالیٰ کی محبت اور اس کی رضا کا دھیان رہنا اور کسی وقت بھی اس کی طرف سے غافل نہ ہونا یہ کیفیتیں دین میں مطلوب ہیں اور قرآن و حدیث سے معلوم ہوتا ہے کہ ان کے بغیر ایمان اور اسلام کامل ہی نہیں ہوتا۔ لیکن رسول اللہ صلعم کے زمانے میں دینی تعلیم و تربیت کی

طرح یا یہاں کیفیتیں بھی آپ کی صحبت ہی سے حاصل ہو جاتی تھیں، اور حضورؐ کے فیضانِ صحبت سے صحابۂ کرامؓ کی صحبتوں میں بھی یہ تاثیر تھی لیکن بعد میں زمانے کے زیادہ بگڑ جانے اور استعدادوں کے ناقص ہو جانے کی وجہ سے اس مقصد کے لئے صحبت کافی نہیں رہی تو دین کے اس شعبہ کے اماموں نے ان کیفیات کے حاصل کرنے کے لیے صحبت کے ساتھ "ذکر و فکر کی کثرت" کا اضافہ کیا اور تجربہ سے یہ تجویز صحیح ثابت ہوئی۔

اسی طرح بعض مشائخؒ نے اپنے زمانہ کے لوگوں کے احوال کا تجربہ کرکے ان کے نفس کو توڑنے اور شہوات کو مغلوب کرنے اور طبیعت میں لینت پیدا کرنے کے لیے ان کے واسطے خاص خاص قسم کی ریاضتیں اور مجاہدے تجویز کیے ــــــ اسی طرح ذکر کی تاثیر بڑھانے کے لیے اور قلوب میں رقت اور یکسوئی پیدا کرنے کے لیے ضرب کا طریقہ نکالا گیا تو ان میں سے کسی چیز کو بھی مقصود اور مامور بہ نہیں سمجھا جاتا بلکہ یہ سب کچھ علاج اور تدبیر کے طور پر کیا جاتا ہے اور اسی واسطے اصل مقصود حاصل ہو جانے کے بعد یہ سب چیزیں چھڑا دی جاتی ہیں اور مشائخؒ اپنے اپنے زمانے کے حالات اور اپنے تجربوں کے مطابق ان چیزوں میں رد و بدل اور کمی بیشی بھی کرتے رہے ہیں بلکہ ایک ہی شیخ کبھی کبھی مختلف طالبوں کے لیے ان کے حالات اور استعداد کے مطابق الگ الگ اعمال و اشغال تجویز کر دیتا ہے، اور اللہ کے بعض بندے ایسی اعلیٰ استعداد والے بھی ہوتے ہیں

جنھیں اس طرح کا کوئی ذکر و شغل کرانے کی ضرورت نہیں پڑتی
اللہ تعالیٰ ان کو یوں ہی نصیب فرما دیتا ہے۔"

حضرت کی یہ تقریر سُن کر میرا وہ ذہنی خلجان دور ہو گیا اور جو کچھ حضرت نے فرمایا اس کو ذہن نے پوری طرح قبول کر لیا، اسی کے ساتھ یہ احساس اور داعیہ پیدا ہوا کہ مجھے بھی اس سے خالی اور محروم نہ رہنا چاہیے۔ لیکن میرے حالات ایسے تھے کہ میں اس کی تحصیل کے لیے زیادہ وقت نہیں دے سکتا تھا۔ اس لیے میں نے حضرت کی خدمت میں بے تکلف اور صفائی سے عرض کیا کہ حضرت اگر یہ ذکر و شغل اس لیے کرایا جاتا ہے کہ اس کے ذریعہ اللہ تعالیٰ کی خشیت و محبت وغیرہ کیفیات حاصل ہوں تو میں بھی اس کا محتاج اور طالب ہوں لیکن میری مجبوری یہ ہے کہ میں زیادہ اور مستقل وقت نہیں دے سکتا کیونکہ دین کے جن دوسرے کاموں سے کچھ تعلق ہے میں ان کو بھی چھوڑنا نہیں چاہتا۔

حضرت نے فرمایا:۔

"مولوی صاحب! تصوف دین کے کام چھڑانے کے لیے نہیں ہے بلکہ اس سے تو دین کے کاموں میں قوت آتی ہے لیکن کیا کیا جائے اللہ تعالیٰ کی مشیت ہے جن کو اللہ نے دین کے کاموں کی اچھی استعداد دی ہے وہ ادھر توجہ نہیں کرتے۔ اگر وہ تھوڑی سی توجہ ادھر کریں تو دیکھیں کہ ان کے کاموں میں کتنی قوت آتی ہے۔ حضرت خواجہ صاحبؒ نے بابا صاحب نے اور بعد میں حضرت مجدد صاحبؒ حضرت شاہ ولی اللہ صاحبؒ

اور حضرت سید صاحبؒ نے ہمارے اس ملک میں دین کی جو کوششیں کیں اور ان کے جو نتیجے نکلے اس میں ان کے اخلاص اور قلب کی اس طاقت کو خاص دخل تھا جو تصرف کے راستے سے پیدا کی گئی تھی ـــــ لیکن اب صورت یہ ہے کہ اس طرف صرف وہی بیچارے آتے ہیں جو بس اللہ اللہ کرنے کے کام کے ہوتے ہیں۔ یہ تو آپ بھی جانتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے بندوں میں استعدادیں مختلف رکھی ہیں، ناقص استعداد کا آدمی اعلیٰ استعداد والوں کا کام نہیں کر سکتا۔

پھر اسی سلسلہ میں حضرت نے فرمایا۔

خدا معلوم لوگ تصرف کو کیا سمجھتے ہیں۔ تصرف تو بس اخلاص اور عشق پیدا کرنے کا ذریعہ ہے اور جو کام عشق کی طاقت سے اور اخلاص کی برکت سے ہو سکتا ہے وہ اس کے بغیر نہیں ہو سکتا۔

میں نے عرض کیا کہ جو شخص پہلے سے کسی دینی کام میں لگا ہوا ہو اور وہ یہ محسوس کرتا ہو کہ اسے عشق اور اخلاص نصیب نہیں ہے تو کیا وہ کسی مدت تک اس کام کو چھوڑ کر پہلے عشق اور اخلاص کی تحصیل میں لگ جائے یا یہ بھی ہو سکتا ہے کہ وہ جو کچھ کر رہا ہے وہ کرتا رہے اور اس کے ساتھ اس کو بھی حاصل کرنے کی کوشش کرے۔

حضرت نے فرمایا۔

"ہاں ہو سکتا ہے۔ البتہ بعض طبائع ایسی ہوتی ہیں کہ انھیں کچھ مدت کے لیے یکسوئی کے ساتھ اسی طرف مشغول ہونے کی ضرورت ہوتی ہے۔

پھر غالباً کسی دوسری صحبت میں میں نے حضرت سے بیعت اور تلقین کی درخواست کی، اس پر فرمایا۔

"مولوی صاحب! حدیث میں ہے المستشارُ مؤتمن
(جس سے مشورہ لیا جائے وہ امین ہے اس کو دیانتداری سے
صحیح مشورہ دینا چاہیے) میں آپ کے لیے یہ بہتر سمجھتا ہوں کہ
اس مقصد کے لیے آپ حضرت دہلوی (یعنی حضرت مولانا محمد الیاس
صاحبؒ) یا حضرت شیخ الحدیث کی طرف رجوع کریں۔ آپ جیسے
اہل علم کے لیے میں ان ہی حضرات کو بہتر سمجھتا ہوں۔

میں نے عرض کیا کہ ان دونوں بزرگوں کی عظمت پہلے سے دل میں ہے لیکن چونکہ مجھ میں یہ طلب حضرت ہی کے ذریعہ پیدا ہوئی ہے اس لیے میں اپنے لیے حضرت ہی سے رہنمائی حاصل کرنا چاہتا ہوں۔

حضرت نے اپنی محبت وشفقت کے پورے اظہار کے ساتھ ایک دو بار پھر انہی دونوں بزرگوں کے بارے میں فرمایا، لیکن جب میں نے ادب کے ساتھ اپنی ہی رائے پر اصرار کیا تو قبول فرمالیا، اور ارشاد فرمایا۔

"جب میں حضرت (یعنی حضرت مولانا شاہ عبدالرحیم رائے پوری
قدس سرہٗ) کی خدمت میں حاضر ہوا اور بیعت کی درخواست کی
تو حضرت نے اس وقت بیعت نہیں فرمایا ذکر کی تلقین فرمادی،
اور ارشاد فرمایا۔ "دیر آید درست آید" آئندہ کسی مناسب وقت
پر بیعت بھی ہو جائے گی۔ میں نے ذکر شروع کر دیا اور پھر دو سال
کے بعد حضرت نے بیعت بھی فرمالیا"

اس کے بعد مجھ سے فرمایا کہ آپ ذکر شروع کر دیں بیعت کی بات پھر

کسی وقت دیکھی جائے گی۔ میں نے اس کے بعد بیعت کے لیے اصرار نہیں کیا۔ ذکر کی تلقین کی درخواست کی۔ حضرت نے میرے حالات و مشاغل کا لحاظ فرماتے ہوئے ذکر وغیرہ کا بہت مختصر سا پروگرام تجویز فرمادیا اور میں نے اسی دن سے وہیں کرنا شروع کر دیا — پھر اس واقعہ کے قریباً دو سال کے بعد بیعت بھی فرمالیا۔

بلاشبہ حضرت کی خدمت میں حاضری اور پھر بیعت کی توفیق اِس بندے پر اللہ تعالیٰ کی ان نعمتوں میں سے ایک عظیم نعمت تھی جن کا شکر ادا کرنے سے یہ بندہ ہمیشہ عاجز و قاصر رہے گا۔

یہاں تک جو کچھ لکھا گیا وہ ۱۹۳۲ء میں حضرت مرشدی نور اللہ مرقدہٗ کی خدمت میں حاضری اور بیعت و سلسلے سے وابستگی ہی کا تذکرہ تھا۔ اس کے بعد قریباً بیس سال حضرت ہماری اس دنیا میں رہے اور یہ عاجز بندہ اللہ تعالیٰ کی عنایت و توفیق سے حضرت کی خدمت میں بار بار حاضر ہوتا رہا، کبھی کبھی طویل قیام بھی نصیب ہوا — مناسب معلوم ہوتا ہے کہ حضرت کے بارے میں اپنے کچھ تجربات اور احساسات و مشاہدات بھی لکھ دیئے جائیں۔

اس عاجز نے جو باتیں خاص طور پر محسوس کیں اور جن سے زیادہ تر متاثر ہوا، ان میں سے ایک تو یہ ہے کہ حضرت کی زندگی میں ہم نے تصوف کے مقصد اور اُس کے مغز کو دیکھا، حضرت کے ہاں ساری فکر اور سارا اہتمام اس مغز اور مقصد ہی کا تھا، رسوم تصوف کے نہ خود پابند تھے نہ دوسروں سے پابندی چاہتے تھے — نسبت اور تعلق مع اللہ کے حصول کے لیے بقدرِ امکان یکسوئی کے ساتھ کثرتِ ذکر و فکر پر تو عموماً زور دیتے تھے اور اس کو گویا اس دروازہ کی کنجی سمجھتے تھے۔ اس کے علاوہ زمانہ کے تغیرات اور لوگوں

کے حالات اور مختلف طبائع کا لحاظ رکھتے ہوئے بالکل مجتہدانہ رہنمائی فرماتے تھے، بہت سوں کے لیے ایک شغل تجویز فرماتے اور بعض دوسروں کو باوجود درخواست کے اس سے منع فرمادیتے تھے۔ مسترشدین اور متوسلین میں سے جو افراد دین وملت کی کسی خدمت میں لگے ہوتے آپ ذکر کے ساتھ اس خدمت ہی کو ان کا خاص شغل اور وظیفہ قرار دے دیتے اور فرماتے کہ بس اخلاص نیت کا اہتمام کرو، یہی وہ اکسیر ہے جو ہر عمل کو عبادت وقربت اور وصول الی اللہ کا وسیلہ بنادیتی ہے۔ مصنفین سے فرماتے کہ جب لکھنے کے لیے بیٹھو تو اللہ تعالیٰ کی طرف متوجہ ہوکر نیت کی تصحیح اور اللہ تعالیٰ سے صواب وسداد کی دعا کرلیا کرو۔ مدرسین سے فرماتے کہ درس شروع کرو تو نیت کی درستی کا اہتمام کرلیا کرو۔ واعظین اور مقررین سے فرماتے کہ جب وعظ وتقریر کا موقع آئے تو اللہ کی رضا اور دین وملت کی خدمت کی نیت کرکے اللہ تعالیٰ سے اپنے اور دوسروں کے لیے دینی نفع کی اور ہر قسم کے زیغ وضلال سے حفاظت کی دعا کرلیا کرو۔ کسانوں، محنت کشوں اور نوکری پیشہ لوگوں سے فرماتے کہ اپنے اور بال بچوں کے لیے حلال روزی کی نیت سے تمہارا محنت کرنا اور کھیتوں میں ہل چلانا بہت سوں کے نوافل سے افضل ہے ــــ ظاہر ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں ایسے ہی متوسع اور صاحب اجتہاد مشائخ، تصوف کی صحیح نمائندگی اور خدمت کرسکتے ہیں، حضرت کی اسی خصوصیت نے تعلق اور فیض کے دائرہ کو بہت وسیع کیا اور اسی وجہ سے امت کے مختلف طبقات کی بہت بڑی تعداد آپ سے دینی نفع اٹھاسکی۔

حضرت کی ایک دوسری خصوصیت جس نے اس عاجز کو بہت متاثر کیا اور جس کا بیس سال مسلسل تجربہ ہوتا رہا، یہ تھی کہ دنیا کے جھمیلوں سے بالکل

بے تعلق اور ایک خانقاہ نشین درویش ہونے کے باوجود دنیوی معاملات کو بھی آپ اتنا بہتر سمجھتے تھے اور اپنے خدام و محبین کے اس قسم کے معاملات میں ان کی طلب پر ایسا صحیح و صائب مشورہ دیتے تھے کہ ان امور کے کسی اچھے سے اچھے تجربہ کار اور دانشمند سے بھی اس سے زیادہ کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ اسی طرح قومی و سیاسی تحریکات اور ملکی معاملات سے بظاہر بالکل بے تعلق ہونے کے باوجود ان کے بارہ میں ایسی متوازن صحیح اور صائب رائے رکھتے تھے جس سے وہ علماء اور زعمائے قوم بھی رہنمائی حاصل کریں جنکی عمریں انھیں میدانوں میں گزری ہیں ـــ لیکن خدام و متوسلین کو بالکل آزادی بھی کہ اس دائرہ میں ان کی جو رائے ہو وہ اس پر قائم رہیں اور عمل کریں۔ اسی لیے اس میدان میں حضرت کے خاص خدام و متوسلین کے خیالات میں بعض اوقات باہم سخت اختلاف اور تضاد بھی ہو جاتا اور بعض خدام کی رائے اور کبھی کبھی عملی سرگرمیاں بھی خود حضرت کے رجحان کے خلاف ہوتیں لیکن اس کی وجہ سے حضرت کی شفقت اور قلبی تعلق میں ذرہ برابر فرق نہ آتا ـــ یہ عاجز اس بارہ میں جتنا غور کرتا ہے اس کو حضرت کی غیر معمولی کرامت سمجھتا ہے، ہم جیسے عام انسانوں کے لیے یہ بات بالکل ناممکن سی ہے۔

اسی طرح ایک خصوصیت اور جو اللہ تعالیٰ نے حضرت کو یہ عطا فرمائی تھی کہ ایک طرف تو "توکل"(۱) اور تبتل کا وہ اعلیٰ مقام حاصل تھا جس سے ارفع مقام کم از کم اپنی آنکھوں نے نہیں دیکھا اور قرآنی وعدہ کے مطابق اس کے نتیجہ میں لَا يَحْتَسِبُ نعمتوں کی موسلا دھار بارش بھی جنگل کی

---

(۱) توکل: صرف اللہ پر اعتماد اور بھروسہ ـــ اور تبتل: سب کٹ کر صرف اللہ سے وابستگی۔

اس خانقاہ پہ دن رات برستی تھی، لیکن اسی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کی حکمت بالغہ کے مقرر کیے ہوئے سلسلۂ اسباب اور انسانی تدبیر و کوشش کے قدرتی نظام کی اہمیت پر بھی بے حد زور دیتے تھے اور زندگی کے کاروبار میں ترک تدبیر اور تعطیل اسباب کے آپ سخت مخالف تھے ___ ۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) میں آپ نے آخری حج فرمایا۔ اس حج کے احوال و واردات کا ذکر کرتے ہوئے بار بار آپ نے یہ واقعہ بیان فرمایا کہ "میں دیکھتا تھا کہ اللہ کے بندے بیت اللہ سے چمٹ چمٹ کے اور اس کا غلاف ہاتھوں میں پکڑ پکڑ کے اور خوب رو رو کے ان باتوں کی دعائیں کرتے تھے جن کے لیے وہ اس عالم اسباب میں امکانی کوششیں بھی نہیں کرتے، ان کا یہ حال دیکھ کر میرے دل سے فوارہ کی طرح یہ بات نکلتی تھی کہ تمہاری ان دعاؤں سے بلا پٹرول اور ڈرائیور کے ایک موٹر تو چل ہی نہیں سکتی ساری دنیا الٹ پلٹ کیسے ہو جائے گی" ___ اپنے اسی مزاج اور اصول کی بنا پر اپنی ذات کے بارہ میں بھی دوا علاج اور پرہیز کا پورا اہتمام فرماتے اور دوسروں کو بھی اسی طرز عمل کی ہدایت اور تاکید فرماتے، لیکن قلب اس یقین سے معمور اور مطمئن رہتا کہ کارساز اور موثر صرف اللہ تعالیٰ کا حکم ہے، مگر اشیاء میں خاصیتیں بھی اللہ تعالیٰ ہی نے رکھی ہیں اور اسی نے تدبیر اور اسباب کے استعمال کا بندوں کو حکم دیا ہے ___ یہ واقعہ ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور صحابۂ کرامؓ اور محققین امت کا توکل ہمیشہ سے یہی رہا ہے، اسباب ہی کو سب کچھ سمجھنا اور ان ہی پر نگاہ رکھنا جیسا کہ آج ہمارا عام حال ہے مقام ایمان کے منافی ہے اور ان کی بنیادی حیثیت کا انکار بھی سنگین غلطی ہے، اعتدال کی راہ ہی صراط مستقیم ہے۔

اللہ کے مقبول بندوں کے الوان مختلف ہوتے ہیں ع: ہر گلے را رنگ و بوئے دیگر است' کسی پر حزن و شکستگی کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر احساس نعمت اور انبساط کا، کسی پر جلال کے آثار زیادہ ہوتے ہیں کسی پر جمال کے کسی پر کسی حال کا غلبہ ہوتا ہے کسی پر کسی دوسری کیفیت کا، مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ پر ___ جہاں تک اس بے علم اور بے بصیرت کا اندازہ ہے ___ "فنائیت" اور "أنا کی نفی" کا غلبہ تھا، انہی آنکھوں نے اس باب میں جو حال حضرت کا دیکھا اس سے آگے کا درجہ اور مقام کے تصور سے بھی کم از کم اس ناچیز کا ذہن تو عاجز ہے۔ بارہا اس کا اظہار فرمایا کہ ہر آنے والے کو میں اس خیال سے بیعت کر لیتا ہوں کہ شاید یہی اللہ کا بندہ میری مغفرت کا ذریعہ بن جائے ___ بہٹ ہاؤس (سہارنپور) کے آخری قیام کے زمانہ میں میرے ایک عزیز مولوی تحسین احمد سنبھلی جو حضرتؒ سے بیعت تھے سنبھل سے حاضر خدمت ہوئے اور انھوں نے اپنے والد ماجد (ایک رشتہ کے میرے بڑے بھائی منشی بشیر احمد صاحب) کا یہ پیام مجھے پہنچایا کہ بینائی سے محرومی کے باعث میں خود سفر کر کے حضرت کی خدمت میں حاضری سے معذور ہوں، تم حضرت کی خدمت میں میری معذوری کا حال عرض کر کے درخواست کرو کہ میری بیعت غائبانہ قبول فرما کر مجھے بھی حضرت اپنے خدام میں شامل فرمالیں! ___ میں نے ایک مناسب وقت پا کر حضرت کی خدمت میں ان کا یہ حال عرض کیا کہ "وہ محکمۂ تعلیم میں ملازم ایک مڈل اسکول کے ہیڈ ماسٹر تھے، اللہ کی توفیق سے اس زمانہ میں بھی بہت دیندار اور خوش اوقات تھے، ایک رات اچانک بغیر کسی خاص تکلیف کے ان کی بینائی چلی گئی اور صبح معلوم ہوا کہ کالا پانی اتر آیا ہے جو لاعلاج سمجھا

جاتا ہے جب لکھنؤ سے سنبھل پر اجلاس ہوا اور میں عیادت و تعزیت کی نیت سے اُن کے پاس گیا تو دیکھا کہ وہ اللہ تعالیٰ کے اس فیصلہ پر دل سے راضی ہیں بلکہ ان کو ایک درجہ میں اس کی خوشی ہے کہ اب میرے مالک نے مجھے ایسا کر دیا کہ ہر طرف سے یکسو ہو کے بس اسی میں مشغول رہوں۔ پھر ان کے جو قابلِ رشک دینی حالات اور معمولات میرے علم میں تھے وہ بھی میں نے حضرتؒ سے ذکر کیے اور آخر میں عرض کیا کہ نابینائی کی مجبوری کی وجہ سے چونکہ حاضری سے معذور ہیں اس لیے حضرتؒ سے غائبانہ بیعت کی درخواست کرتے ہیں ___ حضرتؒ پر اُن کا حال سُن کر رقت طاری ہوگئی اور گلوگیر آواز میں فرمایا " ان کا درجہ بہت اونچا ہے، اللہ کے ایسے بندوں کو بیعت کرنے سے شرم آتی ہے، انھیں اس کی ضرورت بھی نہیں، آپ یہی جواب ان کو لکھ دیں " ___ حضرتؒ نے اس وقت یہ بات کچھ اس طرح فرمائی کہ میں اُس کے بعد کچھ عرض نہیں کر سکا اور خاموش ہو گیا ___ چند منٹ کے بعد حضرتؒ نے خود مجھے طلب فرمایا اور ارشاد فرمایا کہ وہ اللہ کے بہت ہی اچھے بندے ہیں، شاید انہی کا تعلق میری مغفرت کا ذریعہ ہو جائے، آپ انھیں لکھ دیں کہ میں نے ان کا تعلق قبول کر لیا۔

الحمد للہ مجھے حضرتؒ کے کشف و کرامات کا بھی بار بار تجربہ ہوا، لیکن بخدا ہزاروں کشفی کرامتیں اس نعمت عظمیٰ " فنائیت " اور " انا کی نفی " کے برابر نہیں۔ معلوم ہوتا تھا کہ اللہ تعالیٰ نے حضرتؒ کے قلب و باطن کو جاہ کے جذبہ سے بالکل ہی پاک کر دیا تھا ___ وہی جاہ " جس کے متعلق ائمۂ معرفت کا ارشاد ہے کہ " آخر ما یخرج من قلوب الصدیقین حب الجاہ " (یعنی طالبین و سالکین ہی نہیں بلکہ صدیقین کے قلوب سے جو

روحانی بیماری سب سے آخر میں نکلتی ہے وہ حُبِ جاہ کا جذبہ ہے۔)

آخر میں یہ سیہ کار اپنے بارے میں صفائی سے یہ عرض کر دینا ضروری سمجھتا ہے کہ ایسے کامل شیخ سے بیعت اور قریباً بیس سالہ وابستگی اور حضرت کی بے انتہا شفقت وعنایت سے جو حاصل کرنا چاہیے تھا اپنے لاابالی پن اور آرام طلبی کی وجہ سے وہ کچھ بھی حاصل نہ کیا جا سکا۔

تہیدستانِ قسمت را چہ سود از رہبرِ کامل
کہ خضر از آبِ حیواں تشنہ می آرد سکندر را

اور اب جب کہ کبرسنی کے اثر سے اللہ تعالیٰ کی عطا فرمائی ہوئی ظاہری باطنی تمام قوتیں تیزی سے رخصت ہو رہی ہیں اس کی بھی امید نہیں کہ زندگی کے باقی دنوں میں اس تقصیر کی تلافی ہو سکے گی اس لیے اب جو کچھ آسرا ہے ارحم الراحمین کے قانونِ رحمت ہی سے ہے۔ فرمایا گیا ہے " اُولٰٓئِكَ قَوْمٌ لَا يَشْقٰى جَلِيْسُهُمْ " شاید کسی نے اسی کا آزاد ترجمہ کیا ہے۔ ع

میخانہ کا محروم بھی محروم نہیں ہے

حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ

کی خدمت میں

اس سلسلہ میں چند ہی صفحات پہلے ناظرین کرام پڑھ چکے ہیں کہ اس عاجز نے جب مرشدنا حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہ سے بیعت کی درخواست کی تو حضرت ممدوح نے حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ یا شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا زید مجدہم کی طرف رجوع کرنے کا مشورہ دیا، لیکن جب میں نے اس کے بعد بھی اپنی گزارش اور درخواست پر نیاز مندانہ اصرار کیا تو قبول فرمالیا۔[۱] اس کے دو چار دن بعد جب میں حضرت سے رخصت ہو کر جانے لگا تو بڑی شفقت کے ساتھ مجھے حضرت نے تاکید فرمائی کہ حضرت دہلوی کے یہاں زیادہ جایا کرو (حضرت رائے پوری قدس سرہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کو حضرت دہلوی کے ہی لفظ سے یاد فرمایا کرتے تھے) میں نے عرض کیا کہ میں حضرت مولانا محمد الیاس کی خدمت میں حاضر ہوتا رہا ہوں اور میرے دل میں الحمدللہ ان کی عظمت ہے لیکن مجھے حضرت مولانا کے ساتھ کوئی خاص مناسبت نہیں ہو سکی۔ میری زبان سے یہ سن کر حضرت رائے پوری نے ارشاد فرمایا کہ "اللہ کا خاص تعلق

---

[۱] یہ واقعہ ۱۳۶۲ھ کے اواخر یا ۱۳۶۳ھ کے اوائل کا ہے جبکہ راقم سطور حضرت رائے پوری قدس سرہ کی خانقاہ میں بلکہ حضرت کے قریب مقیم تھا، واقعہ کی تفصیل ناظرین گزشتہ صفحات میں پڑھ چکے ہیں۔

بیک وقت بہت سے بندوں سے بھی ہوتا ہے۔ لیکن خاص الخاص تعلق بس کسی کسی کے ساتھ ہوتا ہے۔ فی الحقیقت تو اللہ ہی جانتا ہے کہ کس بندے کے ساتھ اُس کا کیسا تعلق ہے۔ لیکن میرا اپنا خیال ہے کہ اس وقت حضرت دہلوی کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا خاص الخاص تعلق ہے۔

حضرت کی زبان سے یہ کلمات سن کر میں نے ارادہ کر لیا کہ حضرت مولانا الیاسؒ کی خدمت میں حاضری کا انشاء اللہ اب زیادہ اہتمام کروں گا۔

میں رائے پور سے رخصت ہو کر سہارنپور آیا، حضرت شیخ الحدیثؒ کی زیارت وملاقات کی نیت سے مدرسہ مظاہر العلوم پہنچا۔ اس وقت حضرت شیخ ابوداؤد شریف کا سبق پڑھا رہے تھے۔ میں خاموشی سے طلبہ کے ساتھ ایک کنارے بیٹھ گیا اور سبق کی سماعت میں شریک ہو گیا ___ جب سبق ختم ہوا تو ابوداؤد شریف کے طلبائے مخاطب ہو کر حضرت شیخ نے فرمایا کہ میں حضرت چچاجان کی علالت کا آپ لوگوں سے ذکر کر چکا ہوں، آج کے خط سے معلوم ہوا ہے کہ ضعف بہت بڑھ رہا ہے۔ آٹھ دن سے غذا بالکل نہیں ہوئی ہے۔ حضرت چچاجان کی صحت کے لیے آپ سب حضرات دعا کریں (حضرت شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد الیاسؒ کو حضرت چچاجان ہی کہا کرتے تھے) حضرت شیخ الحدیث نے یہ کہہ کر ہاتھ اٹھا کر دعا شروع کی طلبہ نے بھی دعا کی، یہ عاجز بھی دعا میں شریک رہا جب دعا ختم ہوئی تو میں حضرت شیخ کے قریب گیا، سلام ومصافحہ ہوا، میرے دریافت کرنے پر حضرت شیخ نے حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی علالت کی کچھ مزید تفصیل بتلائی۔ میں نے حضرت کی عیادت وزیارت کے لیے اسی وقت دہلی جانے کا ارادہ کر لیا۔ حضرت شیخ الحدیث سے بھی عرض کر دیا، اور اب یاد نہیں رہا کہ اسی دن یا اگلے دن روانہ ہو گیا۔ رات کو عشاء کی نماز کے کافی دیر بعد نظام الدین پہنچا ہوا، مسجد میں دو ایک صاحبان نظر پڑے

جو ابھی سوئے نہیں تھے، غالباً اُن میں کوئی صاحب میرے پہچاننے والے بھی تھے۔ میں نے اُن حضرات سے عرض کر دیا کہ حضرت مولانا اگر جاگ رہے ہوں تو میری حاضری کی اطلاع اس وقت نہ دی جائے میں انشاء اللہ صبح حضرت سے ملوں گا (میرا مقصد یہ تھا کہ میری وجہ سے حضرت کے آرام اور نیند میں خلل نہ پڑے)۔۔۔ اِن حضرات سے اتنی بات کر کے میں عشاء کی نماز پڑھنے لگا۔ جب فارغ ہوا تو اُن میں سے ایک صاحب نے مجھ سے کہا کہ حضرت مولانا جاگ رہے ہیں، اور اُن کو تمھاری اطلاع ہو گئی ہے اور فرمایا ہے کہ نماز سے فارغ ہو کر ابھی میرے پاس آجائیں۔ میں حضرت کے حجرہ میں حاضر ہوا، میں نے بستر ہی پر حضرت سے مصافحہ کرنا چاہا، حضرت نے مصافحہ نہیں فرمایا اٹھ کر بستر سے کھڑے ہو گئے، میرے دونوں ہاتھ جو میں نے مصافحہ کے لیے بڑھائے تھے اپنے دونوں ہاتھوں سے اُن کی کلائی مضبوطی سے پکڑ لی۔ میں نے اصرار سے عرض کیا کہ حضرت کی طبیعت ناساز ہے، حضرت بستر پر آرام فرمائیں، لیٹ جائیں! حضرت نے فرمایا کچھ بیمار نہیں ہوں، تم ہی لوگوں کا بیمار ڈالا ہوا ہوں، آپ کے دین کا کام کرو انشاء اللہ میں اچھا ہو جاؤں گا۔ میں نے عرض کیا کہ میں حاضر ہوں، حضرت لیٹ جائیں آرام فرمائیں، حضرت نے فرمایا وعدہ کرو آؤ گے، وقت دو گے جب تک نہ چھوڑوں گا میں نے عرض کیا کہ میں ابھی حاضر ہوں، جیسے حضرت فرمائیں گے انشاء اللہ وہی کروں گا۔

اُس وقت حضرت مولانا اس قدر کمزور تھے کہ ٹانگیں لرز رہی تھیں۔

جب میں نے حضرت کے فرمانے کے مطابق وقت دینے کا وعدہ کر لیا تو حضرت تکیہ کا سہارا لے کر نیچے فرش پر بیٹھے اور ایک صاحب درد اور صاحبِ حال کی طرح گفتگو فرماتے رہے، کافی دیر کے بعد غالباً میرے باصرار عرض کرنے پر گفتگو کا سلسلہ ختم

فرمایا اور مجھ سے فرمایا اچھا اب آرام کرو انشاء اللہ صبح بات کروں گا۔ میں آکر اُس حجرے میں سوگیا جہاں میرے سونے کا انتظام کیا گیا تھا ــــ صبح کو فجر کی نماز کے بعد بلکہ اشراق کے بعد پھر حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا اور عرض کیا کہ حضرت میں نے ایک ہفتہ کا ارادہ کرلیا ہے۔ حضرت نے فرمایا بہت اچھا، اور دعائیں دیں۔ اُسی کے ساتھ فرمایا کہ اس وقت تو آپ چلے جائیے انشاء اللہ میں اس بیماری سے جلد ہی اچھا ہو جاؤں گا جب میرا کوئی سفر ہوگا تو اطلاع دلواؤں گا اس وقت آپ آجائیں ــــ میں صرف ایک دو دن حضرت کی خدمت میں نظام الدین رہ کر اُس وقت کے اپنے مستقر بریلی واپس آگیا۔

ایک دو دن کے اس مختصر قیام میں مختلف صحبتوں میں حضرت کی جو باتیں سنیں اُن سے اندازہ ہوا کہ اللہ نے اپنے دین کا اور اپنے رسول پاک کی اُمّت کا وہ درد و فکر حضرت مولانا کو دے دیا ہے جس کا غالباً ہزارواں حصہ بھی ہمیں نصیب نہیں۔

میں دہلی ــــ سے بریلی واپس آگیا۔ کچھ مدت کے بعد حضرت مولانا کی طرف سے اطلاع ملی کہ فلاں تاریخ کو میوات میں تبلیغی اجتماع ہے، حضرت مولانا بھی انشاء اللہ تشریف لے جائیں گے اگر ممکن ہو تو اس موقع پر آجانا چاہیے ــــ میں بریلی سے روانہ ہو کر نظام الدین حاضر ہوگیا، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی بھی لکھنؤ سے پہنچ گئے۔ حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے یہ خاص عنایت فرمائی کہ ہم دونوں کو اپنے ساتھ ہی کار میں بٹھایا۔ حضرت پورے راستہ ارشادات فرماتے رہے۔ اس سفر میں اندازہ ہوا کہ حضرت مولانا کو اس سے پہلے جو کچھ سمجھا تھا حضرت کا مقام اُس سے بہت زیادہ بلند ہے۔

رفیق محترم مولانا ندوی نے بھی اپنا یہی احساس اور تاثر بتلایا ــــ اسی سفر میں حضرت کے ارشادات اور ملفوظات پہلی دفعہ قلم بند کیے، بعد میں ایک دوسرے سفر میں حضرت کو سنا کر اس کی تصحیح و توثیق کرانے کا بھی موقع ملا اور وہ پہلی دفعہ "الفرقان" میں شائع ہوئے، پھر بعد میں جب حضرت کے ارشادات و ملفوظات اس عاجز نے کتابی شکل میں مرتب کیے تو اُن کی پہلی قسط غالباً انھیں ملفوظات پر مشتمل ہے، جو میوات کے اس سفر میں قلمبند کیے گئے تھے۔

یہ واقعہ ہے کہ اس سفر میں حضرت کے حال کے مطالعہ اور ارشادات سننے کا جو موقع ملا اس نے ذہن اور طرزِ فکر پر بہت گہرا اثر ڈالا، اور پہلی دفعہ گویا آنکھوں سے دیکھا کہ "دل والوں" اور "دماغ والوں" میں کیا خاص فرق ہوتا ہے۔

اس کے چند مہینے بعد حضرت مولانا نے ایک بڑی "جماعت" کے ساتھ لکھنؤ کا تبلیغی سفر فرمایا۔ راقم سطور کو اس کی بھی اطلاع دی گئی تھی، مقررہ پروگرام کے حساب سے یہ عاجز بھی لکھنؤ پہنچ گیا۔ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں پوری جماعت کا قیام تھا۔ اس جماعت میں مختلف مقامات و طبقات کے جہاں تک یاد ہے، تقریباً اسی افراد تھے۔ تبلیغی جماعت اور اس کے کام کو دیکھنے کا میرے لیے یہ پہلا موقع تھا۔ میں چاہتا تھا کہ کام کو تفصیل سے دیکھ کر اس کے طریقۂ کار اور اصولوں کو سمجھ لوں ــــ جب میں لکھنؤ پہنچا اور حضرت مولانا سے پہلی ملاقات ہوئی اور میں نے عرض کر دیا کہ اس پورے سفر میں ان شاء اللہ ساتھ رہوں گا تو ارشاد فرمایا کہ تم بس میرے ساتھ رہو اور یہ شرط ہے کہ سات دن تک مجھ سے کوئی سوال نہ کرو، بس میری سنتے رہو اور جو کام ہو رہا ہے اُسے دیکھتے رہو

میں نے ایسا ہی کیا ـــ چار دن گزرنے پر میں نے اندازہ کیا کہ جماعت کے کام کو دیکھ کر اور حضرت مولانا کے ارشادات مسلسل سن کر تبلیغی جماعت کے کام اور طریقہ کو میں نے سمجھ لیا اور میرے ذہن میں جو سوالات اور اشکالات تھے اُن سب کا جواب مجھے مل گیا۔

میں نے حضرت کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے جو فرمایا تھا کہ ایک ہفتہ تک کچھ نہ بولو، کچھ نہ پوچھو بس دیکھتے سنتے رہو! مجھے وہ یاد ہے اور میں اُس پر قائم ہوں، لیکن اگر آپ اجازت دیں تو ایک بات عرض کرنا چاہتا ہوں۔ حضرت نے خوشی سے اجازت دی۔ میں نے عرض کیا کہ میں نے یہ سمجھا تھا کہ حضرت نے کوئی بات پوچھنے سے جو منع فرمایا تھا اس کا مقصد یہ تھا کہ میں کام کو سمجھنے سے پہلے اُس کے بارے میں کوئی سوال اور اشکال عرض نہ کروں، تو میں یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اب کوئی سوال و اشکال باقی نہیں رہا، کام اور اس کے طریقے اور اصولوں کے بارے میں الحمدللہ پورا اطمینان ہو گیا ہے اور انشاء اللہ اب دوسروں کو بھی مطمئن کر سکتا ہوں! ـــ حضرت نے فرمایا بس یہی مقصد تھا، اب وہ پابندی ختم۔

لکھنؤ کے اس سفر میں قریباً ایک ہفتہ حضرت کے حکم سے حضرت کے ساتھ ہی رہنا اور اٹھنا بیٹھنا ہوا تو اندازہ ہوا کہ حضرت کا مقام اس سے کہیں بہت بلند ہے جو سہولت کے پچھلے سفر میں ہم نے اندازہ کیا تھا۔ سفر کی اس رفاقت سے سب سے بڑا نفع اپنے کو یہ ہوا کہ دین کی خدمت اور دعوت و تبلیغ جیسے کام میں اخلاص اور صفتِ ایمان و احتساب کا ایک نمونہ دیکھ لیا اور اپنے اندر کم سے کم اس کی حسرت پیدا ہو گئی۔

مرضِ وفات کا آنکھوں دیکھا حال

حضرت مولاناؒ کا یہ سفر رجب ۱۳۶۲ھ کے اواخر میں ہوا تھا، اس سے واپسی کے چند ہی مہینوں کے بعد حضرت مولاناؒ کے اس آخری مرض کا سلسلہ شروع ہو گیا جس کا اختتام ۲۱ رجب ۱۳۶۳ھ کو وصال پر ہی ہوا ــــ حضرت کے وصال سے قریباً ۴ مہینے پہلے (ربیع الاوّل یا ربیع الثانی ۱۳۶۳ھ میں) مرادآباد کے ایک سفر میں جو تبلیغی کام ہی کے سلسلہ میں کیا گیا تھا، بعض ایسے حضرات سے ملاقات ہوئی جو دہلی سے آئے ہوئے تھے اور حضرت مولاناؒ سے عقیدت و محبت اور ان کے تبلیغی کام سے بھی تعلق رکھتے تھے ــــ اُن سے حضرت کی بیماری کی تشویش ناک نوعیت کا اس عاجز کو علم ہوا تو زیارت و عیادت کی نیت سے میں وہیں سے دہلی روانہ ہو گیا ــــ حُسنِ اتفاق جس دن میں نظام الدین پہنچا اس سے کئی دن پہلے سے مخدومنا حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری (قدس سرہٗ) اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہٗ بھی مولاناؒ کی زیارت و عیادت ہی کے لیے وہاں تشریف لائے ہوئے تھے، اور اُسی دن ان حضرات کی واپسی کا پروگرام تھا ــــ حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے روانہ ہوتے وقت مجھے الگ مسجد کے ایک کونے

میں بُلایا اور ارشاد فرمایا کہ ۔

"مولوی صاحب! اور کام تو عمر بھر کروگے اس وقت جتنا بھی ہو سکے یہاں پڑے رہو آج کل یہ بہے میاں ہزاروں میل روز کی رفتار سے جا رہے ہیں۔"

سچی بات یہ ہے کہ میں حضرت کے اس ارشاد کا مطلب تو پوری طرح سمجھ نہیں سکا کیونکہ اُس روحانی پرواز سے خود واقف نہ تھا جس کی طرف حضرت نے اشارہ فرمایا تھا، تاہم میں نے یہ طے کر لیا تھا کہ جب تک حضرت مولانا کی بیماری کا سلسلہ ہے میں انشاء اللہ یہیں رہوں گا اور دو تین ہفتے کے بعد رسالہ الفرقان اور اس کی دفتری ضروریات کی دیکھ بھال کے لیے دو چار دن کے واسطے بریلی چلا جایا کروں گا۔ ؎ پھر یہی معمول رہا۔

جب میں نظام الدین حاضر ہوا ہوں تو حضرت کا ضعف اس درجہ کو پہنچ چکا تھا کہ خود کھڑے بھی نہیں ہو سکتے تھے، دو سے ہی لوگ جن کو اللہ تعالیٰ نے اپنے اس بندے کی خدمت کی سعادت بخشی تھی اٹھا کر کھڑا کرتے اور نماز کے وقت وہی خدام امام کی جگہ مصلّے پر لا کر کھڑا کر دیتے لیکن نہیں معلوم کہ مصلّے پر کھڑے ہونے اور تکبیر تحریمہ کہہ کے نماز شروع کرنے کے بعد کہاں سے قوت آجاتی کہ پوری نماز اچھے خاصے تندرستوں کی طرح کھڑے ہو کر اور ہمیشہ کی عادت کی طرح رکوع و سجود کے ساتھ پڑھاتے کسی سہارے کی بالکل ضرورت نہ ہوتی ۔ لیکن سلام پھیرنے کے بعد فوراً ہی حالت میں ایسا فرق پڑ جاتا کہ سیدھے بیٹھ بھی نہ سکتے اور وہی خدام دیوار سے کر لگا کر بٹھا دیتے۔

؎ الفرقان اس زمانہ میں بریلی سے نکلتا تھا اور اس کی وجہ سے میرا مستقل قیام بریلی ہی تھا۔

پھر اس حالت میں فجر کی نماز کے بعد روزانہ تقریر بھی فرماتے، اور اس تقریر کے دوران پھر قوت سی آجاتی ــــــ یہ واقعہ ہے کہ اگر حضرت کا یہ حال بچشم خود نہ دیکھا ہوتا تو کسی کے بتلانے سے صحیح طور پر کچھ نہ سکتا اور سمجھ لیتا تو یقین نہ آتا کہ ایسا کمزور اور بے جان آدمی اس طرح نماز پڑھ سکتا اور پڑھا سکتا ہے اور اس طرح دل کے پورے جذبے کے ساتھ تقریر کرسکتا ہے۔

کچھ دنوں کے بعد جب ضعف اور زیادہ بڑھ گیا تو خود امامت نہ فرماتے لیکن جب جماعت کھڑی ہوتی اور اقامت کہی جاتی تو خود آپ کو صف اوّل میں کھڑا کردیتے اور آپ امام کی اقتدا میں پوری نماز کھڑے ہوکر ہی ادا کرتے ــــــ پھر جب کچھ دنوں کے بعد ضعف اور زیادہ ہوگیا تو آپ کو صف اول میں بٹھادیا جاتا اور بیٹھ کر نماز ادا کرتے۔

آخری دنوں میں جب بیٹھنے کے قابل بھی نہ رہے تو آپ کے پلنگ کو پہلی صف کے ساتھ لگادیا جاتا اور آپ لیٹے لیٹے جماعت کے ساتھ نماز ادا کرتے، آخری دن تک یہی معمول رہا۔

اس آخری حالت میں بھی دین کی فکر اور مسلمانوں کی دین سے دوری کے درد کا غلبہ اتنا زیادہ تھا کہ جس نے نہیں دیکھا وہ سن کر یا تحریر میں پڑھ کر سمجھ نہیں سکتا ــــــ حالت یہ ہوگئی تھی کہ کمزوری کی وجہ سے اتنی آواز بھی نہیں نکل سکتی تھی کہ قریب کا آدمی سن سکے، بعض خاص خاص خادموں کو اشارہ فرماتے کہ اپنا کان میرے لبوں سے لگادو، جب وہ کان لگا لیتے تو آپ ان سے فرماتے کہ میری طرف سے یہ بات حاضرین سے کہہ دو وہ منہ پر کان رکھ کے بھی کشکل ہی آپ کی بات سمجھ سکتے اور پھر لوگوں کو آپ کا پیام پہنچاتے۔

آپ کے وطن کاندھلہ سے آپ کے بعض اعزہ عیادت اور مزاج پرسی

کے لیے آئے۔ ان سے آپ نے دریافت کیا کہ آپ لوگ کیوں آئے ہیں؟ انھوں نے کہا کہ آپ کی خیریت اور خبر لینے آئے ہیں ـــــ آپ نے فرمایا کہ جو مرنے اور مٹنے ہی کے لیے ہے اس کی خبر اور خیریت لینے کے لیے اتنی دور سے آئے ہو اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا لایا ہوا دین عزیز مٹ رہا ہے اس کی خبر لینے کی کوئی فکر نہیں۔

کسی حکیم یا ڈاکٹر کو علاج کے لیے بلانے کی اجازت تب ہی دیتے جبکہ یہ اطمینان ہوتا کہ ان سے دین کی بات کہی جاسکے گی اور ان کو دعوت دی جاسکے گی۔

بیماری کے آخری مرحلے میں (جہاں تک یاد ہے وصال سے قریباً دو ہفتے پہلے) حضرت مولانا مفتی کفایت اللہ صاحبؒ ڈاکٹر شوکت اللہ صاحب انصاری کو لے کر گئے (جو اس وقت دلی کے ممتاز ڈاکٹروں میں تھے) ان کے ساتھ ایسے ہی ایک دوسرے بڑے ڈاکٹر اور بھی تھے ـــــ حضرت کو اطلاع دی گئی۔ فرمایا کہ جب وہ مجھے دیکھنے کے لیے میرے پاس آئیں تو ان کے بیٹھنے کا انتظام ایسا کرو کہ وہ آکر فوراً ہی مجھے دیکھنے نہ لگیں، میں پہلے اُن سے اپنی بات کہوں گا، اس کے بعد وہ مجھے دیکھیں ـــــ چنانچہ ایسا ہی انتظام کیا گیا ـــــ حضرت مفتی صاحب اور دونوں ڈاکٹر صاحبان اندر حجرہ میں جہاں حضرت کا پلنگ تھا، تشریف لائے اور پلنگ سے ذرا فاصلہ پر ان حضرات کے لیے جو قالین بچھوایا گیا تھا، اُس پر بیٹھ گئے۔

حضرت نے انتہائی کمزور آواز میں ڈاکٹر صاحبان کو مخاطب کر کے فرمایا۔

"ڈاکٹر صاحب آپ کے پاس ایک فن ہے جس سے مخلوق استفادہ کرتی ہے اور میں نے اس فن میں آپ کی تعریف سنی ہے۔ لیکن

یہ وہ فن ہے جس کو نافذ کرنے کے لیے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو چند ظاہری معجزے (مادر زاد اندھوں اور کوڑھیوں کو اچھا کردینا اور مُردوں کو زندہ کردینا) دے کر بھیجا گیا تھا۔ اور یہ تو آپ جان سکتے ہیں کہ حضرت عیسیٰ علیہ السلام کو جو روحانی علوم دیئے گئے تھے وہ ان ظاہری معجزوں سے بدرجہا اعلیٰ اور افضل تھے۔۔۔ تو مجھے آپ سے یہ کہنا ہے کہ ہمارے حضرت خاتم الانبیاء صلی اللہ علیہ وسلم کے ذریعہ جو روحانی علوم اور دینی احکام بھیجے گئے ہیں وہ وہ ہیں جنھوں نے حضرت عیسیٰ علیہ السلام کے روحانی علوم اور ان کی لائی ہوئی شریعت کو غیر چلن دار کردیا۔ تو ذرا سوچئے کہ حضورؐ کی لائی ہوئی ان روحانی چیزوں کی طرف توجہ نہ کرنا کتنی بڑی چیز کی ناقدری ہے۔۔۔ لوگوں سے ہم بس یہی کہتے ہیں کہ وہ اس نعمت سے فائدہ اٹھائیں ورنہ بڑے گھاٹے میں رہیں گے۔

حضرت نے جب اپنی یہ بات پوری فرمالی تو ڈاکٹر صاحبان کو طبّی معائنے کا موقع دیا۔ ان حضرات نے اپنے طریقے پر خوب اچھی طرح دیکھا بھالا۔۔۔ حجرے سے باہر آکر ان دونوں حضرات نے آپس میں انگریزی زبان میں کچھ گفتگو کی۔ اس کے بعد ڈاکٹر شوکت اللہ انصاری صاحب نے حضرت مفتی صاحب سے کہا کہ ہم دونوں اس پر گفتگو کررہے تھے کہ ہمارے فنّی اور طبّی حساب سے تو اس شخص میں کچھ بھی نہیں رہا ہے پھر یہ شخص بولتا کہاں سے ہے۔ ہم اس کے سوا کچھ نہیں کہہ سکتے کہ یہ بات ہمارے فن سے بالاتر ہے، کوئی روحانی طاقت ہے جس سے یہ شخص زندہ ہے اور بول رہا ہے۔

واقعہ یہ ہے کہ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کی اس آخری بیماری میں حضرت کی خدمت میں قیام کی جو توفیق ملی یہ اس گنہگار بندہ پر اس کے رب کریم کی خاص الخاص نعمت تھی۔ دین کی بہت سی حقیقتیں جو کتابوں کی عبارتوں سے پوری طرح سمجھ میں نہیں آسکتی تھیں حضرت کا حال دیکھ کے الحمدللہ کچھ سمجھ میں آگئیں۔ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور خواص امت کے احوال کا سمجھنا کچھ آسان ہوگیا۔

میرے ایک دوست اور دورۂ حدیث کے ہم سبق عالم دین، جو کتب تصوف کے مطالعہ کا بھی ذوق رکھتے تھے، انھوں نے سنایا کہ ایک دفعہ میں نے تصوف کی ایک کتاب کا نام لے کر حکیم الامت حضرت تھانویؒ کی خدمت میں عرض کیا کہ حضرت نے وہ کتاب تو ملاحظہ فرمائی ہوگی؟

حضرت نے ارشاد فرمایا:—

"مولانا! میں نے کتب زیادہ نہیں دیکھیں، ہاں ایک قُطب دیکھا ہے۔"

اس سے حضرت کا اشارہ اپنے مرشد حضرت حاجی امداد اللہ مہاجر مکی قدس سرہٗ کی طرف تھا۔ سبحان اللہ! کس قدر بلیغ اور کیسا حقیقت افروز ارشاد ہے۔

حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے ایک خاص رفیق اور نیازمند

حاجی عبدالرحمٰن صاحب نومسلم

اسلام کا ایک معجزہ

حاجی صاحب نے اپنے اسلام لانے کا عجیب و غریب واقعہ بڑی تفصیل کے ساتھ اس عاجز کو خود سنایا تھا۔ میرا خیال ہے کہ مجھے وہ واقعہ جوں کا توں یاد ہے اور میں قریباً بیس سال کے بعد اس وقت اُس کو حافظہ ہی سے لکھ رہا ہوں۔

حاجی صاحب میوات کے ایک بڑے اور مشہور گاؤں "آماوز" کے ایک دولت مند بنئے کے بیٹے تھے۔ ان کا نام سکندر رام تھا۔ انھوں نے بتایا کہ "میری عمر ۱۱-۱۲ سال کی تھی، میں گاؤں کے اسکول میں پڑھتا تھا اور پڑھائی میں بہت تیز تھا۔ میرے ساتھ مسلمان لڑکے بھی پڑھتے تھے، میں نے گاؤں کے مسلمانوں سے اور ساتھی لڑکوں سے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا ذکر اور آپ کا نام پاک سنا تھا۔ اس سے میرے دل میں حضورؐ کے ساتھ ایک محبت سی پیدا ہو گئی تھی۔ میرے باپ کی دکان تھی جو گاؤں میں خوب چلتی تھی۔ ایک رات میں نے خواب میں دیکھا کہ میں اپنی دکان پہ ہوں، باپ نہیں ہیں میں ہی ان کی جگہ بیٹھا سودا بیچ رہا ہوں۔ گاؤں کی کچھ عورتیں جن میں میری رشتہ دار

بھی ہیں سودا لینے کے لیے دکان پر کھڑی ہیں اور میں سودا دے رہا ہوں۔ اتنے میں معلوم ہوا کہ مسلمانوں کے پیغمبر صاحب کی سواری آ رہی ہے۔ میں ان کے درشن کے لیے دکان چھوڑ کر جانے لگا، ان عورتوں نے مجھے نہیں جانے دیا اور کہا کہ مکندا! پہلے ہمیں سودا دے دے پھر کہیں جا۔ میں نے جلدی جلدی ان کو نپٹانا چاہا، ابھی نپٹا نہیں سکا تھا کہ معلوم ہوا کہ حضرت کی سواری آگئی اور بہت مجمع ہے۔ میرے ہاتھ میں سودا تولنے کی جو ترازو تھی میں نے اس کو زمین پر پٹک دیا اور حضور کو دیکھنے کے لیے دکان چھوڑ کر بھاگ پڑا، مگر جب میں پہنچا تو آپ کی سواری آگے بڑھ چکی تھی، اور میں چہرۂ مبارک نہیں دیکھ سکا، پیچھے کی جانب سے بس گردن دیکھ پایا اسی سے دل میں ایک عجیب عشق کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ـــــ آنکھ کھلی تو دل میں وہی کیفیت تھی، میں نے گھر میں کسی سے ذکر نہیں کیا اور دل میں طے کر لیا کہ میں مسلمان ہو جاؤں گا۔ صبح کو اسکول گیا لیکن لکھنے پڑھنے میں بالکل جی نہیں لگا۔ رات جو خواب دیکھا تھا بیٹھے بیٹھے بس اسی کو سوچتا تھا۔ جو پنڈت جی پڑھاتے تھے انھوں نے دیکھا تو کہا، مکندا! آج کیا بات ہے کیوں گم سم بیٹھا ہے، پڑھتا کیوں نہیں؟ میں نے انھیں بتایا کہ آج میں نے ایسا سپنا (خواب) دیکھا ہے، انھوں نے مجھے ڈانٹا اور کہا کہ جا اپنی جگہ بیٹھ اپنا کام کر۔ میں اپنی جگہ آ کر بیٹھ گیا۔ پنڈت جی نے سلیٹ ہاتھ میں لے کر نجومیوں کے طریقہ پر کچھ حساب لگایا، تھوڑی دیر کے بعد مجھے اپنے پاس بلایا اور پوچھا مکندا ذرا پھر بتا تو نے رات کیا سپنا دیکھا ہے؟ میں نے جو کچھ دیکھا تھا وہ انھیں پھر بتایا، انھوں نے پھر مجھے ڈانٹا اور کہا جا اپنی جگہ بیٹھ اپنا کام کر۔ میں آ کے بیٹھ گیا، پنڈت جی نے پھر سلیٹ پر اپنا کچھ حساب لگایا اور کچھ دیر

کے بعد مجھے پھر بلایا اور رات کے خواب کو پھر پوچھا اور جب میں نے بتایا تو پھر مجھے خوب ڈانٹا۔ کئی دفعہ ایسا ہی ہوا۔ جب اسکول کی چھٹی کا وقت آیا تو پنڈت جی میرے ساتھ ہمارے گھر آئے اور میرے باپ کو الگ بلا کے کہا کہ ایسا لگتا ہے کہ تیرا بیٹا مکندا مسلمان ہوگا۔ مجھے اس وقت کچھ معلوم نہیں ہوا کہ پنڈت جی نے میرے باپ سے کیا کہا لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوگیا۔ باپ نے میری ماں کو بھی بتا دیا۔ وہ دونوں بہت فکرمند اور پریشان ہوگئے، میرا اسکول جانا بھی بند کر دیا گیا۔ مگر میں نے دل میں طے کرلیا کہ جو کچھ بھی ہو مجھے مسلمان ہونا ہے۔ اب میں دل ہی دل میں سوچنے لگا کہ مجھے کیا کرنا چاہیے اور کہاں چلا جانا چاہیے۔ میں اسی ٹوہ اور فکر میں رہتا تھا۔ میں نے کچھ مسلمانوں سے ذکر سنا تھا کہ دہلی کے پاس ایک بستی ہے "نظام الدین" وہاں ایک بنگلہ والی مسجد ہے، اس میں ایک میاں صاحب رہتے ہیں، بڑے نیک اور اللہ والے آدمی ہیں، جو کوئی ان کے پاس جائے وہ اس کو اپنے پاس رکھ کر پڑھاتے بھی ہیں اور کھلاتے پلاتے بھی ہیں۔ میں نے انہی کے پاس جانے کا ارادہ کرلیا۔ چپکے چپکے راستہ کی معلومات حاصل کرتا رہا۔ پھر ایک دن موقع پا کر گھر سے ایک رقم لے کر نکل گیا اور کسی طرح نظام الدین کی اس مسجد میں پہنچ گیا۔ گھر اور گاؤں والوں کو بالکل خبر نہ ہوئی کہ میں کہاں گیا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ ماں باپ بہت دنوں تک روتے رہے۔

یہ بزرگ، حضرت مولانا محمد الیاسؒ کے سب سے بڑے بھائی حضرت مولانا محمد صاحبؒ تھے، انھوں نے بڑی شفقت سے رکھا، پڑھایا اور وہی میرے باپ اور میری ماں بن گئے اور میں بھی انہی کا ہوگیا۔ ان کی وفات کے بعد یہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) یہاں آگئے اُس وقت سے انہی کے ساتھ

ہوں — میں جو رقم گھر سے ساتھ لایا تھا میں نے بہت دنوں تک حضرت مولانا محمد صاحبؒ سے بھی اس کا ذکر نہیں کیا پھر ایک دن بتا دیا — میں بنئے کا بیٹا تھا جب کوئی نفع کا کام سامنے آیا میں نے وہ رقم اس میں لگادی، اللہ نے بہت برکت دی، جس کام میں لگائی بہت نفع ہوا۔ اللہ کی توفیق سے اُس کی راہ میں خرچ بھی کرتا رہا۔"

حاجی صاحب غیر مسلموں میں (غالباً زیادہ تر میوات ہی کے علاقہ میں) ذاتی اور انفرادی طور پر کام کرتے تھے، اللہ تعالیٰ نے اُن کی دعوت اور انکی ذات میں بھی بڑی تاثیر اور کشش رکھی تھی۔ راقم سطور کو انھوں نے خود بتلایا تھا کہ اب تک ان کے ذریعہ قریباً ۱۴۰ سو (۱۴۰۰) آدمی اللہ تعالیٰ کی توفیق سے اسلام قبول کر چکے ہیں — کسی نے یہ بھی بتلایا تھا کہ میوات ہی میں کسی مقام پر انھوں نے ایک خاص طرح کا مدرسہ بھی قائم کر رکھا تھا جس کے مصارف کے وہ خود ہی ذمے دار تھے، جو لوگ اسلام قبول کرتے اُن کی ضروری تعلیم و تربیت کا بھی اس مدرسہ میں کچھ انتظام تھا۔

وہ وعظ بھی فرماتے تھے، ان کا وعظ خاص کر میواتیوں کے لیے بڑا دلچسپ ہوتا تھا۔ بدعات اور مشرکانہ رسوم کی اصلاح ان کے وعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا، میوات ہی کے ایک جلسہ میں راقم سطور نے بھی ایک دفعہ اُن کا وعظ سنا تھا۔

اُن کے اوقات کا زیادہ حصہ تنہائی اور ذکر و عبادت میں گزرتا تھا، اُن کے کسی خاص محرم راز اور واقف حال نے مجھے بتلایا تھا کہ حاجی صاحب کو ستّرہ پارے قرآن پاک کے حفظ ہیں اور روزانہ نوافل میں ان کے پڑھنے

کا معمول ہے۔ ذکر و عبادت کا نور آنکھوں میں اور چہرہ پر صاف محسوس ہوتا تھا۔

ان کے جاننے والوں اور ان سے تعلق رکھنے والوں کے نزدیک انکی سب بڑی خصوصیت یہ تھی کہ وہ مستجاب الدعوات تھے۔ حضرت مولانا محمد الیاسؒ بھی اہم امور میں اُن سے خاص طور سے دعا کرایا کرتے تھے ۔ ان کے حلقۂ تعارف میں ان کی قبولیت دعا کے غیر معمولی قسم کے بہت سے واقعات مشہور تھے۔ ایک واقعہ کسی سلسلۂ کلام میں انھوں نے راقم سطور کو خود سنایا۔ فرمایا کہ

"فلاں گاؤں کے لوگ بڑے جاہل اور بدعات و خرافات میں مبتلا تھے اور دین کی بات اور نصیحت سننے کو بھی تیار نہ ہوتے تھے۔ میں بار بار اس گاؤں گیا لیکن اُن پر کوئی اثر نہیں ہوا۔ اس گاؤں میں کنوئیں کا پانی بہت کھاری تھا۔ پینے کا پانی دور سے لانا پڑتا تھا ـــــ ایک دفعہ میں اس گاؤں میں گیا۔ وہاں کے لوگوں نے کہا کہ دیکھو حاجی! ہمارے کنوئیں کا پانی کڑوا ہے ہم چاہتے ہیں کہ دوسرا کنواں دوسری جگہ کھودیں، تو دعا کر کہ پانی میٹھا نکل آئے تو ہم سب تیری بات مان لیں گے ـــــ میں نے اپنے اللہ کے بھروسے پر اُن سے کہا کہ تم جگہ تجویز کرو اور بتاؤ کہ کہاں کنواں کھودنا چاہتے ہو۔ انھوں نے آپس میں مشورہ کر کے گاؤں سے باہر جگہ طے کی، میں نے ان سے کہا کہ اب جاؤ کل صبح کھودنا شروع کیجیو۔ رات کو میں نے اسی جگہ مصلّیٰ ڈالا اور نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی ـــــ صبح کو میں نے ان سے عہد لیا کہ اگر اللہ ان کو کنوئیں سے میٹھا پانی دے گا تو وہ نماز پڑھا کریں گے اور کھدائی شروع ہوئی۔ سب سے پہلے پھاوڑا ہاتھ میں لے کر کھدائی میں نے شروع کی۔ پھر سارا گاؤں جٹ گیا۔ جب کھدائی پانی کے قریب تک پہنچ گئی

تو میں نے ان سے کہا کہ اب تم سب اوپر نکل آؤ، وہ سب آگئے اور میں نیچے اتر گیا میں نے دو رکعت نماز پڑھی اور اللہ سے دعا کی اور عرض کیا کہ کھاری پانی بھی تیرے ہی حکم سے نکلتا ہے اور میٹھا بھی تو ہی نکالتا ہے۔ اور تجھے پوری قدرت ہے کہ جہاں سے چاہے کھاری یا میٹھا نکالے۔ اے میرے اللہ اس وقت تو اس جگہ سے میٹھا ہی پانی نکال دے۔ یہ دعا کر کے اللہ کے کرم سے پوری امید رکھتے ہوئے میں نے زمین پر پھاوڑا مارا فوراً ہی پانی نکلا میں نے دونوں ہاتھوں میں لے کر پیا، الحمد للہ میٹھا نکلا پھر میں نے شکر کے نفل پڑھے اور گاؤں والوں سے کہا کہ اللہ تعالیٰ نے میٹھا پانی نکال دیا اب کھود لو۔ سب نے پانی پی کے دیکھا پھر وہاں کے لوگ دین کی بات سننے اور ماننے لگے۔"

حاجی عبد الرحمٰن کی قبولیت دعا کا ایک واقعہ اور قابل ذکر ہے جس کا تعلق خود اس عاجز راقم سطور کی ذات سے ہے ــــ حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات اب سے قریباً ۴۴ سال پہلے رجب ۱۳۶۳ھ میں ہوئی، وفات کے اگلے ہی دن میوات کے کسی گاؤں میں تبلیغی اجتماع تھا جو پہلے سے طے شدہ تھا۔ تبلیغی کام سے تعلق رکھنے والے جو اکابر یا احباب حضرت کی وفات کی وجہ سے نظام الدین میں جمع تھے قریب قریب وہ سب ہی اس اجتماع میں شرکت کے لیے میوات گئے۔ یاد پڑتا ہے کہ کئی لاریاں بھر کے گئی تھیں۔ ان جانے والوں میں راقم سطور بھی تھا، جب وہاں سے واپسی ہونے لگی تو حاجی عبد الرحمٰن صاحب نے اصرار کر کے مجھے اپنے ساتھ ایک بیل گاڑی میں بٹھا لیا، یہ گاڑی کسی میواتی کی تھی جو حاجی صاحب کا معتقد تھا۔ گاڑی والے میواتی کے علاوہ اُس پر صرف حاجی صاحب تھے اور یہ راقم سطور۔ جب گاڑی چل پڑی تو حاجی

صاحب نے فرمایا کہ مجھے تم سے ایک بات تنہائی میں پوچھنی تھی، اس لیے میں نے تمہیں زبردستی بیل گاڑی میں بٹھایا ہے اور تکلیف دی ہے، تنہائی کا ایسا اطمینان کا موقع ملنا بہت مشکل تھا ـــــ اس کے بعد حاجی صاحب نے فرمایا۔

"کوئی دو ڈھائی برس پہلے کی بات ہے، گرمی کا موسم تھا، ٹھیک دوپہر کا وقت تھا، میں کھانے وغیرہ سے فارغ ہو کے اپنی عادت کے مطابق حجرے کے کواڑ بند کر کے سونے کے ارادے سے لیٹ گیا تھا کہ حضرت جی (حضرت مولانا محمد الیاسؒ) نے دروازہ پر دستک دی اور آہستہ سے فرمایا کہ حاجی عبدالرحمٰن اگر تم جاگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو مجھے تم سے ایک ضروری بات کرنی ہے" میں اگرچہ جاگ رہا تھا ابھی سویا نہیں تھا، لیکن میں نے دروازہ نہیں کھولا اور کچھ بولا بھی نہیں، تاکہ وہ واپس جا کر اس وقت آرام کر لیں، بات تو پھر بھی ہو جائے گی ـــــ میں نے سوچا اگر میں دروازہ کھول دوں گا تو یہ دیر تک باتیں کریں گے اور پھر ان کے آرام کا وقت نہیں رہے گا، تو میں نے اُن کے آرام کے خیال سے نہ دروازہ کھولا نہ کوئی جواب دیا ـــــ حضرت جی نے تھوڑا انتظار فرما کے پھر وہی کہا کہ "حاجی عبدالرحمٰن اگر تم جاگ رہے ہو تو دروازہ کھول دو مجھے تم سے بہت ضروری بات کرنی ہے" ـــــ میں نے اس کے بعد بھی دروازہ نہیں کھولا اور کوئی جواب نہیں دیا تاکہ وہ واپس چلے جائیں اور اپنے حجرہ میں آرام کر لیں ـــــ لیکن وہ اس کے بعد بھی واپس نہیں گئے اور تھوڑی دیر کے بعد پھر وہی فرمایا ـــــ میں نے مجبور ہو کر دروازہ کھول دیا اور اُن سے کہا کہ میں جاگ تو رہا تھا لیکن میں اس لیے نہیں بولتا تھا کہ آپ اس وقت باتیں شروع کریں گے تو آرام نہیں کر سکیں گے، بات تو آرام کرنے

کے اور ظہر کے بعد بھی ہو سکتی تھی۔ حضرت نے فرمایا کہ میرے دل میں یہ تقاضا تھا کہ تمھیں اٹھا کے ابھی بات کروں ـــــ اس کے بعد حضرت جی نے تمھارا (راقم سطور محمد منظور نعمانی) کا نام لے کر فرمایا کہ اُن کو جانتے ہو؟ میں نے کہا مجھے تو یاد نہیں۔ فرمایا وہ جن کا بریلی سے رسالہ نکلتا ہے اور وہ بدعات کا اور اہل بدعات کا رد کرتے ہیں ـــــ میں نے کہا ہاں ان کو تو جانتا ہوں۔ فرمایا وہ ایک غلط جگہ چلے گئے ہیں، اسی وقت ان کے لیے دعا کرنی ہے کہ اللہ تعالیٰ ان کو وہاں سے نکال لے ـــــ پھر حضرت مجھے ساتھ لے کر اپنے حجرے میں تشریف لے گئے۔ مجھے ساتھ کھڑا کر کے پہلے دو رکعت نماز پڑھی، پھر مجھ سے فرمایا کہ اُن کے لیے اللہ سے دعا کرو اور اللہ سے مانگو، خود بھی دعا فرمائی۔

یہ پورا واقعہ بیان کر کے حاجی صاحب نے مجھ سے فرمایا کہ مجھے کچھ معلوم نہیں کہ تمھارا کیا قصہ تھا اور تم کہاں گئے تھے، میں نے حضرت جی سے پوچھا بھی نہیں ـــــ اگر تم بتا سکو اور بتانا مناسب سمجھو تو بتلاؤ کہ تم کہاں گئے تھے جس کی حضرت جی کو اتنی فکر تھی۔

میں نے اُن کی بتلائی ہوئی مدت اور موسم کا حساب لگایا تو اندازہ ہوا کہ غالباً یہ وہ زمانہ تھا جب میں "جماعت اسلامی" کے ایک اساسی رکن کی حیثیت سے اُس کے اُس وقت کے مرکز اور مستقر (دارالاسلام جمال پور ضلع سرگودھا) میں جا کر مولانا سید ابوالاعلیٰ مودودیؒ وغیرہ چند رفقاءِ جماعت کے ساتھ مقیم ہو گیا تھا۔

وہاں پہنچ کر چند ہی روز کے بعد میرے قلب کی جو ایک خاص کیفیت ہو گئی تھی اور جس شدید اندرونی کشمکش میں میں مبتلا ہو گیا تھا (جس کے

نتیجہ میں بالآخر چند ہی مہینے کے بعد میں جماعت سے مستعفی بھی ہو گیا (جس کے کچھ ظاہری اسباب و وجوہ بھی تھے[1]) ____ لیکن حاجی عبدالرحمن صاحب سے مذکورۂ بالا واقعہ سن کر دل میں یہ یقین سا پیدا ہو گیا کہ میری اس قلبی کیفیت اور اندرونی کشمکش میں اصل عامل ان دونوں بزرگوں کی یہ دعا تھی ____ واللہ اعلم عنداللہ تعالیٰ۔

یہاں یہ بات خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جس زمانہ کا یہ واقعہ حاجی عبدالرحمن صاحب نے بیان فرمایا اُس وقت تک حضرت مولانا محمد الیاس صاحبؒ سے میرا کوئی خاص تعلق نہیں تھا اور ان کے تبلیغی کام سے تو بالکل ہی تعلق نہیں تھا بلکہ میں اس کی صحیح نوعیت کو جانتا بھی نہیں تھا۔ اُن کے ساتھ اور ان کے تبلیغی کام کے ساتھ مجھے کسی درجہ کا جو تعلق نصیب ہوا وہ بعد کا واقعہ ہے۔

حاجی صاحب کے سلسلہ میں ایک یہ بات بھی قابل ذکر ہے کہ بعد میں انھوں نے اپنے گاؤں اور اپنے خاندان والوں سے رابطہ قائم کر لیا تھا، برابر آنا جانا رہتا تھا اور وہ ہمیشہ کوشش کرتے رہے کہ اُن کے خاندان والے اسلام قبول کر لیں۔ راقم سطور کو معلوم نہیں کہ ان میں سے کسی کو قبول اسلام کی توفیق ہوئی یا نہیں لیکن یہ خود اپنی آنکھوں سے دیکھا کہ اُن کے اہل خاندان غیر مسلم، ان کا بڑا احترام اور اکرام کرتے تھے ____ غالباً اسی سفر میں جو حضرت مولانا محمد الیاسؒ کی وفات کے اگلے ہی دن میوات کے کسی گاؤں میں اپنے

---

[1] اس قصہ کی پوری تفصیل اور جماعت اسلامی سے میری علیحدگی کے اسباب و عوامل کی تفصیلات کیلئے راقم سطور کی کتاب "مولانا مودودی کے ساتھ میری رفاقت کی سرگزشت اور اب میرا موقف" ملاحظہ فرمائی جائے۔

والے تبلیغی اجتماع کی شرکت کے سلسلہ میں ہوا تھا، جس میں حضرت شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ اور شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا مدظلہ جیسے اکابر بھی شریک ہوئے تھے (غالباً اسی سفر میں) حاجی عبدالرحمٰن صاحب کے گاؤں انادر بھی جانا ہوا تھا تو حاجی صاحب کے خاندان کے لوگ (جن کے بارہ میں معلوم ہوا تھا کہ وہ گاؤں کے بڑے دولت مند بنیے ہیں) ہدیہ اور نذرانہ کے طور پر خود اپنے سروں پر مٹھائیوں کے تھال لے کر حاجی صاحب اور دوسرے اکابر کی خدمت میں اُن کی قیام گاہ پر آئے تھے۔ اُس وقت خود آنکھوں سے دیکھا کہ وہ حاجی صاحب سے ویسی ہی عقیدت رکھتے ہیں جیسی روحانی بزرگوں سے ہوتی ہے ـــــ حاجی صاحب نے اپنے ان خاندان والوں کے سامنے ہی حضرت رائے پوری سے مخاطب ہو کر بڑی بے تکلفی سے فرمایا کہ حضرت میں ان سے برابر کہتا ہوں کہ تم لوگ ایمان لے آؤ ناتو سب دوزخ میں جلو گے، مگر ابھی تک ان کی سمجھ میں نہیں آیا ـــــ حاجی صاحب کے اس انداز پر بھی ان لوگوں نے اپنی کسی ناگواری کا اظہار نہیں کیا بلکہ ان کے احترام اور اظہارِ عقیدت کے رویہ میں بھی کوئی فرق محسوس نہیں ہوا۔

یہ بھی معلوم ہوا تھا کہ حاجی صاحب کا دستور اور معمول ہے کہ جب اپنے خاندان والوں اور رشتہ داروں کے ہاں جاتے ہیں تو ان کے بچے اور بچیوں کو خوب پیسے بانٹتے ہیں ـــــ اللہ تعالیٰ ان سب باتوں سے سبق لینے کی توفیق دے۔

راقم سطور کے ساتھ حاجی صاحب کا برتاؤ بڑی ہی عنایت اور شفقت کا تھا بلاشبہ ایسے بندگانِ خدا کی شفقت و محبت اللہ تعالیٰ کے عظیم انعامات میں سے ہے

شکرِ نعمت ہائے تو چنداں کہ نعمت ہائے تو

حضرت مولانا حسین علی صاحب مجددی رحمۃ اللہ علیہ

جہاں تک یاد ہے راقم الحروف نے سب سے پہلے دارالعلوم دیوبند کی طالب علمی کے زمانے میں (جس کو عنقریب ساٹھ سال پورے ہوجائیں گے) علاقہ پنجاب کے بعض ہم درس طلبہ سے حضرت مولانا کا نام سنا تھا اور یہ بھی سنا تھا کہ وہ حضرت گنگوہیؒ کے تلامذہ میں سے ہیں، نیز یہ کہ شرک کے خلاف جنگ اور توحید خالص کی دعوت کا جذبہ اُن پر بہت غالب ہے اور اس لحاظ سے اپنے علاقہ میں وہ گویا اس دور کے "شاہ اسمٰعیل شہیدؒ" ہیں۔

میرا حال طالب علمی کے اس دور ہی میں (غالباً اپنے خاص استاذ و مربی حضرت مولانا کریم بخش سنبھلیؒ کی صحبت و تربیت کے اثر سے) یہ تھا کہ جن بزرگ کے متعلق معلوم ہوتا کہ شرک و توحید کے بارے میں اُن کا حال وہ ہے جو حضرت شاہ شہید کا تھا تو دل میں ان کی خاص عظمت و محبت پیدا ہوجاتی، اس لئے جب حضرت مولانا حسین علی صاحب کے بارے میں یہ سنا تو اسی وقت سے اُن کے ساتھ ایک قلبی ربط و لگاؤ پیدا ہوگیا۔

پھر ایک دن غالباً صحیح بخاری شریف کے درس میں استاذنا حضرت مولانا محمد انور شاہ کشمیریؒ نے کسی سلسلہ میں اُن کا اور مجددی سلسلہ ہی کے اُسی علاقہ کے ایک دوسرے صاحب ارشاد شیخ کا تذکرہ کرتے ہوئے فرمایا

کہ میں جہاں تک جانتا ہوں اس وقت ہندوستان میں یہ دونوں حضرات مجددی نقشبندی نسبت کے امین وامام ہیں ـــــ حضرت استاذ رحمۃ اللہ علیہ سے یہ سننے کے بعد اس عقیدت ومحبت میں اضافہ ہو گیا جو حضرت مولانا حسین علی صاحب سے پیدا ہو چکی تھی، اور قدرتی طور پر اُن کی زیارت اور ان کی خدمت میں حاضری کی آرزو بھی پیدا ہوئی لیکن اُس وقت بظاہر یہ ایسی آرزو تھی جس کے پورا ہونے کی ہمیں اس زمانے میں توقع بھی نہیں ہو سکتی تھا، مگر اللہ تعالیٰ نے قریباً دس ہی سال کے بعد اس آرزو کو عجیب و غریب طریقے سے پورا فرمایا۔ اِنَّ رَبِّیْ لَطِیْفٌ لِّمَا یَشَآءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِیْمُ الْحَکِیْمُ۝

دارالعلوم دیوبند کی میری طالب علمی ہی کے زمانے میں یہ واقعہ ہوا تھا کہ نجد کے سلطان عبدالعزیز بن سعود نے اُس وقت کے والیٔ حجاز شریف مکہ (حسین)[1] کو شکست دیکر حرمین شریفین پر اپنا اقتدار قائم کرلیا اور اپنے مسلک کے مطابق وہاں اصلاحی اقدامات کئے۔ اس سلسلہ میں مکہ معظمہ کے قبرستان جنۃ المعلاۃ اور مدینہ منورہ کی جنۃ البقیع میں حضرات اہل بیت اور بعض صحابۂ کرام کی قبروں پر بنے ہوئے وہ قبّے بھی منہدم کرادیئے جو کسی زمانہ میں (رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صریح ہدایت کے خلاف) تعمیر کیے گئے تھے۔ اس وقت

---

[1] یہ شریف حسین سلطنت عثمانیہ ترکی کی طرف سے حجاز کے گورنر تھے پہلی جنگ عظیم (۱۹۱۴ء) کے زمانے میں انگریزوں کی سازش سے غداری اور بغاوت کر کے یہ خود حجاز کے حکمراں بن گئے تھے۔

ہندوستان میں قبوری اہل بدعت اور شیعوں کی طرف سے ایک طوفان برپا ہوگیا اور وہابیت و بدعتیت کی وہ جنگ جس کو خلافت کی تحریک نے بالکل ٹھنڈا کر دیا تھا، پھر زور شور سے چھڑ گئی۔ راقم سطور جب دارالعلوم کی تعلیم سے فارغ ہوکر اپنے وطن سنبھل (ضلع مرادآباد) آیا تو یہ جنگ شباب پر تھی اور بریلوی جماعت کے اس دور کے سب سے بڑے پیشوا و قائد نعیم الدین مرادآبادی کی وجہ سے ہمارا علاقہ اس جنگ کا خاص میدان تھا۔ بریلوی حضرات کی طرف سے عوامی جلسوں کی تقریروں اور پمفلٹوں، اشتہاروں کے ذریعہ حملوں کا سلسلہ جاری تھا۔ اور ان حملوں کا خاص نشانہ حضرت شاہ اسمٰعیل شہیدؒ کی دعوت توحید و سنت کے علمبردار اکابر علمائے دیوبند تھے۔ ہماری جماعت کی طرف سے بھی کچھ مدافعت اور جواب دہی ہو رہی تھی ـــــ

راقم سطور نے دارالعلوم سے فراغت اور واپسی کے بعد اپنے اساتذہ و اکابر کے طریقہ پر تدریس کا شغل اپنا لیا تھا اسی کے ساتھ اس محاذ پر لسانی اور قلمی جہاد میں بھی حصہ لینا شروع کر دیا۔ اس سلسلہ میں مختلف مقامات پر مناظروں کی بھی نوبت آئی اور اللہ تعالیٰ نے اس میدان میں بھی احقاق حق و ابطال باطل کی توفیق عطا فرمائی۔[1]

قریباً ۱۵ سال کے تجربہ کے بعد احساس ہوا کہ مناظرہ کا مروجہ طریقہ بہت غلط ہے[2]

---

[1] واقعہ یہ ہے کہ ان مناظروں کی روئدادیں بھی اسی زمانے میں شائع ہوئی تھیں جو اب نایاب ہیں معلوم ہوا کہ ان میں سے بعض روئدادیں پاکستان میں اب پھر شائع ہوئی ہیں۔

[2] واقعہ یہ ہے کہ مناظرہ کا یہ مروجہ طریقہ کہ ہر فریق کا مناظر پانچ پانچ یا دس دس منٹ تقریر کرے آزریت ساجیلی اور فقرہ بازیوں کا اکھاڑہ بن کر رہ جاتا تھا۔ اس میں اہل باطل کو اپنی کمزوری چھپانے کا کافی موقع مل جاتا۔

اور اہلِ باطل کی طرف سے مناظرے کرنے والے بالعموم پیشہ ور ہیں انھوں نے اس کو اپنا پیشہ اور معاشی ذریعہ بنا لیا ہے، حق و ناحق سے ان کو کوئی واسطہ نہیں ہے۔ اس لیے عوام کو شرک و بدعت کی تاریکی سے نکالنے اور ان کی اعتقادی اور عملی اصلاح کے لیے انبیاء علیہم السلام اور ان کے سچے نائبین کی طرح اخلاص اور دلسوزی کے ساتھ براہِ راست عوام ہی پر محنت ہونی چاہیے اور تحریر و تقریر میں انہی کو مخاطب کرنا چاہیے نیز مناظرہ کے مروجہ طریقہ میں بعض اوقات وہ رویہ اختیار کرنا پڑتا ہے جو حق پرستوں کے لیے مناسب نہیں اور اپنے لیے مضر ہے ــــ اس احساس کے بعد اس عاجز نے مناظرہ ترک کر دینے کا فیصلہ کر لیا۔

اس فیصلے پر چند ہی مہینے گزرے تھے کہ ایک دن لاہور سے حضرت مولانا احمد علی رحمۃ اللہ علیہ کا مکتوب گرامی ملا۔ تحریر فرمایا تھا کہ ــــ

حضرت مولانا حسین علی صاحب (واں بھچراں۔ ضلع میانوالی) سے آپ غالباً واقف ہوں گے، وہ اس علاقہ پنجاب میں ہمارے اور ہماری جماعت کے سب سے بڑے بزرگ ہیں۔ ہمارے تمام اکابر کی طرح وہ بھی آج کل کے مناظروں کو پسند نہیں فرماتے۔ لیکن حضرت سے دینی تعلق رکھنے والے بعض حضرات نے اپنے علاقہ کے خاص حالات سے مجبور ہو کر اہلِ بدعت سے مناظرہ منظور کر لیا ہے ــــ حضرت مولانا اس ضعیف العمری میں چار سو میل کا سفر طے کر کے صرف اس کام کے لیے لاہور تشریف لائے ہیں کہ مناظرہ کے لیے آپ کو بلانا میرے ذمہ کر دیں ــــ یہ مناظرہ فلاں تاریخ کو فلاں مقام پر طے پایا ہے۔ آپ ہی کو مناظرہ کرنا ہے۔ اس کے لیے فلاں تاریخ کو آپ پہنچ جائیں۔[1]

---

[1] حضرت مولانا لاہوریؒ کے مکتوب گرامی کا یہ مضمون حافظہ ہی کی مدد سے لکھا گیا ہے۔

جیسا کہ اوپر عرض کیا، میں چند مہینے پہلے مناظرہ ترک کرنے کا فیصلہ کر چکا تھا۔ لیکن حضرت مولانا لاہوریؒ کا مکتوب گرامی اور حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب کی طرف سے دعوت! ـــــ سوچ سمجھ کے فیصلہ کیا کہ اس مناظرہ کے لیے تو جانا ہے ـــــ حضرت لاہوریؒ کی خدمت میں لکھ دیا کہ انشاء اللہ حسب ارشاد حاضر ہو جاؤں گا۔

یہ مناظرہ ضلع سرگودھا کے ایک مقام "بسلانوالی" میں ہونا طے ہوا تھا۔ یہ عاجز مقررہ تاریخ پر وہاں پہنچ گیا۔ لاہور سے خود حضرت مولانا لاہوریؒ حضرت مولانا عبدالحنان ہزاروی مرحوم اور دیگر متعدد علمائے کرام اور بہت دوسرے حضرات تشریف لے آئے ـــــ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسین علی شاہ صاحب ہم سے پہلے تشریف لا چکے ہیں۔ لیکن کچھ ایسا اتفاق ہوا کہ مناظرہ سے پہلے حضرت کی خدمت میں حاضری نہیں ہو سکی ـــــ یہ عاجز مقررہ وقت پر مناظرہ گاہ پہنچا تو حضرت مولانا وہاں تشریف لا چکے تھے۔ پہلی ملاقات اور زیارت یہیں اسٹیج پر ہوئی ـــــ مناظرہ کا موضوع اُس علاقے کے بعض اہل بدعت کا یہ مشرکانہ عقیدہ تھا کہ "اللہ تعالیٰ کی طرح رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو بھی ہر وقت ہر چیز کا علم ہے۔" یعنی آپ کا علم بھی "محیط بکل شیٔ" ہے۔ فرق صرف ذاتی اور عطائی کا ہے۔

قرارداد کے مطابق مناظرہ ہوا، اس عاجز نے اس عقیدہ کے ابطال و تردید میں قرآنی آیات، احادیث نبوی، صحابہ و تابعین کے ارشادات اور سلف صالحین کی تصریحات کے علاوہ خود مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کی کتابوں سے اُن کی وہ عبارتیں بھی پیش کیں جن میں انھوں نے صراحت کے ساتھ لکھا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے لیے اور کسی بھی

مخلوق کے لیے علم محیط تفصیلی کا عقیدہ باطل اور نصوص قرآن وحدیث کے خلاف ہے اور یہ کہ ملا علی قاریؒ نے اس عقیدہ کے موجب کفر ہونے پر اجماع نقل کیا ہے ۔۔۔

یہ مناظرہ دو روز جاری رہا ۔ حضرت مولانا حسین علی صاحب انتہائی ضعف پیری کے باوجود اول سے آخر تک تشریف فرما رہے اور انتہائی مسرت کا اظہار فرمایا ۔۔۔ اس مناظرہ میں میری حیثیت دراصل حضرت مولانا کے وکیل کی تھی[1] ۔۔۔ مناظرہ کے ختم پر قیام گاہ کی طرف واپس ہوتے ہوئے حضرت نے میرا ہاتھ اپنے ہاتھ میں لے لیا اور اچانک میری بے خبری میں میرا ہاتھ چوم لیا ۔ مجھے بے حد ندامت ہوئی اور شدت تاثر سے پسینہ سا آ گیا ۔ اسی موقع پر چلتے چلتے حضرت مولانا نے اپنے خاص پنجابی انداز میں (مولوی احمد رضا خاں صاحب بریلوی کے بارے میں) فرمایا کہ معلوم ہوتا ہے یہ بریلی والا پڑھا لکھا تھا ، علم والا تھا ، ہمارے ہاں کے یہ لوگ بالکل جاہل ہیں ان کا عقیدہ وہی ہے جو قطعاً شرک ہے ۔

---

[1] اس مناظرہ میں گوجرانوالہ کے ہمارے ایک مخلص مسٹر عنایت الٰہی بی اے شریک تھے اللہ تعالیٰ نے ان کو یہ کمال عطا فرمایا تھا کہ وہ ہر مقرر کی تقریر تقریباً لفظاً بلفظ لکھ لیتے تھے ، انھوں نے اس مناظرہ کی فریقین کی تقریریں اسی طرح قلم بند کی تھیں ، اس وجہ سے اس مناظرہ کی روئداد اسی زمانے میں جیسی مکمل شائع ہو گئی تھی ، غالباً کسی تقریری مناظرہ کی روئداد ایسی مکمل شائع نہ ہوئی ہوگی ۔۔۔ معلوم ہوا ہے کہ پاکستان میں بعض اشاعتی اداروں نے اس کو پھر شائع کیا ہے ۔

اس عاجز نے بعض اکابر علماء سے سنا تھا کہ حضرت مولانا حسین علی صاحب کو فہمِ قرآن میں خاص کمال و امتیاز حاصل ہے اور ان کا درسِ قرآن کا ایک بالکل نرالا طریقہ ہے ــــــ مناظرہ سے فارغ ہونے کے بعد میں مولانا کی خدمت میں حاضر تھا، موقع مناسب دیکھ کر عرض کیا کہ میں چاہتا ہوں کہ حضرت قرآن مجید کی کوئی سورت مجھے پڑھا دیں! مولانا نے فوراً قرآن پاک منگوا لیا اور اسی ایک نشست میں ایک عجیب انداز سے سورہ "مومن" سے "احقاف" تک اُن ساتوں سورتوں کا اجمالی درس دیا جو حٰمٓ سے شروع ہوئی ہیں۔ یہ پورے دو پلے ہوتے ہیں ــــــ حضرت مولانا صاف اردو بولنے پر قادر نہیں تھے۔ وہ بس تفسیری اشارے فرماتے جاتے اور پوری سورت کے حاصل اور اصل پیغام مختصر لفظوں میں بیان فرماتے تھے ــــــ مولانا اپنے تفسیری اشارے کے ساتھ تفسیر کی کسی کتاب کا نام بھی لیتے تھے، فرماتے "مدارک، جلالین، بیضاوی، خازن، ابو سعود، کبیر، قرطبی، روح المعانی" وغیرہ وغیرہ۔ مطلب یہ ہوتا تھا کہ جو کچھ میں نے کہا وہ تفسیر کی اس کتاب میں ہے ــــــ اس سلسلہ کی آخری سورت "احقاف" کے مضامین پر کسی قدر تفصیل سے گفتگو فرمائی۔ اس طرح اس عاجز کو حضرت مولانا سے تلمذ کی بھی سعادت حاصل ہوئی فللّٰہ الحمد ــــــ اسی ایک درس کی صحبت سے اندازہ ہوا کہ قرآن پاک سے حضرت مولانا کو عشق ہے اور اس کے درس سے ان کی روح کو غذا ملتی ہے ــــــ میں نے

لے مولانا غلام اللہ خاں صاحبؒ جو "شیخ القرآن" ہی کے لقب سے معروف ہو گئے تھے (جنھوں نے اسی سال وفات پائی ہے) وہ حضرت مولانا حسین علی صاحب کے (الفرقان)

آخر میں دعا کی درخواست کی تو اسی وقت ہاتھ اٹھا کے خاص توجہ اور اہتمام سے دعا فرمائی۔

یہ واقعہ ۱۹۳۶ء کا ہے ۱۳۵۵ھ ختم ہو رہا تھا۔ اس کے آخری مہینے ذی الحجہ کا تیسرا ہفتہ تھا۔

ایک قابل ذکر واقعہ اس سفر میں یہ بھی پیش آیا کہ چند روز پہلے عید الضحیٰ میں میں نے اپنی قربانی کے علاوہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی طرف سے بھی گھر کے پلے ہوئے ایک بکرے کی قربانی کی تھی۔ یہ بکرا بہت ہی خوبصورت تھا اور گھر کے سب ہی لوگوں کو اس سے انس تھا، یہ سب چھوٹے بڑوں سے بہت ہی مانوس تھا۔ عید قرباں کے ۳-۴ دن بعد یہ سفر ہوا تھا۔ راستہ میں کھانے کے لیے ایک بکرے کا گوشت ایک ناشتہ دان میں رکھ لیا تھا میرے ساتھ ایک رفیق سفر مولوی عطاء اللہ قاسمی بھی تھے۔ ریل کے ڈیڑھ دو دن کے سفر میں ہم دونوں یہی گوشت کھاتے رہے۔ مقام مناظرہ سلانوالی پہنچ کر اپنے اس ناشتہ دان کو گویا ہم بھول ہی گئے، وہاں کے قیام میں اس کو کھول کے دیکھنے کی بھی نوبت نہیں آئی، اس سفر سے واپسی میں ہم دونوں کے علاوہ اور بھی متعدد حضرات ساتھ تھے، ایک بڑے اسٹیشن پر کھانا کھانے کا

(بقیہ ۲ سے آگے) علم قرآن کے خاص وارث و امین تھے۔ انھوں نے حضرت مولانا کے تقریری افادات کو تفسیر "جواہر القرآن" کے نام سے مرتب کر کے شائع کر دیا تھا۔ اس کے مطالعہ سے حضرت مولانا کے علم قرآن کا کچھ اندازہ کیا جا سکتا ہے۔

۳ اس سے مراد "نبراس الساری علی اطراف البخاری" کے مصنف حضرت مولانا عبدالعزیز صاحب محدث (گوجرانوالہ) ہیں۔ رحمہ اللہ تعالیٰ۔

ارادہ کیا تو ضرورت محسوس ہوئی کہ کھانے کا کچھ سامان اسٹیشن سے بھی خرید لیا جائے۔ اس وقت ناشتہ دان یاد آیا، ساتھ ہی خیال آیا کہ اس میں کچھ گوشت باقی رہ گیا تھا وہ تو بالکل خراب ہو گیا ہوگا۔ اس کو کھول کے دیکھا، انتہائی حیرت انگیز مسرت ہوئی۔ اس گوشت میں جو ۸-۱۰ دن پہلے کا پکا ہوا تھا اور اس میں سے کھایا بھی گیا تھا اور جو تھا وہ پس خوردہ تھا اور ناشتہ دان میں بند پڑا تھا، ہوا بھی نہیں لگی تھی، ذرا بھی تغیر نہیں آیا تھا ـــــ ہم نے اس کو رسول پاک صلی اللہ علیہ وسلم کی نسبت کی برکت اور آپ کا معجزہ سمجھا اور سب رفقائے سفر نے بطور تبرک کے اس کو کھایا۔ صلی اللہ علی نبیہ الکریم۔

دوسری اور آخری زیارت و ملاقات

فروری [illegible] میں لاہور میں "جماعت اسلامی" کا ایک اہم مشاورتی اجتماع تھا، یہ عاجز اس وقت جماعت کا سرگرم رکن و داعی بلکہ نائب امیر بھی تھا، جماعت کے تمام اہم ارکان اس موقع پر لاہور میں جمع تھے۔ معلوم ہوا کہ حضرت مولانا حسین علی صاحب مرض میں ہیں اور بسلسلۂ علاج لاہور تشریف لائے ہوئے ہیں۔ تحقیق سے یہ بھی معلوم ہو گیا کہ قیام فلاں جگہ ہے۔ زیارت و عیادت کے لیے خدمت میں حاضری کا ارادہ کیا۔ امیر جماعت مولانا مودودی مرحوم، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی ندوی، مولانا امین احسن اصلاحی اور بعض اور حضرات نے بھی ساتھ چلنے کا فیصلہ کیا اور پروگرام بن گیا لیکن حضرت مولانا کی قیام گاہ کے قریب ہم ایسے وقت پہنچے جب وہ کہیں جانے کے لیے اس حال میں نکل رہے تھے کہ دائیں بائیں دونوں طرف سے خدام

تھامے ہوئے تھے، نقاہت کا یہ حال تھا کہ معلوم ہوتا تھا ہڈیوں کا ڈھانچہ پر صرف کھال باقی رہ گئی ہے۔ اور بس سانس کی آمد و رفت اور اس کے ساتھ ذکر خفی جاری ہے۔ حضرت کے خدام میں بھی بعض وہ حضرات تھے جو مجھ کو پہچانتے تھے۔ میں نے سلام عرض کیا اور رفقا کے بارے میں مختصر طور پر کچھ عرض کیا اور دعا کی درخواست کی۔ حضرت وہیں راستہ میں کھڑے ہو گئے اور ہاتھ اٹھا کے دعا میں مشغول ہو گئے۔ ضعف و نقاہت کا یہ عالم تھا کہ دعا کے لیے اٹھے ہوئے ہاتھ خدام میں سے ایک صاحب کو تھامنے پڑے۔ بس یہی آخری زیارت و ملاقات تھی ــــ اُس وقت حضرت کا سن یقیناً سو سے متجاوز تھا۔

بعد میں یہ بھی معلوم ہوا کہ حضرت مولانا گنگوہیؒ کے علاوہ حضرت مولانا مظہر نانوتویؒ سے بھی آپ کو تلمذ کا شرف حاصل تھا جو حدیث میں حضرت شاہ اسحٰقؒ کے بلاواسطہ شاگرد تھے۔ اس لحاظ سے حضرت مولانا حسین علی صاحب کے تلامذہ کو صرف دو واسطوں سے حضرت شاہ اسحٰق صاحبؒ سے تلمذ کا شرف حاصل ہے اور اس سعادت میں کسی نہ کسی درجہ میں راقم سطور بھی شریک ہے۔ فللہ الحمد والمنۃ

حضرت مولانا سید حسین احمد مدنیؒ
میری واقفیت اور تاثرات

غالباً ۱۳۳۸ھ کی بات ہے میں اپنے وطن سنبھل کے عربی مدرسے (مدرسۃ الشرع) میں صرف و نحو کی ابتدائی کتابیں پڑھتا تھا، میری عمر اس وقت ۱۴ سال کی ہوگی، حضرت شیخ الہندؒ کا نام میں اپنے اساتذہ سے سنا کرتا تھا، اس لیے قلب میں ان کی خاص عظمت تھی۔ اسی زمانہ میں یہ خبریں آئیں کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر عنقریب تشریف لانے والے ہیں۔ اگرچہ چالیس سال پہلے کی بات ہے مگر مجھے کل کی طرح یاد ہے کہ مدرسے کے سن رسیدہ مہتمم جناب منشی حمید الدین صاحب مرحوم (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم صاحب نانوتوی سے بیعت و ارادت کا شرف حاصل تھا) ایک دن مدرسہ تشریف لائے اور حضرات اساتذہ کو اپنی ایک تازہ نظم سنائی جس میں حضرت شیخ الہندؒ کی رہائی کی خوشخبری پر اپنے جذبات مسرت کا اظہار کیا تھا۔ میں نے سب سے پہلے اسی نظم میں حضرت شیخ الہندؒ کے رفیقوں اور خاص خادموں کی حیثیت سے حضرت مولانا حسین احمد صاحب، اور مولانا عزیز گل صاحب کا نام سنا۔

پھر کچھ عرصے کے بعد سننے میں آیا کہ حضرت شیخ الہندؒ مالٹا سے رہا ہو کر دیوبند تشریف لے آئے۔ تشریف آوری رمضان مبارک ۱۳۳۸ھ میں ہوئی تھی۔ شروع شوال میں جب عربی مدارس کا تعلیمی سال شروع ہوا تو میرے والد ماجد نے آئندہ تعلیم کے لیے مجھے دہلی استاذی حضرت مولانا کریم بخش صاحب سنبھلی مرحوم کے ساتھ بھیجنے کا فیصلہ فرمایا (مولانا مرحوم ان دنوں مدرسہ عبدالرب دہلی میں مدرس تھے) مولانا نے نظام سفر اس طرح بنایا کہ پہلے اپنے استاد حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت کے لیے دیوبند جائیں گے اور پھر وہاں سے دہلی۔ مجھے بھی اس کی خوشی تھی کہ حضرت شیخ الہندؒ کی زیارت نصیب ہوگی۔ اس زمانہ میں میرے وطن سنبھل اور مراد آباد کے درمیان ٹرین نہیں چلتی تھی اس لیے سنبھل سے مراد آباد تک سفر گھوڑے تانگے سے ہوا۔ مراد آباد پہنچ کر دیوبند کے لیے ٹکٹ خرید لیے گئے لیکن تھوڑی دیر کے بعد مراد آباد کے ایک بزرگ سے حضرت استاذ کو یہ معلوم ہو گیا کہ حضرت شیخ الہندؒ آج ہی دیوبند سے فتح پور، ہسوہ روانہ ہونے والے ہیں اس لیے اس وقت دیوبند پہنچ کر حضرت کی زیارت نہ ہو سکے گی۔ افسوس کے ساتھ خریدے ہوئے وہ ٹکٹ واپس کر دیئے گئے اور دہلی کے ٹکٹ لے کر براہ راست دہلی روانہ ہو گئے ___ صبح کو جب ہم دہلی پہنچ کر مدرسہ عبدالرب میں داخل ہوئے تو وہاں فرش و فروش کا کچھ غیر معمولی اہتمام دیکھا۔ دریافت کرنے پر معلوم ہوا کہ حضرت شیخ الہندؒ اسی وقت تشریف لائے ہیں، شام تک یہیں مدرسہ میں قیام رہے گا اور آج ہی یہاں سے مجبور کے لیے روانگی ہو جائے گی۔ حضرت استاذ مرحوم اور اس ناچیز کو بھی یہ سن کر بڑی خوشی ہوئی۔ تھوڑی ہی دیر کے بعد حضرت اپنے رفقاء سمیت تشریف

لے آئے۔ ناچیز کو بھی زیارت کی سعادت نصیب ہوئی، مولانا عزیز گل صاحب خادم خاص کی حیثیت سے ساتھ تھے ان کی زیارت بھی سب سے پہلے اسی وقت ہوئی۔ حضرت مولانا حسین احمد صاحب کا نام نامی سن چکا تھا اس لیے قدرتی طور پر ان کی زیارت کا بھی اشتیاق تھا، دریافت کرنے پر کسی سے معلوم ہوا کہ مولانا اس سفر میں حضرت شیخ الہندؒ کے ساتھ نہیں ہیں۔

چند ہی مہینے کے بعد ربیع الاول ۱۳۳۹ھ میں حضرت شیخ الہندؒ کا وصال ہو گیا۔ مالٹا سے حضرت کی آمد پر خلافت کی تحریک میں ایک دم وسعت اور طاقت پیدا ہو گئی، ملک بھر میں خلافت کے نام پر جلسے اور کانفرنسیں ہونے لگیں۔ ہمارے وطن سنبھل میں بھی ایک بڑا جلسہ ہوا جس میں قریب قریب وہ سب بڑے علماء تشریف لائے جو خلافت کی تحریک میں اس وقت نمایاں اور پیش پیش تھے۔ حضرت مولانا حسین احمد مدنی بھی تشریف لائے۔ مجھے یاد ہے کہ مدنی نسبت اور مالٹا کی اسیری کی وجہ سے ہر شخص کو دوسرے بزرگوں سے زیادہ حضرت مولانا ہی کی زیارت کا شوق تھا۔ کم عمری کے باوجود میرا بھی یہی حال تھا۔ حضرت مولانا کی پہلی زیارت اسی موقع پر ہوئی۔ خوب یاد ہے کہ حضرت مولانا جدھر کو نکلتے تھے مشتاقان زیارت کی بھیڑ لگ جاتی تھی۔

مولانا نے اس جلسہ کی اپنی تقریر میں لوگوں کے اصرار پر ان تکلیفوں مصیبتوں اور بربادیوں کی تفصیل بھی بیان فرمائی تھی جن سے پہلی جنگ عظیم کے دوران اہل مدینہ کو گزرنا پڑا۔ یہ واقعات ہر مسلمان کیلئے بہت دردناک تھے۔ مجھے اب تک اس تقریر کے خاصے اجزا یاد ہیں۔

اس کے کچھ عرصہ کے بعد حضرت مولانا گرفتار کر لیے گئے اور وہ تاریخی

مقدمہ چلا جو کراچی کے مقدمہ کے نام سے مشہور ہے۔ اس مقدمہ کے نتیجہ میں حضرت مولانا، مولانا محمد علی جوہر وغیرہ رفقاء کے ساتھ دو سال کراچی جیل میں رہے۔ اس قید سے رہائی کے بعد اپنی طالب علمی کے دور میں پہلی دفعہ مولانا کی زیارت مرادآباد کے جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ہوئی، یہ وہ زمانہ تھا جب نجد کے سلطان عبدالعزیز ابن سعود نے مکہ معظمہ پر قبضہ کرلیا تھا اور شریف حسین کو وہاں سے چلا جانا پڑا تھا۔ خبریں آرہی تھیں کہ شریف حسین بعض یورپین طاقتوں سے مدد حاصل کرکے نجدیوں سے جنگ کرنے کی تیاری کررہے ہیں، اور اندیشہ تھا کہ اگر ایسا ہوا تو یہ جنگ سرزمین حرم پر ہوگی۔ جمعیۃ العلماء کے اجلاس میں ایک رزولیوشن پیش کیا گیا تھا جس میں شریف حسین کے اس ارادے پر ناراضی کا اظہار کیا گیا تھا اور مکہ معظمہ کی حرمت کے نام پر اس ارادہ واقدام سے باز رہنے کی اپیل کی گئی تھی ـــــ اس رزولیوشن کی تحریک یا تائید کرتے ہوئے حضرت مولانا مدنیؒ نے ایک بڑی مبسوط تقریر فرمائی تھی اور مکہ معظمہ کی حرمت اور وہاں ہر قسم کے جنگ وجدال کی دائمی ممانعت سے متعلق حدیثوں کے متن اس قدر کثرت سے پڑھ کر سنائے تھے کہ دینیات کے ایک طالب علم کی حیثیت سے اس وقت میرا یہ احساس تھا کہ شاید ان کو حدیث کے دفتر کے دفتر حفظ ہیں اور اس وصف میں کوئی دوسرا عالم غالباً ان کا ہم پلہ نہ ہوگا ـــــ میرے لیے مولانا مرحوم کی زیارت اور تقریر سننے کا یہ دوسرا موقع تھا۔

اگلے سال میں پڑھنے کے لیے دارالعلوم دیوبند چلا گیا، وہاں دو سال قیام رہا، حضرت مولانا مدنیؒ کا مستقل قیام اس زمانہ میں غالباً

سلہٹ رہتا تھا۔ لیکن دیوبند بار بار تشریف لانا ہوتا تھا، چنانچہ میرے دو سالہ قیام کے زمانہ میں کئی بار تشریف آوری ہوئی اور قریباً ہر دفعہ طلبہ اور مدرسین کے اصرار سے آپ نے تقریر بھی فرمائی۔ اس زمانہ کی آپ کی تقریریں معلومات سے معمور ہوتی تھیں خاص طور سے ہم طلباء ان سے بہت فائدہ اٹھا سکتے تھے۔ مجھے یاد ہے کہ میں نے بعض تقریریں قلمبند بھی کی تھیں۔

جس سال میں دارالعلوم دیوبند میں دورۂ حدیث سے فارغ ہوا اسی سال کے ختم پر کچھ ایسے واقعات دارالعلوم میں پیش آئے کہ حضرت الاستاذ مولانا محمد انور شاہ صاحبؒ نے دارالعلوم چھوڑنے کا فیصلہ فرمالیا، اس وقت دارالعلوم کی صدارتِ تدریس کے لیے کوئی شخصیت حضرت مولانا سید حسین احمد صاحب مدنیؒ سے زیادہ موزوں نہیں ہوسکتی تھی۔ یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہوا کہ مولانا نے اس ذمہ داری کو قبول فرمالیا، چونکہ دارالعلوم میں میری طالب علمی کا دور حضرت مولانا کی تشریف آوری سے پہلے ختم ہوچکا تھا اس لیے مجھے باضابطہ تلمذ کا شرف تو حاصل نہیں ہوا لیکن گزشتہ ۳۰-۳۲ سال کی مدت میں دیوبند میں بھی اور باہر سفروں میں بھی خدمت میں حاضری اور رفاقت کی سعادت سیکڑوں بار حاصل ہوئی ـــــ حضرت مولانا کی زندگی کے جن پہلوؤں سے اپنی ذاتی واقفیت اور تجربہ کی بنا پر میں زیادہ متاثر ہوا اس وقت بغیر کسی خاص ترتیب کے میں انھیں کا ذکر کرنا چاہتا ہوں۔

نماز کا امتیاز

خالص دینی اعمال میں نماز سب سے زیادہ عام چیز ہے، اس لیے حضرت

مولانا جیسی کسی عظیم دینی شخصیت کی نماز کا ذکر شاید بہت سے لوگوں کو کچھ عجیب سا معلوم ہوگا ___ لیکن واقعہ یہ ہے کہ نماز کی حقیقت اگر کسی بندے کو نصیب ہو تو اس کو بندگی کا کمال نصیب ہوا اسی لیے نماز کو معراج المؤمن کہا گیا ہے اور اسی لیے سیدنا حضرت عمرؓ نے اپنے عہد خلافت میں اسلامی قلمرو کے تمام عمال یعنی صوبوں کے افسران اعلیٰ کے نام بھیجے جانے والے ایک مراسلہ میں سب سے پہلی بات یہ لکھی تھی کہ إِنَّ أَهَمَّ أُمُورِكُمْ عِنْدِي الصَّلٰوةُ (تمہارے کاموں میں سب سے زیادہ اہم اور دوسرے سب کاموں سے زیادہ اہتمام کی مستحق میرے نزدیک نماز ہے۔)

اصل بات یہ ہے کہ نماز صرف ایک دینی عمل ہی نہیں ہے بلکہ دینی نظام میں اس کا مقام وہ ہے جو انسان کے جسمانی نظام میں اس کے قلب اور روح کا مقام ہے۔ قلب کے بارے میں مشہور حدیث ہے کہ اسی کے صلاح وفساد پر پورے وجود انسانی کے صلاح وفساد کا مدار ہے۔ (اذا صلح صلح الجسد کله واذا فسد فسد الجسد کله) اسی طرح نماز کے بارے میں بعض حدیثوں میں وارد ہوا ہے کہ قیامت کے دن سب سے پہلے نماز کو جانچا جائے گا۔ اگر بندہ کی نماز اچھی نکلی تو وہ کامیاب وبامراد ہوگا اور وہ ناقص وخراب نکلی تو وہ نامراد اور خسارہ میں رہے گا اور بعض روایات میں اس طرح ہے کہ جس بندے کی نماز ٹھیک نکلے گی، اس کے سارے عمل ٹھیک مانے جائیں گے اور جس کی نماز خراب ہوگی اس کے سارے عمل خراب قرار دیے جائیں گے۔

اسی قسم کی روایات کی بنا پر میں نے یہ کہا ہے کہ نماز کا مقام دینی

نظام میں قلب وروح کا مقام ہے۔

نماز کی عظمت واہمیت کا اندازہ اس سے بھی کیا جاسکتا ہے کہ قرآن مجید میں سیدنا حضرت ابراہیم خلیل اللہ سے یہ دُعا نقل کی گئی ہے۔ رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ وَمِن ذُرِّيَّتِي (اے میرے رب مجھے ایسا کردے کہ میں اچھی نماز ادا کرنے والا ہو جاؤں اور میری نسل میں سے بھی۔)

بہرحال اللہ کے کسی بندے کو نماز کی حقیقت اور اس کی روح کا نصیب ہونا اس کا سب سے بڑا کمال اور اعلیٰ درجہ کی کامیابی ہے۔

نماز کی روح کیا ہے؟ —— اس کے جاننے کے لیے امام عارف حضرت شاہ ولی اللہ کی یہ عبارت پڑھ لیجئے۔ وروح الصلوٰة هى الحضور مع الله والاستغراق للجبروت وتذكر جلال الله مع تعظيم ممزوج بمحبة وطمأنينة (حجۃ اللہ البالغہ) یعنی اللہ کے سامنے حضوری اور سکینت ومحبت آمیز تعظیم کے ساتھ اس کے جلال وجبروت کا تصور اور گہرا دھیان بس یہی نماز کی روح ہے۔

حضرت شاہ صاحب نے نماز کی جو روح بتائی ہے وہ بلاشبہ ایک باطنی حال ہے جس کو آنکھوں سے نہیں دیکھا جاسکتا لیکن جس طرح رنج وغم، فکر والم، مسرت وشادمانی، لذت ودرد وغیرہ قلبی وباطنی کیفیات کے آثار کسی کے چہرے پر دیکھ کر یا اس کی گفتگو اور آواز میں ان کے اثرات محسوس کرکے ان اندرونی کیفیات کا اندازہ ہر ہوش وگوش والا کرلیتا ہے، اسی طرح نماز کی اس روح کے آثار بھی دوسروں کے لیے بعض اوقات اتنے عیاں ہوجاتے ہیں کہ وہ گویا آنکھوں سے دیکھ لیتے اور

کانوں سے سن لیتے ہیں۔ بعض صحابۂ کرام نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے متعلق جو بیان کیا ہے کہ نماز کی حالت میں ہم آپ کے سینۂ مبارک سے چکی چلنے کی سی (یا بعض راویوں کے بیان کے مطابق ہانڈی میں جوش آنے کی سی) ایک آواز سنتے تھے تو یہ درحقیقت اسی اندرونی کیفیت کا ایک اثر تھا جس کو دوسرے بھی محسوس کرتے تھے۔

اس تمہید کے بعد یہ عاجز عرض کرتا ہے کہ حضرت مولانا مدنیؒ کے ساتھ اور قریب کھڑے ہو کر جب بھی نماز ادا کرنے کا اتفاق ہوا تو ہمیشہ یہ محسوس ہوا کہ حضرت مولانا وہ نماز پڑھتے ہیں جو ہم کو نصیب نہیں، خاص کر جب مولانا فجر کی نماز میں قنوتِ نازلہ پڑھتے تھے تو بعض اوقات تو خطرہ ہونے لگتا کہ کہیں قلب نہ پھٹ جائے۔

ادھر کئی سال سے حضرت کے گھٹنوں میں مستقل تکلیف رہتی تھی جس کی وجہ سے اٹھنا بیٹھنا، خاص کر سجدے میں جانا اور سجدے سے کھڑا ہونا بڑی تکلیف اور مشقت کے ساتھ ہو سکتا تھا، یہاں تک کہ دیکھنے والوں کا بھی دل دکھتا تھا لیکن اس تمام عرصہ میں نماز فرض ہی نہیں بلکہ اوابین اور تہجد وغیرہ نوافل بھی ہمیشہ کے معمول کے مطابق طول قرأت اور طول قیام ہی کے ساتھ ادا فرماتے تھے۔ معلوم ہوتا تھا کہ جس حالت کو ہم سخت تکلیف و مشقت کی سمجھ رہے ہیں ان کے لیے اسی میں راحت ولذت ہے، ظاہر ہے کہ یہ حال اسی بندے کا ہو سکتا ہے جس کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی "قرۃ عینی فی الصلوٰۃ" اور "یا بلال أرحنی بالصلوٰۃ" والی کیفیت سے خاص حصہ ملا ہو۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی محبت اور اتباعِ سنت

حدیث میں حقیقت ایمان کو رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم کی محبت سے وابستہ بتلایا گیا ہے۔ فرمایا گیا ہے کہ جس شخص کو اپنے ماں باپ اپنی اولاد اور خود اپنی ذات سے بھی زیادہ رسول اللہ ؐ سے محبت نہ ہو، اس کو حقیقت ایمان نصیب نہیں ہے اور حضور کی اس محبت کا لازمی نتیجہ آپ سے نسبت رکھنے والی ہر چیز کی عظمت و محبت اور آپ کی سنتوں اور عادات و اطوار کے اتباع کا اہتمام اور شغف ہے۔

اس عاجز نے اس باب میں حضرت مولانا کو بہت ممتاز پایا، رسول اللہ صلے اللہ علیہ وسلم سے ادنیٰ نسبت رکھنے والی ہر چیز کے ساتھ حتیٰ کہ مدینہ طیبہ کی مٹی کے ساتھ حضرت مولانا کو جو خاص قلبی تعلق تھا جس کا اظہار اپنے موقع پر عملی زندگی میں قدرتی طور پر ہوتا رہتا تھا اس کی مثال اس عاجز نے دوسری جگہ نہیں دیکھی۔

اسی طرح اتباع سنت کا اہتمام اور شغف، عبادات ہی میں نہیں بلکہ امورِ معاشرت اور عادات میں بھی جس قدر فرماتے تھے۔ تلاش کرنے والے کو اس کی مثالیں خواص اہل دین میں بھی شاذ و نادر ہی ملیں گی۔ اس سلسلہ میں بعض عادات اور روزمرہ کی بعض ایسی باتوں کا ذکر کرنا غالباً نامناسب نہ ہوگا جن سے اندازہ ہو سکے کہ سنت کا اتباع گویا آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

مثلاً تکیہ چمڑے کا استعمال فرماتے تھے، کھانا کھاتے وقت نشست ہمیشہ سنت کے مطابق ہوتی تھی۔ اپنے دسترخوان پر (جو عام طور پر

گول ہوتا اور دس پر دس بارہ آدمی آپ کے ساتھ دائرہ بنا کر بیٹھتے۔)
سالن ایک ہی بڑے برتن میں ہوتا اور سب کے ہاتھ اسی ایک برتن میں پڑتے، حتیٰ کہ اگر کہیں دعوت میں شرکت فرماتے اور وہاں آج کل کے رواج کے مطابق ہر شخص کے کھانے کی پلیٹ الگ ہوتی تو اپنے قریب والوں کو اپنے ساتھ شامل فرما کر وہاں بھی مسنون طریقہ پر ان کے ساتھ ایک ہی پلیٹ میں کھانا تناول فرماتے۔ اسی طرح اٹھنے بیٹھنے اور لیٹنے سونے میں حتیٰ کہ لباس اور جوتا پہننے میں بھی طریقہ سنت کی پابندی فرماتے ۔۔۔ اگر آپ کے تشریف لانے پر آپ کے نیاز مند اور عوام تعظیماً کھڑے ہو جاتے (جیسا کہ آج کل کا عام دستور ہے) تو ناراضگی کا اظہار فرماتے بلکہ بعض اوقات اس اظہار ناراضگی میں برافروختگی بھی ہوتی ۔۔۔ اور فرماتے کہ آپ لوگ کیوں کھڑے ہوئے کیا آپ کو معلوم نہیں ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کو اس طرح کھڑے ہونے سے ناگواری ہوتی تھی۔

یہ روزمرہ کی چند مثالیں ہیں جن سے اندازہ کیا جاسکتا ہے کہ معاشرت اور عادات میں بھی سنن نبویہ کا اتباع آپ کا مزاج بن گیا تھا۔

حد سے زیادہ تواضع اور خاکساری

اللہ تعالیٰ کے نزدیک حضرت مولانا کا جو مقام ہوگا اس کا علم تو اللہ تعالیٰ ہی کو ہے لیکن جو لوگ ان کے احوال سے کچھ بھی واقف ہیں وہ اتنا ضرور جانتے ہیں کہ اس زمانہ میں کسی عالم دین اور کسی روحانی پیشوا کو جو بڑی سے بڑی عظمت و وجاہت، بلندی و برتری حاصل

ہو سکتی ہے۔ اللہ تعالیٰ کے فضل سے وہ مولانا کو حاصل تھی۔ دارالعلوم دیوبند جیسی باعظمت دینی درسگاہ کے وہ صدر اور شیخ تھے۔ ہزاروں عالم (جو اپنی اپنی جگہ اپنے حالات کے مطابق کسی نہ کسی دینی خدمت میں لگے ہوئے ہیں اور ان میں سے بہتوں کے خاصے وسیع دائرہ حلقے ہیں) ان کے شاگرد اور فدائی، ہندوستان کے طول و عرض میں لاکھوں مریدین، پھر ہندوستان کی جنگ آزادی میں ان کی عظیم قربانیوں کے طفیل ملک کے اہلِ حکومت وسیاست کی نگاہ میں بھی ان کا خاص مقام اور حکومت کے اونچے سے اونچے عہدہ داروں کی نگاہ میں ان کا غیر معمولی احترام ـــــ ان ساری عظمتوں اور بلندیوں کے باوجود ان میں تواضع اور انکسار اس قدر تھا کہ جن لوگوں کو قریب رہنے اور برتنے کا موقع نہ ملا وہ کبھی اندازہ نہیں لگا سکتے بلکہ یہ عاجز اس موقع پر صفائی کے ساتھ یہ ظاہر کر دینا ہی مناسب سمجھتا ہے کہ بعض اوقات راقم سطور کو خیال ہوتا تھا کہ حضرت کا اتنا تواضع شاید دوسروں کے لیے مضر ہو ـــــ اس سلسلہ میں بھی خود اپنے ساتھ گزرے ہوئے بعض واقعات کا ذکر کرنے کو جی چاہتا ہے۔

سنہ ۴۳ھ کی بات ہے میری طالب علمی ہی کا زمانہ تھا۔ ہمارے وطن سنبھل کے "مدرسۃ الشرع" کی طرف سے خاصے بڑے پیمانے پر ایک جلسہ ہوا اس میں جماعت دیوبند کے اس وقت کے اکثر اکابر علماء (مثلاً حضرت مولانا سید انور شاہ صاحب کشمیریؒ، حضرت مولانا شبیر احمد عثمانیؒ حضرت مولانا مفتی عزیز الرحمٰن صاحب دیوبندیؒ) نے شرکت فرمائی تھی حضرت مولانا مدنی بھی تشریف لائے تھے۔ مدرسہ کے مہتمم اور جلسے کے

منتظمین کی اجازت سے ایک دن دوپہر کے وقت کھانے کا انتظام میرے والد ماجدؒ نے اپنے یہاں کیا تھا۔ جلسہ گاہ اور ان حضرات کی قیام گاہ سے ہمارے مکان کا فاصلہ ایک میل سے کچھ زیادہ تھا اس لیے سب مہمانوں کو سواری کے ذریعہ لانے کا انتظام کیا گیا تھا اور سب حضرات سواری ہی سے آئے۔ لیکن حضرت مولانا مدنیؒ نے یہ کیا کہ سنبھل کے اپنے ایک پرانے شاگرد اور نیاز مند کو بطور راہ نما ساتھ لے کر خاموشی سے ہمارے گھر پیدل تشریف لائے، حالانکہ موسم گرما تھا اور بارہ بجے کے بعد کا وقت تھا اور جیسا کہ عرض کیا گیا فاصلہ میل بھر سے بھی زیادہ تھا۔

سنبھل کے اسی سفر میں ہمارے یہاں کے ایک صاحب نے جو بیچارے علمی، دینی و دنیوی کوئی بھی خاص حیثیت نہیں رکھتے تھے اور حضرت مولانا سے ان کا کوئی تعارف بھی نہیں تھا۔ حضرت مولانا مدنی سے درخواست کی کہ میرے گھر پر چل کر چائے پیجئے۔ مجھے یاد ہے کہ ان کی یہ بات سب کو کچھ عجیب سی معلوم ہوئی۔ لیکن مولانا نے بغیر کسی عذر و معذرت کے قبول فرمالیا اور ان کے ساتھ ان کے گھر پر جا کر بالکل بے وقت چائے اور صرف چائے پی لی۔

ایک عجیب واقعہ اور سنئے ___ حضرت کے ایک شاگرد نے خود اپنا یہ واقعہ بیان کیا کہ حضرت ریل سے سفر فرمارہے تھے اور یہ صاحب خادم کی حیثیت سے حضرت کے ساتھ تھے انہیں استنجاء کا تقاضہ ہوا۔ بیت الخلاء کا دروازہ کھولا تو اس کو بہت غلیظ اور گندہ دیکھ کر واپس آگئے اور اپنی جگہ پر آکر بیٹھ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد حضرت مولانا تیزی کے ساتھ اپنی جگہ سے اٹھے اور بیت الخلاء میں داخل ہو کر اندر سے دروازہ بند کرلیا۔ چند منٹ

کے بعد تشریف لائے اور اپنے ان خادم سے کہا کہ اب چلے جاؤ ——— انھوں نے جا کر دیکھا تو معلوم ہوا کہ حضرت ان کی واپسی کی وجہ محسوس کر کے بیت الخلا صاف کرنے ہی کے لیے اندر تشریف لے گئے تھے اور جب لوٹے بھر بھر کے بہت سا پانی بہا دیا اور اس کو صاف کر دیا تو باہر تشریف لائے ——— کچھ حد ہے اس تواضع اور بے نفسی کی؟

کئی سال پہلے کی بات ہے حضرت کے ضعفِ پیری اور بعض دوسری اہم مصلحتوں کی بنا پر حضرت کے چند نیاز مندوں نے (جن میں یہ عاجز بھی شامل تھا) باہم مشورہ کر کے ایک دفعہ حضرت سے عرض کیا کہ حضرت اب صرف وہ سفر فرمایا کریں جس کی کوئی خاص ضرورت اور اہمیت ہو اور یہ جو ہو رہا ہے کہ لوگ معمولی معمولی مقامی ضرورتوں اور جلسوں کے لیے حضرت کو تکلیف دیتے ہیں، اور حضرت قبول فرما لیتے ہیں (اور اسی طرح ہر ہفتے میں جمعہ کے ایک دن کا سفر تو ضرور ہی ہوتا ہے) یہ سلسلہ اب بند قرار دیا جائے۔ حضرت نے فرمایا میں کیا کروں لوگ آجاتے ہیں اور اصرار کرتے ہیں، عرض کیا گیا کہ اگر حضرت طے فرما لیں کہ اس سلسلہ کو بند کرنا ہے تو تھوڑے عرصہ تک تو ایسا ہوگا کہ لوگ آئیں گے اور حضرت کے انکار فرما دینے پر مایوس واپس چلے جائیں گے۔ اس کے بعد عام طور سے لوگوں کو معلوم ہو جائے گا کہ حضرت نے اب یہ فیصلہ فرما لیا ہے تو پھر اس غرض سے لوگ آیا بھی نہیں کریں گے۔ فرمایا مجھ سے تو یہ ہو نہیں سکتا کہ اللہ کے بندے آئیں اور وہ کہیں چلنے کے لیے اصرار کریں اور میں انکار پر جازم ہوں عرض کیا گیا کہ حضرت کی صحت اور حضرت کا وقت بہت قیمتی ہے اس کو صرف ضرورت اور موقعے ہی پر صرف ہونا چاہیے۔ حضرت نے خاکساری اور تواضع

میں ڈوبے ہوئے لہجے میں فرمایا آپ لوگ یہ کیا کہتے ہیں میں کیا ہوں اور میری کیا قیمت ہے، یہ مٹی کا جسم ہے جب تک چل رہا ہے اس سے کام لے لینا چاہیے۔

عزیمت یا شدت فی امر اللہ

حضرت مولانا میں جہاں تواضع اور خاکساری اس درجہ کی تھی جس کا اوپر کی سطروں میں ذکر ہوا وہیں بظاہر اس کے بالکل برعکس یہ بات بھی تھی کہ جس راستے پر چلنے کو وہ حق سمجھ لیتے پھر کسی کا کہنا سننا کسی کا ساتھ دینا یا ساتھ نہ دینا، کسی کی رضامندی یا ناراضگی کسی کی تحسین یا ملامت۔ حتیٰ کہ کوئی زلزلہ اور کھونچال بھی ان کو اس راستہ سے ہٹا نہیں سکتا تھا ـــــ اس کی سب سے روشن مثال ان کا سیاسی مسلک اور اس سلسلہ کی ان کی سرگرمیاں ہیں۔

ہندوستانی سیاسیات کے بارہ میں ایک رویہ کو صحیح سمجھ کر انھوں نے اپنا لیا تھا، جو لوگ دس بارہ سال پہلے[1] کے واقعات بھولے نہیں ہیں انھیں یاد ہوگا کہ مولانا کو اس راہ میں کیسے کیسے ناموافق حالات اور کتنے سخت طوفانوں کا مقابلہ کرنا پڑا اور عزت و آبرو تک کی کیسی کیسی قربانیاں دینی پڑیں لیکن یہ واقعہ ہے کہ جس دور میں جتنی زیادہ مخالفت بڑھی حضرت مولانا کو اس زمانہ میں اتنا ہی زیادہ مضبوط و تیز تر اور پرجوش پایا گیا۔

---

[1] ملحوظ رہے کہ یہ مضمون حضرت مدنی رحمۃ اللہ علیہ کے وصال کے بعد ۱۳۷۷ھ میں لکھا گیا تھا۔

اس سیاسی میدان میں حضرت مولانا کے ساتھ علماء اور غیر علماء میں اور بھی بہت سے تھے، لیکن جاننے والے جانتے ہیں کہ حضرت مولانا کی شان اس معاملہ میں بالکل نرالی تھی وہ جب کسی نجی مجلس میں بھی اس موضوع پر بات کرتے تھے تو صاف معلوم ہوتا تھا کہ انھیں اپنے راستے کا ایسا یقین ہے اور وہ اتنے یکسو ہیں کہ دوسرے پہلو کو سننے اور سوچنے کے لیے بھی تیار نہیں ہیں اور یہ کہ اس مسئلہ کا تعلق ان کے دماغ سے کہیں زیادہ ان کے قلب اور ان کی روح سے ہے۔ یہ میں نے ایک ایسے مسئلہ کی مثال دی ہے جس میں حضرت مولانا کی عزیمت اور شدت کا تجربہ قریب قریب پورے اسلامی ہند نے کیا تھا۔ اس کے علاوہ زندگی کے دوسرے دائروں میں بھی بہت سی ایسی مثالیں یاد ہیں کہ حضرت مولانا نے جس چیز کو حق اور جس رویہ کو اپنے لیے صحیح سمجھ لیا پھر ان کے خاص معتمد اور نیاز مند بھی ان کا رویہ بدلوانے اور رخ موڑنے کی کوششوں میں کامیاب نہیں ہو سکے، اِلّا یہ کہ رائے ہی میں کوئی تبدیلی ہو جائے ــــ یہاں صفائی سے یہ بھی عرض کرنے کو جی چاہتا ہے کہ ایسی ناکامی کا تجربہ ایک سے زیادہ دفعہ خود راقم سطور کو بھی ہوا ہے۔

ایثار و فیاضی اور مہمان نوازی

ناظرین نے ایثار و فیاضی کے بہت سے نمونے دیکھے ہوں گے۔ خود اس عاجز نے بھی دیکھے ہیں لیکن حضرت مولانا کی ذات میں اس کا جو نمونہ دیکھا اس کی مثالیں تو پچھلی تاریخ کی کتابوں میں بھی بہت کم ہی مل سکیں گی۔

مولانا کا دولت خانہ ایک ایسا وسیع مسافر خانہ یا مہمان خانہ تھا کہ جن لوگوں کو خود کبھی مولانا کا مہمان بننے کا اتفاق نہیں ہوا وہ کسی دوسرے سے اس کا حال سن کر صحیح اندازہ نہیں کر سکتے ___ بیسوں دفعہ کے اپنے مشاہدے اور تجربہ کی بنا پر میرا محتاط اندازہ ہے کہ برسہا برس سے مولانا کے یہاں مہمانوں کا اوسط چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ رہتا تھا ان میں ایک خاصی تعداد تو ان اہلِ طلب کی ہوتی تھی جو حضرت سے بیعت ہونے کے لیے دور و قریب کے مختلف مقامات سے روزانہ آتے تھے ان کے علاوہ ایک تعداد ان لوگوں کی ہوتی تھی جو صرف زیارت و ملاقات کے لیے یا کسی معاملہ میں دعا کی درخواست کے لیے یا اپنی کسی ضرورت میں حضرت مولانا کی سفارش حاصل کرنے کے لیے یا ایسے ہی کسی اور کام سے حضرت کی خدمت میں حاضر ہوتے تھے، اور ایک دو دن رہ کر واپس چلے جاتے تھے، ان کے علاوہ کچھ حضرات وہ بھی ہوتے تھے جو ذکر و شغل اور روحانی تربیت کے لیے کئی کئی مہینے حضرت کی خدمت میں مقیم رہتے تھے، اور میرا خیال ہے کہ مہمانوں کی ان قسموں کے علاوہ کچھ لوگ حضرت مولانا کی اس فیاضی اور مہماں نوازی سے بے جا فائدہ اٹھانے والے بھی ہوتے تھے۔ میں نے واقفین سے سنا ہے کہ قرب و جوار کے دیہات کے بعض لوگ جو بازار، تھانہ یا تحصیل کے اپنے کاموں سے دیوبند آتے تھے وہ بھی کھانے کے وقت حضرت کے مہمان بن جاتے تھے اور حضرت ان کی اس نوعیت سے واقف ہونے کے باوجود ان کی مہماں نوازی کرتے تھے بلکہ خادموں تک کو سخت تاکید تھی کہ اگر کسی کے متعلق ایسا اندازہ ہو تب بھی مہمانوں ہی کی طرح اس کا اکرام کیا جائے۔ مجھے حضرت کے ایک خادم نے خود بتایا کہ ایک دفعہ انھوں نے ایسے ہی ایک صاحب

سے کچھ کہہ دیا تو حضرت ان پر سخت خفا ہوئے اور یہاں تک فرمایا کہ میرے یہاں آنے والے کسی بھی مہمان کا جو شخص دل دکھائے گا میں اس کو معاف نہیں کروں گا۔

بہرحال مختلف انواع واقسام کے ان مہمانوں کی تعداد کا اوسط جیسا کہ اس ناچیز نے عرض کیا چالیس پچاس روزانہ سے کم نہ تھا۔ اگر کبھی صرف تیس پینتیس ہوتے تھے تو اسی طرح کبھی ساٹھ ستر تک بھی ہو جاتے تھے۔

حضرت مولانا دونوں وقت مہمانوں کے ساتھ ہی بیٹھ کر کھانا کھاتے تھے اور سب مہمان وہی کھاتے تھے جو خود حضرت کھاتے تھے۔

اگر کسی مخصوص مہمان کے اکرام میں کوئی خاص اہتمام اور تکلف کیا جاتا مثلاً پلاؤ دیکتا یا ثرید تیار کیا جاتا، یا دیوبند کی مشہور فرنی آتی تو بلا امتیاز سارے مہمان اس دن وہی کھانا کھاتے اور میرا خیال ہے کہ ہفتے میں ایک دو دفعہ ایسا ضرور ہوتا تھا۔

یہاں اس چیز کا ذکر کر دینا بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگا کہ حضرت کے یہاں کا روزمرہ کا سادہ کھانا بھی (یعنی روٹی اور آلو یا آلو کی جیسی کسی ترکاری کے ساتھ بڑے گوشت کا شوربہ والا سالن) اس قدر لذیذ اور ذائقہ دار ہوتا تھا کہ میں خود بھی شہادت دے سکتا ہوں اور بہت سے مہمانوں سے بھی میں نے سنا ہے کہ حضرت کے دسترخوان پر بیٹھ کر سوایا یا ڈیوڑھا کھانا کھایا جاتا ہے اور کبھی نقصان نہیں دیتا ــــ جو لوگ حضرت کے حالات سے کچھ باخبر ہیں اور جنھوں نے حضرت کی عجیب وغریب اور بے مثل مہمان نوازی کا تجربہ کیا ہے ان کو اس میں شک نہیں ہو سکتا کہ روزمرہ کی اس مہمان نوازی اور اسی طرح کی بعض دوسری علمی مدوں میں حضرت کے

ہاتھوں سے جو کچھ دوسروں پر خرچ ہوتا تھا، خود اپنی ذات پر اور اہل و عیال پر اس کا چوتھائی بھی خرچ نہیں ہوتا ہوگا۔

کسی بندے کے ظاہری احوال و اعمال سے اس کے اندرونی حال کے بارے میں جہاں تک رائے قائم کرنے کا حق ہے اس کی بنا پر پورے وثوق کے ساتھ کہا جا سکتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے شح اور حبِ مال سے حضرت کے قلب و روح کو ایسا صاف کر دیا تھا کہ شاید اس کے غبار کا کوئی ذرہ بھی وہاں نہیں رہا تھا اور ان شاء اللہ حضرت مولانا اس قرآنی بشارت کے خاص مستحقین میں ہوں گے۔

وَمَنْ يُّوْقَ شُحَّ نَفْسِهٖ فَاُولٰٓئِكَ هُمُ الْمُفْلِحُوْنَ ۔ تغابن۔

اور اللہ نے اپنے جن بندوں کو شح اور حبِ مال کی بری خصلت سے بچالیا وہ یقیناً فلاح پانے والے ہیں۔

ایک واقعہ اس جگہ اور بھی سن لیجیے جس سے حضرت مولانا کی اس خصوصیت (یعنی ایثار و فیاضی اور دوسروں کی راحت رسانی کا فکر و اہتمام) کے علاوہ ایسی ہی بعض اور خصوصیات بھی آپ کو معلوم ہوں گی۔

غالباً ۱۹۲۳ء یا ۱۹۲۴ء کی بات ہے، سوامی شردھانند کی اٹھائی ہوئی شدھی سنگھٹن کی تحریک کے اثرات سے مسلمانوں کے دین و ایمان کی حفاظت کے لیے جمعیۃ العلماء ہند کا شعبۂ تبلیغ میدان میں اترا ہوا تھا۔ اس وقت اس کے سامنے تبلیغی وفود کے ذریعہ وقتی دفاعی ایکشنوں کے علاوہ ان علاقوں میں جو شدھی تحریک کا خاص میدان بنے ہوئے تھے مذہبی مکاتب قائم کرنے کا ایک ٹھوس، مستقل اور وسیع کام بھی تھا، جس کے لیے بہت بڑے سرمایہ کی ضرورت تھی ___ جمعیۃ العلماء ہند اور

اکابر دار العلوم دیوبند سے تعلق رکھنے والے رنگون کے صاحب خیر تاجروں نے اس سلسلہ میں مالی امداد کا ایک منصوبہ تیار کیا اور جمعیۃ العلماء ہند سے اپنا ایک وفد برما بھیجنے کی درخواست کی۔ اس وقت برما ہندوستان ہی کا ایک صوبہ تھا ـــــ یہ وفد رنگون پہنچا، حضرت مولانا سید حسین احمد مدنی رحمۃ اللہ علیہ اور مولانا احمد سعید صاحب (جو اس وقت جمعیۃ کے ناظم تھے) اس وفد کے ارکان تھے ـــــ مولانا سید مرتضیٰ حسن صاحب مرحوم بھی اس وفد کے ساتھ تھے، لیکن جہاں تک مجھے یاد ہے وہ اہل رنگون ہی کی دعوت پر دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے تشریف لے گئے تھے۔ (شدھی سنگٹھن کے دفاع میں دار العلوم دیوبند کے شعبۂ تبلیغ کی طرف سے بھی مستقل کام ہو رہا تھا۔)

بہرحال یہ تینوں حضرات رنگون پہنچے ـــــ صوبہ برما کے اس وقت کے انگریز گورنر نے یا اس کی ہدایت پر اس کے ماتحت کسی انگریز حاکم نے یہ حماقت کی کہ رنگون کے جن سورتی تاجروں نے ان حضرات کو دعوت دے کر بلایا تھا اور جو اس سلسلہ میں پیش پیش تھے، ان کو بلا کر اس نے کہا کہ آپ کے یہاں جو یہ تین عالم لوگ آئے ہیں ان میں ایک آدمی مولانا حسین احمد بہت خطرناک ہیں اور گورنمنٹ کے دشمن ہیں اس لیے ان کو ہم یہاں تقریر کرنے کی اجازت نہیں دے سکتے۔ ان لوگوں نے کہا کہ اس وقت یہ وفد ایک بالکل دوسرے مقصد سے آیا ہے اس لیے اس کا کوئی شبہ بھی نہیں ہے کہ ان میں سے کوئی گورنمنٹ کے خلاف تقریر کرے۔ لیکن اس نے کہا، ہمیں معلوم ہے کہ وہ بہت خطرناک آدمی ہیں اس لیے ان کو تقریر کی اجازت نہیں دی جا سکتی ـــــ

بالآخران سورتی تاجروں نے (جو گورنمنٹ کی نگاہ میں بھی خاص وقار رکھتے تھے) اس کی ذمہ داری لی کہ کوئی تقریر گورنمنٹ کے خلاف نہیں ہوگی، تب اس نے اجازت دی۔ ان بیچاروں نے یہ ساری بات حضرت کے سامنے بھی ذکر کر دی، حضرت نے فرمایا آپ نے اچھا نہیں کیا کہ مجھ سے دریافت کیے بغیر وعدہ کر آئے۔ یہ صحیح ہے کہ گورنمنٹ کے متعلق کچھ کہنے کا اس وقت میرا ارادہ نہیں تھا، لیکن اب مجھ سے یہ نہیں ہو سکتا کہ میں تقریر کروں اور گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں، لہٰذا آپ حضرات کے لیے اب یہی بہتر ہے کہ میں تقریر نہ کروں اور واپس چلا جاؤں لیکن رنگون کے وہ حضرات کسی طرح اس پر راضی نہ ہوئے، آخر میں انھوں نے عرض کی کہ آج حضرت کی تقریر تو ضرور ہوگی اور جو حضرت کا جی چاہے وہی فرمائیں پھر جو کچھ ہوگا دیکھا جائے گا ___ لیکن حضرت مولانا اس خیال سے کہ کہیں یہ بے چارے مشکلات میں مبتلا نہ ہوں برابر انکار فرماتے رہے، آخر میں حضرت مولانا مرتضیٰ حسن صاحب نے بھی اُن کی سفارش کی تو بڑی مشکل سے حضرت اس بات پر راضی ہوئے کہ آج تقریر فرما دیں گے لیکن اس کے ساتھ یہ شرط لگا دی کہ اس کے بعد کوئی تقریر نہ کروں گا اور پہلے جہاز سے واپس چلا جاؤں گا۔ حضرت مولانا نے (انھیں کی خیر خواہی کے لیے) اس شرط پر اتنا اصرار کیا کہ ان لوگوں کو بادلِ ناخواستہ مان لینا پڑا ___ وقت آنے پر جلسہ شروع ہوا حضرت مولانا نے خطبۂ مسنونہ اور چند تمہیدی الفاظ کے بعد تقریر اس طرح شروع فرمائی، کہ مجھے معلوم ہوا ہے کہ یہاں کے گورنر صاحب نے ہمارے محترم میزبانوں سے میرے بارے میں خطرہ کا اظہار کر کے میری تقریر کو روکنا چاہا تھا، اور یہ حضرات اپنی سادگی

سے یہ وعدہ کر آئے کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا۔ مجھے ان کے اس وعدے کا افسوس ہے لیکن بہرحال اب مجھے ان کے وعدے کی لاج رکھنی ہے۔ اگر وہ یہ وعدہ نہ کر آتے تو میں تفصیل سے بتاتا کہ گورنمنٹ مجھے کیوں خطرناک مجھتی ہے اور مجھے گورنمنٹ سے کیا شکایت ہے۔ میں بتاتا کہ گورنمنٹ نے پوری اسلامی دنیا کو اور ہمارے ملک ہندوستان کو اور ہم ہندوستانیوں کو کتنا تباہ و برباد کیا ہے ــــ بیان کرنے والے کا بیان ہے ــ کہ تقریباً ڈیڑھ گھنٹے تک مولانا یہی بیان فرماتے رہے کہ اگر ہمارے میزبان وعدہ نہ کر آتے تو میں یہ بتاتا اور یہ بتاتا ــــ آخر میں فرمایا کہ چونکہ ہمارے محترم میزبانوں نے گورنر صاحب سے وعدہ کرلیا کہ میں گورنمنٹ کے خلاف کچھ نہ کہوں گا اس لیے میں مجبور ہو گیا ہوں اور میں اس سلسلہ میں کچھ نہیں کہتا ــــ پھر چند کلمات وفد کے مقصد کے متعلق بھی کہہ کر تقریر ختم فرمائی۔

حضرت مولانا اپنی شرط کے مطابق غالباً دوسرے یا تیسرے ہی دن بحری جہاز سے کلکتہ کے لیے روانہ ہو گئے۔ حاجی داؤد ہاشم مرحوم نے (جو وفد کے خاص داعی اور میزبان تھے) اپنے خاص ملازم محمد ذاکر صاحب کو بطور خادم کے کلکتہ تک کے لیے حضرت کے ساتھ کر دیا۔ حضرت کا ٹکٹ فرسٹ کلاس کا تھا اور ذاکر صاحب کا ٹکٹ سرونٹ کی حیثیت سے تھرڈ کا تھا۔ حضرت مولانا کی سیٹ جس کمرہ میں تھی اس میں کوئی دوسرا مسافر نہ تھا اس لیے حضرت چاہتے تھے کہ ذاکر صاحب بھی زیادہ سے زیادہ وقت وہیں حضرت کے ساتھ رہیں۔ لیکن جہاز کا "بوائے" جب آتا تو ذاکر صاحب کے ہر وقت وہاں رہنے پر معترض ہوتا۔ اس لیے حضرت مولانا نے یہ کیا کہ

وہ خود زیادہ وقت تھرڈ کلاس میں ذاکر صاحب کے ساتھ گزارنے لگے۔ بہرحال سفر ختم ہوا اور چوتھے دن کلکتہ کا ساحل آگیا۔ رواج کے مطابق "بوائے" فرسٹ کلاس کے مسافروں سے "انعام" یا "بخشش" مانگنے آیا اگرچہ راستے میں اس نے حضرت مولانا کو تکلیف دی تھی لیکن "انعام" مانگنے کے لیے وہ حضرت کی خدمت میں بھی حاضر ہوا، ذاکر صاحب بھی اس وقت ساتھ تھے، انھوں نے عرض کیا کہ حضرت اس نے ہم لوگوں کو بہت تکلیف دی ہے اسے ایک پیسہ نہ دیجئے، لیکن مولانا نے ہنس کے فرمایا کہ نہیں، ان کا حق ان کو ضرور دیا جائے گا ــــــ (آگے کی بات سننے سے پہلے یہ ذہن میں رکھ لیا جائے کہ یہ قصہ اس وقت کا ہے جب کہ ایک روپیہ آج کے ۱۰۰ روپے کے برابر تھا اس لیے جو لوگ بڑے سے بڑا انعام بھی بوائے کو دیتے تھے وہ زیادہ سے زیادہ ایک روپیہ ہوتا تھا)۔ اس کے بعد سنیے کہ مولانا نے گن کر چار روپے نکالے اور اس کو دینے لگے وہ سمجھا کہ یہ مجھ سے مذاق کرتے ہیں اور اس طرح میری بدسلوکی کا انتقام لینا چاہتے ہیں اس لیے اس نے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ حضرت مولانا نے فرمایا لے لو یہ تمھارے ہی لیے ہیں، آخر بہت جھجکتے ہوئے اس نے ہاتھ بڑھایا اور حضرت نے وہ روپے اس کو دے دیئے ــــــ راقم سطور عرض کرتا ہے کہ خود محمود ذاکر صاحب نے مجھ سے بیان کیا کہ میں نے حضرت سے عرض کیا کہ اس کم بخت نے تو حضرت کو اتنی تکلیف دی کہ خدمت کے لیے مجھے حضرت کے ساتھ بھی نہ رہنے دیا اور حضرت نے اسے اکٹھے چار روپے دے دیئے بڑے سے بڑا انگریز بھی ان لوگوں کو ایک روپیہ سے زیادہ نہیں دیتا۔ حضرت نے فرمایا، بھائی ذاکر اصل بات یہ ہے کہ یہ بے چارہ سمجھتا تھا کہ تھرڈ

بس صاحب بہادروں سے ملتا ہے، ہماری صورتوں سے اُسے کچھ لینے کی اُمید نہیں تھی اس لیے اس نے ہمارے ساتھ ایسا برتاؤ کیا۔ اب ہمارا سفر تو ختم ہوگیا۔ میں نے یہ روپے اسے اس لیے دیئے ہیں کہ اُسے معلوم ہو کہ ہم جیسے لوگ انگریزوں سے زائد دے سکتے ہیں۔ اب مجھے امید ہے کہ ہماری ایسی صورت والے اللہ کے کسی بندے کو انشاء اللہ یہ آئندہ نہیں ستائے گا بلکہ ان کو آرام پہنچانے کی کوشش کرے گا۔

اسی ایک واقعہ سے حضرت کی عالی ظرفی اور مزاجِ ایمانی کا اندازہ کیا جاسکتا ہے۔

عنداللہ مقبولیت کی ایک خاص نشانی

بعض حدیثوں میں اللہ کے خاص مقبول بندوں کی یہ نشانی بتائی گئی ہے کہ انہیں دیکھ کر اور ان کے پاس بیٹھ کر خدا یاد آتا ہے ــــ اس یاد کے لیے جس ایمانی مناسبت اور جس توفیق کی ضرورت ہے جو لوگ اس سے محروم ہیں ان کا تو ذکر نہیں لیکن جن کو اللہ نے اس خیر سے محروم نہیں کیا ہے اُن میں سے جس کو بھی حضرت سے قریب ہونے اور خدمت میں حاضر ہونے کا موقع ملا ہوگا، یقین ہے کہ اس کو اس کا تجربہ ضرور ہوا ہوگا کہ ان کے پاس بیٹھ کر یا ان کو دیکھ کر دل میں خدا کی یاد اور آخرت کی فکر پیدا ہوتی تھی ــــ خود اپنے بارے میں صفائی سے عرض کرتا ہوں کہ بہت سے امور میں میری رائے حضرت سے متفق نہیں ہوتی تھی اور رائے میں اختلاف ہوتا لیکن جب خدمت میں حاضری ہوتی تو یقین تازہ ہو جاتا کہ یہ اللہ کے خاص الخاص بندوں میں سے ہیں اور مجھ جیسوں کے لیے ان کی جوتیاں صاف کرنا اور قدموں کا غبار چہرے پر ملنا بھی سعادت ہے۔ اللہ تعالیٰ کی ان پر رحمتیں نازل ہوں اور ان کی پاک اولاد کے ورثہ سے ہم کو محروم نہ رکھے۔ (ماخوذ خدامِ سندیں ماہنامہ الفرقان لکھنؤ)

حضرت مولانا شاہ وصی اللہ علیہ الرحمۃ والرضوان

حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہ کے جلیل القدر خلیفہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ عقیدت ومحبت اور اس عاجز وعاصی پر حضرت ممدوح کی عنایت وشفقت بھی اللہ تعالیٰ کی خاص قابل شکر اور لائق ذکر نعمتوں میں سے ہے۔ حضرت ممدوح کا اصل وطن ضلع اعظم گڑھ (یوپی) کے مشہور قصبہ کوپاگنج کے قریب ایک گاؤں "فتح پور تال نرجا" تھا ــــ حضرت کا تذکرہ تو بار بار بہت پہلے سے سنا تھا لیکن زیارت کا اتفاق پہلی دفعہ اب سے قریباً ۲۰-۲۲ سال پہلے ۱۹۴۵ء یا ۱۹۴۶ء میں ہوا تھا، مہینہ غالباً جون کا تھا، راقم سطور کا قیام اس زمانہ میں بریلی میں تھا اور تبلیغی جماعتوں کے ساتھ سفر کرنے کی سعادت اُس دور میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے کچھ زیادہ نصیب ہوئی تھی (جس میں پہلے تو ضعف ہمت اور بعض خاص مصروفیات کی وجہ سے کمی آئی اور اب سفر سے معذور ہوجانے کی وجہ سے بالکل ہی محرومی ہوگئی ہے جس کو یہ عاجز اپنا بڑا خسارہ سمجھتا ہے) بہر حال اسی دور میں ایک تبلیغی جماعت کے ساتھ مشرقی یوپی کے چند اضلاع اعظم گڑھ، گورکھپور وغیرہ کے دورہ کا پروگرام بنا ــــ اس جماعت میں ہمارے نہایت محترم بزرگ

دوست صوفی سید عبد الرب صاحب (ایم اے) مرحوم بھی تھے اور اُن کے خاص دوست اور رفیق مولانا سراج الحق صاحب مچھلی شہری. بی اے بھی (جو ابھی پچھلے مہینہ انتقال فرما کر انہیں کے ساتھ جا ملے رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ واسعۃ) اور ان کے ایک دوسرے خاص رفیق ماسٹر محمد ابراہیم صاحب الٰہ آبادی، (ایم اے) بھی ساتھ تھے ـــــ یہ تینوں حضرات ہم مشرب و ہم مذاق تھے. انگریزی تعلیم گاہوں اسکولوں یا کالجوں کے اساتذہ تھے. تینوں کو حکیم الامت حضرت مرشد تھانویؒ سے بیعت کا شرف حاصل تھا اور تینوں کو تبلیغی جماعت کے ساتھ سفر کرنے کا یہ پہلا موقع تھا۔

ہماری یہ جماعت ضلع اعظم گڑھ کے مشہور قصبہ مئو پہنچی، وہاں غالباً تین دن قیام کا پروگرام تھا، یہ تینوں حضرات حضرت مولانا شاہ وصی اللہؒ سے اچھی طرح واقف بلکہ اُن کے نیازمندوں میں تھے ـــــ میں صرف غائبانہ عقیدت رکھتا تھا. ان تینوں حضرات نے کہا کہ مئو کے اس قیام ہی کے دوران میں ہم کسی وقت حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لیے فتحپور تال نرجا جانا چاہتے ہیں، میں نے بھی ان حضرات کے ساتھ جانے کا ارادہ کر لیا۔ جماعت کے امیر ہمارے مولانا عبید اللہ صاحب بلیاوی تھے ان سے اجازت لے کر فتحپور جانے کا پروگرام بنا لیا گیا۔ ہم چاروں میں سے کوئی بھی اس سے پہلے فتحپور نہیں گیا تھا ـــــ اتنا معلوم ہو گیا تھا کہ یہاں سے کوپاگنج کے لیے یکے جاتے ہیں. وہاں سے فتحپور پیدل جانا ہوگا۔ ہم لوگ شام کو بعد مغرب روانہ ہو سکے اور پروگرام یہ بنایا کہ رات کو کوپاگنج کسی مسجد میں قیام کریں اور علی الصبح وہاں سے فتحپور کے لیے روانہ ہو جائیں۔ ہم لوگ رات کو کچھ دیر سے کوپاگنج پہنچ سکے۔ کسی سے کھانے کی دوکان کے بارے میں

دریافت کیا تو معلوم ہوا کہ ایسی کوئی دوکان یہاں نہیں ہے (یا یہ کہ اب بند ہو چکی ہے۔) جن صاحب سے ہم نے دوکان کے بارے میں دریافت کیا تھا، انکو ہم نے ان کے دریافت کرنے پر یہ بتلا دیا تھا کہ ہم لوگ تبلیغی جماعت کے ساتھ مؤ آئے تھے۔ اس وقت فتحپور جانے کے لیے آئے ہیں، رات کو یہیں کسی مسجد میں قیام کریں گے اور صبح انشاء اللہ فتحپور حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کی زیارت کے لیے جائیں گے ــــ یہ معلوم ہو جانے کے بعد کہ اس وقت کھانا کسی دوکان سے نہیں مل سکے گا ہم لوگوں نے طے کیا کہ چنے یا دال موٹھ یا مٹھائی جیسی کوئی بھی چیز مل جائے تو اسی سے کام چلا لیا جائے۔ اتنے میں کچھ صاحبان آئے اور انھوں نے کہا کہ آپ لوگ کچھ نہ خریدیں ہم کھانا لاتے ہیں، ہم لوگوں نے شکریہ اور دعا کے ساتھ مناسب انداز میں اُن سے معذرت کر دی کیونکہ ہم اس سفر میں تبلیغی جماعت کے عام اصول کے مطابق کسی پر بار ڈالنا نہیں چاہتے تھے۔ بہرحال اس وقت جو کچھ کسی دوکان سے مل گیا وہ لے کر مسجد میں آگئے، پہلے عشاء کی نماز ادا کی پھر کھانے کے ارادے سے بیٹھے ہی تھے کہ ایک حاجی صاحب ایک طشت میں ہم تینوں کے لیے پورا کھانا لے کر مسجد میں تشریف لائے اور کہا کہ میں حضرت مولانا کا خادم ہوں، آپ حضرت کے مہمان ہیں، اور یہ کھانا گویا حضرت ہی کی طرف سے ہے، اس کو آپ قبول فرمالیں، اُن کی بات سے یہ اندازہ کر کے کہ یہ اللہ کے مخلص بندے اور حضرت کے تربیت یافتہ ہیں، اُن کے شکریہ اور اللہ تعالیٰ کے شکر کے ساتھ اس کا کھانا ہی سعادت سمجھا اور اللہ تعالیٰ کا خاص عطیہ سمجھ کر کھایا۔ کھانا بہت اعلیٰ قسم کا تھا جیسا کہ خاص مہمانوں کے لیے اہتمام سے تیار کیا جاتا ہے۔ (یہ بات ظاہر تھی کہ وہ فوری طور پر

تیار نہیں کیا گیا تھا بلکہ پہلے سے تیار شدہ تھا، یہ خدا ہی جانتا ہے کہ اُن حاجی صاحب نے کیوں تیار کرا کے رکھا تھا) پھر صبح کو انھوں نے ناشتہ بھی ایسا ہی کرایا اور اپنے ذاتی یکے سے (جو بہت اعلیٰ قسم کا تھا) ہم لوگوں کو فتحپور تال نرجا پہنچایا ـــــ اللہ تعالیٰ ان کو بہتر سے بہتر جزا عطا فرمائے۔

۳۲-۳۳ سال پہلے کی بات ہے افسوس ہے کہ ان کا نام اب یاد نہیں رہا۔ راقم سطور کے لیے حضرت مولانا کی خدمت میں حاضری اور زیارت کا یہ پہلا موقع تھا۔ حضرت نے بڑی عنایت فرمائی، جتنی دیر مجلس میں حاضری رہی، اصلاحِ نفس اور تزکیۂ اخلاق ہی حضرت کی گفتگو کا موضوع رہا ـــــ اُس وقت حضرت ممدوح میں ایک خاص قسم کی اضطرابی اور سیمابی کیفیت محسوس ہوتی تھی، معلوم ہوتا تھا کہ پورے وجود میں کوئی برقی رو دوڑ رہی ہے۔ ہم لوگ صبح کو پہنچے تھے، اپنے پروگرام کے مطابق شام کو مئو واپس آگئے۔ حضرت کی خدمت میں اس پہلی حاضری اور زیارت کو راقم سطور نے اپنے حق میں اللہ تعالیٰ کی ایک خاص نعمت سمجھا۔

اس کے ۳-۴ سال بعد ۴۶ء میں فتحپور تال نرجا ہی میں حضرت کی خدمت میں دوسری دفعہ حاضری کی سعادت حاصل ہوئی۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ کچھ ہی پہلے فرقہ وارانہ فسادات کی ایک طوفانی لہر بنگال سے اٹھ چکی تھی اور بہت سے مسلمانوں کے سامنے (۴۶ء کے بعد) پھر یہ سوال کھڑا ہو گیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا نہیں؟ ـــــ یہ عاجز انہی دنوں میں کسی ضرورت سے مئو گیا تھا، وہیں ایک خواب دیکھا جس نے ذہن میں یہ سوال پیدا کر دیا کہ حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب ہندوستان ہی میں مقیم رہیں گے یا پاکستان تشریف لے جائیں گے؟ ـــــ میں نے فوراً ہی یہ کھا کر

فتح پور حاضر ہو کر حضرت کی زیارت بھی کر دوں اور اگر موقع ملے تو اس بارہ میں دریافت کروں، چنانچہ حاضری کا پروگرام بنالیا۔ (جیسا کہ اوپر عرض کیا جاچکا ہے مئو سے کوپاگنج یکے چلتے تھے آگے فتح پور کے لئے کچی سڑک پیدل چلنا ہوتا تھا۔ ایک دن میں ایک یکہ سے روانہ ہو گیا، اس یکہ پر ۴۔۵ آدمی اور بھی سوار تھے جو سب کوپا جانے والے تھے ــــ راستہ میں میں نے یکہ والے سے کہا کہ مجھے فتح پور تال نرجا جانا ہے اور آج ہی واپس لوٹنا ہے، اگر تم مجھے فتح پور تک پہنچا سکو تو پہنچادو، جو کرایہ تم کہو گے میں خوشی سے دوں گا اور تمہارا احسان بھی مانوں گا ــــ یکہ والے نے راستہ کی خرابی کا عذر کیا، بالآخر وہ اس پر آمادہ ہو گیا کہ جہاں تک راستہ زیادہ خراب نہیں ہے وہ مجھے وہاں تک یکہ ہی سے پہنچا دے گا ــــ اسی یکہ پر ایک تعلیم یافتہ ہندو نوجوان بھی تھا، اُس نے مجھ سے پوچھا کہ آپ فتح پور کس کے پاس جائیں گے؟ میں نے کہا وہاں ہمارے ایک بزرگ ہیں ان سے بس ملنے جا رہا ہوں ــــ اس نے کہا اچھا وہ جو فتح پور کے شاہ صاحب ہیں، آپ اُن کے درشن کرنے جا رہے ہیں؟ میں نے کہا ہاں میں انھیں کے درشن کرنے جا رہا ہوں ــــ میں نے اس نوجوان سے پوچھا آپ اُن کو جانتے ہیں؟ اُس نے کہا، بس اُن کا نام سنا ہے، مجھے بھی ان کے درشن کرنے کا بہت شوق ہے ــــ میں نے کہا کہ آپ کو اُن کے درشن کرنے کا کیوں شوق ہے؟ اس نے کہا کہ میں کانپور رکا رہنے والا ہوں، میرے ہاں رنگ کا بیوپار ہوتا ہے، میں اس کے سلسلہ میں ملک بھر میں گھومتا ہوں، ہزاروں ہندوؤں مسلمانوں سے واسطہ پڑتا ہے، یہاں کوپا میں بھی ہمارے ایک بیوپاری حاجی صاحب ہیں، ۵۵

بڑے ہی ایمان دار سچے اور دھرمی آدمی ہیں، مہاتما ہیں، ایسا آدمی میں نے کہیں نہیں دیکھا، نہ ہندوؤں میں نہ مسلمانوں میں، میں نے ان سے ایک دفعہ پوچھا تھا کہ تم میں ایسی سچائی اور ایمان داری کہاں سے آگئی؟ تو انھوں نے مجھ سے کہا کہ مجھ میں تو کچھ بھی اچھائی نہیں ہے، میں تو بہت گندہ آدمی ہوں، ہاں یہاں سے قریب ہی مجھو رتال نرجا ایک گاؤں ہے، اس میں ہمارے ایک بزرگ مولانا صاحب ہیں میں اُن کے پاس آتا جاتا ہوں، اگر تمھیں میرے اندر کوئی اچھائی نظر پڑتی ہے تو وہ اُن کا اثر ہوگا۔ اور بھی کئی آدمیوں سے میں نے ان مولانا صاحب شاہ صاحب کا ذکر سنا ہے، اس لیے مجھے بھی اُن کے درشن کرنے کا شوق ہے! اس نوجوان نے اپنی یہ بات ختم کرتے ہوئے بڑے جوش سے کہا کہ میرا تو ایمان دھرم ہے کہ ہمارے ملک کا بگاڑ جب ہی ٹھیک ہوگا جب یہ ملنگ (یعنی درویش لوگ) ملک کا انتظام اپنے ہاتھ میں لیں گے۔

کوپاگنج پہنچ کر یہ نوجوان اور دوسرے لوگ جو یکہ پر سوار تھے سب اتر گئے۔ مجھے اس یکہ والے نے میل دو میل آگے وہاں تک پہنچا دیا جہاں تک راستہ یکہ کے لئے زیادہ خراب نہیں تھا۔ اس کے آگے میں پیدل چل کر فتح پور پہنچ گیا۔ میں ابھی عرض کر چکا ہوں کہ میری اس حاضری سے کچھ ہی پہلے سخت خوں ریز فسادات کا ایک سلسلہ بنگال سے شروع ہو چکا تھا جس نے مسلمانوں کے سامنے ۴۷ء کے فسادات کے بعد پھر یہ سوال کھڑا کر دیا تھا کہ وہ ہندوستان میں رہ سکیں گے یا انھیں یہاں سے جانا ہی پڑے گا؟ اور ایک خواب کی بنا پر خود حضرت مولانا کے متعلق میرے ذہن میں یہی سوال پیدا ہو گیا تھا۔ میں ایسے وقت پہنچا تھا کہ حضرت قیلولہ فرما رہے تھے

جب حضرت ظہر کی نماز کے لیے باہر تشریف لائے تو ملاقات ہوئی ۔۔۔ اُسی وقت فرمایا مجھے تم سے تنہائی میں کچھ بات کرنی ہے ۔۔۔ ظہر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد حضرت نے وہ گفتگو فرمائی ۔ اس وقت کوئی دوسرا آدمی موجود نہیں تھا ۔ حضرت نے مجھے ملکی حالات اور حکومتی معاملات کے بارے میں باخبر صاحب رائے سمجھتے ہوئے دریافت فرمایا کہ تمہارا کیا اندازہ ہے جن لوگوں کے ہاتھ میں حکومت کا اقتدار ہے کیا وہ بھی چاہتے ہیں کہ ان فسادات اور لوٹ مار سے تنگ آکر مسلمان یہاں سے چلے جائیں ، یا یہ جو کچھ ہو رہا ہے اُن کی منشا کے خلاف ہو رہا ہے اور وہ قابو نہیں پا سک رہے ہیں ۔۔۔ میں نے اس بارے میں تفصیل سے اپنا خیال عرض کیا ، جس کا حاصل یہ تھا کہ حکومت کے جو اصل ذمہ دار ہیں یعنی پنڈت جواہرلال نہرو اور ان کے خاص رفقاء کار وہ تو نہیں چاہتے کہ مسلمانوں کے ساتھ اس طرح کی زیادتیاں ہوں ، لیکن پچھلے سالوں میں مسلم لیگ اور کانگریس کے درمیان جس طرح کی کش مکش رہی اس نے اور پھر تقسیم کے فیصلہ اور پاکستان کے قیام نے عام ہندو ذہن کو بہت زیادہ مشتعل کر دیا ہے ۔ ان کا خیال ہے کہ بٹوارہ کے بعد ہندوستان میں مسلمانوں کا کوئی حق نہیں رہا ۔ خود کانگریس والوں میں بھی اس مسلم دشمنی رجحان کا اچھا خاصا غلبہ ہو گیا ہے ، اس لیے ان فسادات کو روکنے کے لیے جس قسم کی سختی کی ضرورت ہے حکومت کے ذمہ دار اس کی جرأت نہیں کرتے ۔

پھر میں نے حضرت سے دریافت کیا کہ خود حضرت کا ارادہ ان حالات میں ہندوستان میں قیام کا ہے یا یہاں سے تشریف لے جانے کا ؟ حضرت نے فرمایا کہ اگرچہ مشرقی پاکستان کے بعض احباب بہت دنوں سے اصرار

کرتے ہیں کہ میں وہاں منتقل ہو جاؤں، لیکن میرا ارادہ یہیں رہنے کا ہے اور میں نے یہی فیصلہ کر لیا ہے۔

تنہائی کی یہ گفتگو غالباً آدھ گھنٹے سے بھی کم میں ختم ہو گئی، اور اس کے بعد حضرت کی عام مجلس شروع ہو گئی جس کا انداز حکیم الامت حضرت تھانوی نور اللہ مرقدہٗ کی ظہر بعد کی مجلس ارشاد سے بہت ملتا جلتا تھا، مجلس میں بعض طالبین اصلاح کے خطوط پڑھے گئے جن میں انھوں نے اپنے احوال لکھے تھے اور ہدایت و رہنمائی چاہی تھی اور حضرت کی طرف سے اُن کے جو جوابات دیئے گئے تھے وہ بھی پڑھے گئے ـــــ اس دوسری حاضری سے قلب میں حضرت کی عظمت میں اور اضافہ ہوا۔

جیسا کہ عرض کر چکا ہوں یہ حاضری ۱۹۲۶ء میں ہوئی تھی۔ اس کے کافی عرصہ بعد تک حضرت کا قیام اپنے اصل اور آبائی وطن فتحپور ہی میں رہا، جہاں پہنچنا طالبین کے لیے آسان نہ تھا، اس وجہ سے چند قریبی اضلاع کے سوا دوسرے علاقوں کے اہل طلب خال خال ہی پہنچتے تھے ـــــ

پھر تقدیر الٰہی سے کچھ ایسے واقعات پیش آئے کہ اپنے بعض اہل وطن کی کچھ بے عنوانیوں سے آزردہ ہو کر آپ گورکھپور تشریف لے آئے، جو مشرقی یوپی کا بڑا مرکز اور مرکزی شہر ہے، اور اس کو مستقر بنا لیا کئی سال وہاں قیام رہا۔ اس زمانہ میں گورکھپور ایک دینی و روحانی مرکز بن گیا اور طلب و استفادہ کا دائرہ بہت وسیع ہو گیا۔ راقم سطور گورکھپور کے اس زمانۂ قیام میں بھی ایک عقیدت مند زائر کی حیثیت سے طلب دعا اور استفادہ ہی کی نیت سے چند بار حضرت کی خدمت میں حاضر ہوا۔ پھر کچھ مدت کے بعد آپ نے وہاں سے الٰہ آباد منتقل ہونے کا فیصلہ فرما لیا

یہاں پہنچ کر حضرت کی مقبولیت کا اس پیمانہ پر ظہور ہوا جو کبھی کبھی اللہ تعالیٰ کی طرف سے اپنے بعض خواص اولیا کے لیے ہوتا ہے ــــ یہ عاجز اللہ تعالیٰ کی توفیق سے یہاں بھی حاضر خدمت ہوتا رہا اور اپنی نااہلی کے باوجود حضرت کی عنایت و شفقت میں برابر اضافہ محسوس کرتا رہا۔

الٰہ آباد ہی کے زمانہ قیام میں حضرت کی آمد و رفت بمبئی شروع ہوئی جس کا ظاہری سبب تو یہ تھا کہ حضرت کو بعض ایسے امراض لاحق ہو گئے جن کی وجہ سے زیادہ گرمی بھی سخت مضر اور زیادہ سردی بھی سخت خطرناک۔ اور چوں کہ بمبئی میں نہ زیادہ سردی ہوتی ہے نہ زیادہ گرمی، اس لئے حضرت کے معالج اطباء نے مشورہ دیا کہ سخت سردی اور گرمی کے موسم میں حضرت کا قیام بمبئی رہا کرے، چنانچہ کئی کئی مہینے حضرت کا قیام بمبئی میں رہنے لگا۔ پھر اللہ تعالیٰ نے بمبئی میں حضرت کے اس قیام کو وہاں کے لوگوں کے لئے رحمت اور رشد و ہدایت کا ایسا وسیلہ بنا دیا جس کے ظہور کے بعد محسوس ہوا کہ دراصل یہ سب اللہ تعالیٰ کی طرف سے بمبئی میں نور ہدایت پھیلنے کے لیے ایک غیبی انتظام تھا ــــ شاید ہی اللہ کے کسی بندے سے اہل بمبئی کو اتنے وسیع پیمانہ پر اس طرح کا دینی فائدہ کبھی پہنچا ہو ــــ اللہ تعالیٰ نے وہاں کے تاجروں اور دوسرے اونچے طبقوں میں حضرت کے سیکڑوں عشاق پیدا کر دیئے جو دنیا دار تھے وہ اللہ والے بن گئے۔ اِنَّ رَبِّيْ لَطِيْفٌ لِّمَا يَشَاۤءُ اِنَّهٗ هُوَ الْعَلِيْمُ الْحَكِيْمُ ــــ پھر زندگی کے آخری سال ([illegible]) میں تو آپ کا قیام الٰہ آباد سے کم اور بمبئی ہی میں زیادہ رہا ــــ اس عاجز کو اس آخری دور اور آخری سال میں دو دفعہ بمبئی میں حضرت کی خدمت میں کسی قدر طویل قیام بھی نصیب ہوا۔

پہلی بار فروری میں حضرت کی خدمت میں قیام ہی کی نیت سے بمبئی کا مستقل سفر کیا اور دو ہفتے تک حضرت ہی کا مہمان رہ کر بے انتہا عنایتوں، اور شفقتوں سے متمتع ہوتا رہا، پھر اس کے قریباً ۶ مہینے کے بعد ماریشس اور حجاز مقدس جانے کے لیے ستمبر میں بمبئی پہنچا، اندازہ یہ تھا کہ ہوائی سفر کے قانونی مراحل ایک دو دن میں طے ہو جائیں گے اور میں انشاء اللہ اپنے پروگرام کے مطابق روانہ ہو جاؤں گا لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ کچھ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے مجھے ایک ہفتہ سے بھی زیادہ بمبئی میں قیام کرنا پڑ گیا۔ ان دنوں میں بھی میں زیادہ تر حضرت ہی کی خدمت میں اور آپ ہی کا مہمان رہا ـــــ بعد میں معلوم ہوا کہ قانونی رکاوٹوں کی وجہ سے میرا بمبئی میں یہ جبری قیام، میرے حق میں اللہ تعالیٰ کی طرف سے بڑی رحمت اور بڑی خیر و برکت کا اور اس سفر کے لیے حضرت کی صحبت و ہدایات سے بہترین زادِ راہ حاصل کر لینے کا ایک وسیلہ تھا۔

اپنے اس سفر سے پہلے ہی یہ بات معلوم تھی کہ حضرت مولانا کا ارادہ اس سال اپنے خاص رفقاء اور اعزہ کے ساتھ سفرِ حج کا ہے اور یہ بھی کہ غالباً رمضان مبارک سے پہلے ہی تشریف لے جائیں گے۔ یہ عاجز اپنے پروگرام کے مطابق پہلے ماریشس اور ری یونین گیا اور وہیں سے "رابطہ عالم اسلامی" کے اجلاس کی شرکت کے لیے مکہ معظمہ چلا گیا، اجلاس سے فراغت کے بعد مدینہ طیبہ حاضری ہوئی، حجاز مقدس میں مجموعی طور پر قریباً ایک مہینہ قیام کے بعد ۳۰ نومبر کی صبح کو بمبئی واپسی ہوئی، رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی میاں ندوی بھی واپسی کے سفر میں ساتھ تھے۔ ہم دونوں اسی دن ادنے حضرت کی خدمت میں زیارت اور دعا کی درخواست

کے لیے حاضر ہوئے ـــــ آپ دو ہی دن کے بعد ۲۲ نومبر کو سفر حج کے لیے مظفری جہاز سے روانہ ہونے والے تھے لیکن ہم دونوں کو ایک اہم ضرورت سے جلد سے جلد لکھنؤ پہنچنا ضروری تھا اسی لیے اگلے دن ۲۱ نومبر کی صبح بمبئی سے دہلی جانے والے طیارہ میں غالباً پہلے ہی سے ریزرویشن کرا لیا گیا تھا۔ اس مجبوری سے ہمارے لئے بمبئی میں ۲ دن بھی قیام کی گنجائش نہیں تھی۔ اس لئے اسی ملاقات میں ہم دونوں حضرت سے رخصتی مصافحہ اور دعا کی درخواست کر کے واپس آ گئے ـــــ یہ عاجز حج سے متعلق اپنی دو کتابوں "آپ حج کیسے کریں" اور "آسان حج" کے چند نسخے حضرت کے قافلہ کے لیے حضرت کی خدمت میں پیش کرنے کے لیے رات کو پھر حاضر خدمت ہوا، حضرت نے بڑی محبت کے ساتھ کتابیں قبول فرمائیں۔ اس حاضری میں میں نے یہ بھی عرض کیا کہ اس کا امکان ہے کہ مجھے بھی اس سال حج میں شرکت کی سعادت نصیب ہو جائے۔ اس کے لیے حضرت دعا بھی فرما دیں حضرت نے فرمایا میں دعا کروں گا آپ کوشش کیجیے ضرور آئیے ـــــ وہم و گمان میں بھی نہ ہو سکتا تھا کہ یہ حضرت کی آخری زیارت اور آخری ملاقات ہے۔

یہ عاجز اور رفیق محترم مولانا علی میاں اپنے پروگرام کے مطابق ۲۱ نومبر کی صبح بمبئی سے روانہ ہو کر دہلی آ گئے اور اگلے دن ۲۲ کی صبح اپنے مستقر لکھنؤ پہنچ گئے ـــــ اسی دن حضرت اپنے قافلہ کے ساتھ مظفری سے حجاز مقدس کے لیے روانہ ہو گئے ـــــ ۳ ہی دن ہوئے تھے ۲۵ نومبر کی شام کو بمبئی سے سیٹھ عبدالستار صاحب کا دیا ہوا تار دارالعلوم ندوۃ العلماء میں موصول ہوا جس میں اطلاع دی گئی تھی کہ آج صبح مظفری جہاز میں حضرت مولانا وصی اللہ صاحب کا وصال ہو گیا (انا للہ وانا الیہ راجعون)

دو دن کے بعد، ہم کو ہمارے ایک دوست مخلص حاجی محمد یعقوب کا ۵ نومبر ہی کا بمبئی سے لکھا ہوا خط ملا جس میں یہ تفصیل تھی کہ ـــــ حضرت کے رفقا کا سلفزی جہاز سے بذریعہ وائرلیس دیا ہوا تار آج دن کے ۱۱ بجے بمبئی پہنچا جس میں بتایا گیا ہے کہ آج صبح ۷ بج کر ۵ منٹ پر حضرت کا وصال ہو گیا اور جہاز کے کپتان کا کہنا ہے کہ جہاز کے قانون و دستور کے مطابق نماز جنازہ پڑھ کر میت کو سمندر کے سپرد کر دیا جائے، اور ہم لوگ چاہتے ہیں کہ میت کو جدہ لے جائیں، آپ لوگ مغل کمپنی سے کپتان کو تار دلوائیے کہ وہ جدہ تک لے جانے کی اجازت دے اور انتظام کرے ـــــ چنانچہ کوشش کی گئی اور مغل کمپنی نے جہاز کے کپتان کو تار کے ذریعہ اس کی ہدایت دے دی اور ایک تار سعودی عربیہ میں حکومت ہند کے سفیر حضرت کامل قدوائی کو بھی دے دیا گیا تاکہ وہ سعودی حکومت سے حضرت کی میت کو جدہ میں اتارنے اور مکہ معظمہ میں تدفین کی اجازت حاصل کر لیں ـــــ کامل قدوائی صاحب اور حجاز مقدس کے مقیم حضرت علیہ الرحمۃ کے خدام مولانا احمد اللہ صاحب گورکھپوری وغیرہ نے انتہائی جدوجہد کر کے سعودی حکومت سے یہ اجازت حاصل بھی کر لی لیکن اللہ کی مشیت کہ اس اجازت کی اطلاع سلفزی کے کپتان کو نہ پہنچ سکی اس لئے جدہ کے ساحل کے قریب پہنچ کر اس نے حضرت کے رفقاء سے کہا کہ اب اس کے سوا کوئی چارہ کار نہیں ہے کہ آپ لوگ نماز جنازہ پڑھ کے میت کو سمندر کے سپرد کر دیں۔ چنانچہ ایسا ہی کرنا پڑا ـــــ اور اب معلوم ہوا کہ تقدیر الٰہی میں یہی طے ہو چکا تھا کہ بیت اللہ کے راستہ میں جہاز میں حضرت کا انتقال ہو اور حجاز پاک کا ساحل آپ کا مدفن بنے۔ یفعل اللہ ما

یَشَاءُ وَیَحْکُمُ مَا یُرِیدُ۔

کچھ صفات و امتیازات

حضرت کے احوالِ حیات اور صفات و امتیازات سے متعلق کچھ لکھنے کا حق در اصل انہی حضرات کو ہے جنھیں حضرت کی خدمت میں طویل قیام اور استفادہ کی سعادت حاصل ہوئی، اس عاجز کی واقفیت کا طول وعرض تو بس وہی ہے جو اوپر کی سطروں میں لکھا گیا تاہم جی چاہتا ہے کہ اس موقع پر چند سطروں میں اپنے بعض احساسات اور تاثرات بھی عرض کروں۔

جلال و جمال

حضرت کی خدمت میں حاضری اور زیارت سے پہلے آپ کے بارہ میں جو کچھ سنا تھا اس سے یہ سمجھا تھا کہ بڑے "صاحب جلال" بزرگ ہیں۔ پھر جب پہلی دفعہ ([illegible] میں) حضرت کی خدمت میں حاضری ہوئی ـــــ جس کا ذکر اوپر آچکا ہے ـــــ تو "جلال" کی وہ کیفیت تو نہیں تھی لیکن اس کا کچھ رنگ ضرور محسوس کیا تھا (اگرچہ میں ان لوگوں میں سے نہیں تھا اور نہیں ہوں جن کا احساس ان امور میں کچھ زیادہ قابل اعتبار ہو) لیکن گورکھپور اور الٰہ آباد کے زمانۂ قیام میں جب جب حاضری ہوئی تو عنایت و شفقت اور رافت و رحمت کا رنگ ہی غالب پایا اور گزشتہ دو تین سالوں میں تو جب حاضری ہوئی تو محسوس کیا کہ رگ رگ، ریشہ ریشہ پیار و محبت سے بھرپور ہے۔

قرآن مجید میں "بالمؤمنین رؤف رحیم"[1] رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی صفت بیان فرمائی گئی ہے اس لیے اہل اللہ جو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے روحانی خلفاء اور نائبین ہوتے ہیں۔ الوان کے اختلاف کے باوجود سب ہی اس صفت کے حامل ہوتے ہیں۔ اس گنہگار کو اللہ تعالیٰ نے اپنے جن خاص بندوں کو دیکھنا نصیب فرمایا۔ ان سب کو اس صفت سے بھرپور دیکھا لیکن حضرت مولانا شاہ وصی اللہ صاحب رحمۃ اللہ علیہ پر خاص کر حیات کے اس آخری دور میں اس صفت کا انتہائی غلبہ تھا۔ جو بھی حضرت سے قریب ہوتا محسوس کرتا کہ رگ و ریشہ میں شفقت اور عنایت بھری ہوئی ہے۔ جو طالب بن کر آتا چاہتے کہ اس کے اعمال و اخلاق کی پوری پوری اصلاح ہو جائے اور اس کو تعلق مع اللہ کی دولت نصیب ہو جائے۔ اسی کے ساتھ بہت سوں کی دنیوی ضروریات کی بھی فکر فرماتے اور ان کی تکلیفوں اور پریشانیوں سے سخت بے چین ہوتے۔

غیر معمولی تاثیر

اس کے اظہار میں ہرگز کوئی بے ادبی نہیں ہے کہ اللہ تعالیٰ نے حضرت کو ظاہری وجاہت والی شکل و صورت بالکل عطا نہیں فرمائی تھی، اسی طرح آپ صاحب زبان و بیان مقرر بھی نہیں تھے، آج کل کی اصطلاح کے مطابق صاحب قلم بھی نہیں تھے۔ اگرچہ مدت سے معمول تھا کہ روزانہ صبح ایک عام مجلس میں کچھ اصلاحی بیان فرماتے تھے، جس کا طریقہ اکثر یہ ہوتا تھا

---

[1] یعنی اہل ایمان پر بہت زیادہ شفقت اور مہربانی فرمانے والے۔

کرا کے اکابر علماء محققین و مصلحین میں سے کسی کی کوئی کتاب ہاتھ میں لے کر اس کی کوئی عبارت پڑھتے اور اس پر کچھ فرماتے، کبھی ماثورہ دعاؤں میں سے کوئی دعا پڑھتے اور اس کے مضمون کی وضاحت فرماتے۔ لیکن اس بیان کی زبان اور اس کا انداز اکثر و بیشتر اس قدر علمی ہوتا تھا اور اس میں دری اور فنی اصطلاحات کا اس قدر استعمال ہوتا تھا کہ خاص مناسبت رکھنے والے اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے۔ پھر آواز بھی کبھی کبھی اتنی دھیمی ہوتی تھی کہ مائیکروفون سامنے ہونے کے باوجود بہت سے حاضرین مجلس نہیں جانتے تھے کہ کیا فرمایا۔ لیکن تواتر کے طور پر لوگوں سے سنا اور خود محسوس بھی کیا کہ تاثر سے شاید کوئی بھی طالب خالی اور محروم نہیں رہتا تھا۔ اور اثر بھی ایسا جو اکثر و بیشتر کا یا پلٹ کر دیتا تھا۔

وفات سے قریباً دو ہی مہینے پہلے آخر ستمبر میں جب ایک ہفتہ کے قریب حضرت کی خدمت میں رہنا نصیب ہوا تو ایک دن مجلس میں حضرت اپنی جگہ پر تشریف تو لے آئے لیکن دیر تک بس خاموش بیٹھے رہے۔ مجھے وہ حدیث یاد آ رہی جس میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ حال بیان کیا گیا ہے۔ کان رسول اللّٰہ صلی اللّٰہ علیہ وسلم طویل الصمت متواصل الاحزان۔ یعنی رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا یہ بھی ایک حال تھا کہ آپ بہت دیر تک خاموش رہتے اور محسوس ہوتا کہ مسلسل فکر اور غم کی حالت میں ہیں۔ پھر مولانا رحمۃ اللہ علیہ نے حاضرین مجلس کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا کہ آپ لوگ یہ ضروری نہ سمجھیں کہ میں ضرور کچھ بیان کروں گا۔ یہاں وہی لوگ آیا کریں جو بغیر کچھ سنے صرف بیٹھنے میں بھی اپنا فائدہ سمجھیں۔

بہر حال حضرت کی مجلس اس حقیقت کی روشن دلیل تھی کہ دینی فائدہ

کا زیادہ تعلق زبان و بیان سے نہیں بلکہ قلب سے ہے۔[1] حضرت کی مجلس کے حاضر باشوں میں جو عظیم انقلاب آیا اس کو ہر آنکھوں والا حضرت ایک شہر بمبئی میں ہی دیکھ سکتا تھا۔

علمی رسوخ اور وسعت مطالعہ

حضرت مولانا رحمۃ اللہ علیہ کی عام شہرت اگرچہ ایک شیخ طریقت اور صاحب ارشاد مصلح و مربی کی حیثیت سے ہے لیکن علم میں بھی اتنا رسوخ اور مطالعہ اتنا وسیع و عمیق تھا کہ اس دور کے اصحاب درس اور مصنفین میں بھی اس کی مثالیں کم ہی ملیں گی۔

ایک نیا انداز اور جذب و سلوک کا امتزاج

مشائخ طریقت میں اکثر و بیشتر وہ ہوتے ہیں جن کا ارشاد و اصلاح کا سارا کام بالکل اپنے شیخ کے منوال و منہاج پر ہوتا ہے لیکن بعض ایسے شہباز بھی ہوتے ہیں جو شیخ کی کامل محبت اور متابعت کے باوجود ایک مستقل انداز اور طریقہ کے بانی دیکھے جاتے ہیں۔ اس کی مثال میں حضرت خواجہ باقی باللہ کے خلفاء میں حضرت امام ربانی مجدد الف ثانی قدس سرہٗ کا اور حضرت حاجی امداد اللہؒ کے خلفاء میں حضرت گنگوہیؒ اور حضرت تھانویؒ کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اگر چھوٹے منہ سے کسی بڑی بات کے کہنے کا کوئی جواز ہو تو یہ عاجز

---

[1] امام عبدالوہاب شعرانیؒ کا مشہور مقولہ ہے "من لم ینفعہ سکوتنا لم ینفعہ کلامنا" یعنی جس کو ہماری خاموشی سے فائدہ نہیں ہوگا اس کو ہماری باتوں سے بھی فائدہ نہیں ہوگا۔

حکیم الامت حضرت تھانویؒ کے خلفاء میں حضرت مولانا شاہ وصی اللہ کا نام بھی اس کی مثال میں لے سکتا ہے ــــ حضرت ممدوح میں جذب و سلوک کا ایسا واضح امتزاج تھا جس نے ایک نرالے قسم کا بانکپن پیدا کر دیا تھا۔

در دست نہ تیر ست نہ دست کمان است
ایں سادگی اوست کہ بسمل دو جہان است
در دورسہ از جنبش لعل تو حکایت
در یکدہ از مستیٔ چشم تو نشان است

شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریاؒ

کچھ یادیں ☆ کچھ باتیں

جہاں تک یاد ہے، شیخ الحدیث حضرت مولانا محمد زکریا نور اللہ مرقدہ کو سب سے پہلے اپنی طالب علمی کے زمانے میں (۱۳۴۴ھ میں) دارالعلوم دیوبند میں دیکھا تھا، کسی ضرورت سے تشریف لائے تھے، اور کسی جاننے والے نے بتلایا تھا کہ یہ مظاہر علوم سہارنپور کے استاذ مولانا محمد زکریا صاحب ہیں ــــ اس کے بعد بھی زیارت و ملاقات تو کبھی کبھی ہوئی لیکن اس سے زیادہ کچھ نہیں جانا کہ مظاہر علوم کے حدیث شریف پڑھانے والے بڑے اور مقبول اساتذہ میں ہیں۔

اپنی جماعت کے اصحاب ارشاد مشائخ و اکابر میں حضرت مولانا شاہ عبدالقادر رائے پوری قدس سرہٗ کی اس عاجز کے دل میں عظمت و عقیدت بھی تھی اور اپنے خیال میں کسی درجہ کی ذوقی مناسبت بھی! حضرت کی خاص شفقت و عنایت بھی حاصل تھی ــــ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ تکوینی اور اس کے ایک تقدیری فیصلے کے نتیجے میں ۱۳۶۲ھ کے

اوائل میں چند روز حضرت کی خانقاہ میں قیام کے ارادہ سے رائے پور کا سفر کیا اور قریباً ایک ہفتہ قیام رہا — یہ سفر تو اس ارادہ سے نہیں کیا گیا تھا لیکن خانقاہ کے اس قیام کے دنوں میں حضرت سے بیعت اور اصلاحی تعلق قائم کرنے کا دل میں داعیہ پیدا ہوا۔ اور ایک دن اس کے لیے درخواست کی۔ حضرت نے بڑی محبت اور شفقت کے ساتھ اس مقصد کے لیے حضرت مولانا محمد الیاسؒ یا حضرت شیخ الحدیث کی طرف رجوع کرنے اور ان سے یہ تعلق قائم کرنے کا مشورہ دیا اور فرمایا کہ ان دونوں میں سے کسی کے ساتھ بھی یہ تعلق آپ کے لیے زیادہ مفید ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ میں ان دونوں حضرات سے کچھ واقف ہوں لیکن میرے دل میں حضرت ہی سے یہ تعلق قائم کرنے کا داعیہ ہے۔ میرے اس عرض کرنے پر حضرت نے ان دونوں حضرات کے متعلق بہت بلند کلمات ارشاد فرمائے۔ اس کے بعد بھی اگرچہ میں نے اپنی درخواست ہی پر اصرار جاری رکھا اور بالآخر حضرت نے قبول فرمالیا — لیکن ان دونوں بزرگوں کی بلند مقامی سے مجھے باخبر کرنے کے لیے اس وقت جو کچھ حضرت نے ارشاد فرمایا اس کے نتیجہ میں ان حضرات کی وہ عظمت قلب میں پیدا ہو گئی جو اب تک نہیں تھی، اس کے بعد سے ان دونوں حضرات سے بھی خاص درجہ کی عقیدت و نیازمندی کی سعادت بفضلہ تعالیٰ

ل اس عاجز نے رائے پور کا یہ سفر کیوں اور خانقاہ میں قیام کس غرض سے کیا تھا اور پھر بیعت کا یہ داعیہ کن مرحلوں سے گزرنے کے بعد اور کس طرح دل میں پیدا ہوا۔ اس کا ذکر حضرت رائے پوریؒ کی خدمت میں حاضری کے ذیل میں کیا جا چکا ہے۔

نصیب ہوگئی ـــــ حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کا یہ آخری دور حیات تھا۔ قریباً ڈیڑھ سال بعد ہی (رجب ۱۳۶۳ھ میں) حضرت کا وصال ہوگیا۔ اس تھوڑی سی مدت میں اللہ تعالیٰ کی توفیق سے حضرت کے ساتھ جو نیازمندانہ تعلق نصیب ہوا اس کی برکتوں میں سے (یا کہا جائے کہ اس کی نشانی اور یادگار) اس عاجز کا مرتب کیا ہوا حضرت کے ملفوظات کا وہ مجموعہ ہے جو کتابی شکل میں شائع ہو چکا ہے ـــــ البتہ حضرت شیخ الحدیثؒ اس کے بعد قریباً چالیس ۴۰ سال ہماری اس دنیا میں رہے، اور بلاشبہ اس عاجز پر اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے یہ عظیم نعمت بھی ہے کہ اس طویل مدت میں حضرتؒ کی خاص شفقت و عنایت نصیب رہی، پچاسوں دفعہ حضرت کی خدمت میں حاضری اور بار بار طویل قیام بھی رہا۔ ایسے واقعات بے شمار ہیں جو قابل ذکر ہیں اور جن کا یہ عاجز عینی شاہد ہے لیکن اس صحبت میں صرف چند ہی واقعات نذرِ ناظرین کرنے کا ارادہ ہے جن کا اس عاجز کی ذات ہی سے تعلق ہے۔ امید ہے کہ ان کا ذکر انشاء اللہ عام ناظرین کے لیے بھی نافع ہوگا۔

(۱)

حضرت شیخ کے بارے میں مختلف حضرات سے سنا تھا کہ رمضان مبارک میں دن رات کے نوافل میں روزانہ ایک قرآن مجید ختم کر لینے کا معمول ہے، ایک دن میں نے عرض کیا کہ میں یہ معلوم کرنا چاہتا ہوں کہ یہ معمول کب سے ہے اور اس کی ترتیب کیا ہے؟ شاید میرے ذریعہ اللہ کے کسی ایسے بندے کو معلوم ہو جائے جس کو اس معمول کے نقل کی توفیق ہو تو انشاء اللہ مجھے بھی کچھ مل جائے گا ـــــ میرے اس سوال کے جواب

میں فرمایا۔ مولوی صاحب! جب پہلی دفعہ حج کے لیے مکہ معظمہ حاضری ہوئی تھی تو رمضان مبارک کا مہینہ تھا اور جوانی کا زمانہ تھا، وہاں روزانہ کا معمول یہ بنالیا کہ حرم شریف میں تراویح ختم کرکے تنعیم چلے جاتے اور وہاں سے عمرہ کا احرام باندھ کے حرم شریف آکر طواف اور اس کے بعد سعی کرتے اور حلق کراتے، اس طرح عمرہ سے فارغ ہوجانے کے بعد حرم شریف ہی میں تہجد کی رکعتیں پڑھتے، اس میں سحر کا وقت ہوجاتا، سحری سے فارغ ہوکر حرم شریف آجاتے اور فجر کی نماز پڑھتے، اس کے بعد کچھ دیر کے لیے سوجاتے، پھر اٹھ کر چاشت کے نوافل پڑھتے اور اپنے مشاغل میں مشغول ہوجاتے۔ اس طرح رات کو سونا بالکل نہ ہوتا، بس فجر کے بعد ہی کچھ سولیتے تھے۔ اس سال مکہ معظمہ میں رمضان مبارک اس طرح گزرا۔ اس کے بعد سے یہ طے کرلیا کہ اللہ توفیق دے تو رمضان مبارک اسی طرح گزرا کرے۔ اب میرا معمول یہ ہے کہ ماہ مبارک شروع ہوجانے پر مغرب کی نماز کے بعد اوابین کی رکعتوں میں تین پارے پڑھتا ہوں پھر عشاء کی نماز جماعت سے پڑھ کے گھر آجاتا ہوں اور تراویح گھر پہ پڑھتا ہوں، میری بچیاں مقتدی ہوتی ہیں، تراویح میں پھر وہی تین پارے پڑھتا ہوں، تراویح سے فارغ ہوکر انہی تین پاروں کی قرآن مجید میں دیکھ کر غور و فکر کے ساتھ تلاوت کرتا ہوں۔ اس وقت بعض تفاسیر بھی پاس رکھتا ہوں اور غور و فکر کے سلسلہ میں حسب ضرورت ان کا مطالعہ کرتا ہوں اس کے بعد تہجد کی رکعتیں پڑھتا ہوں، ان رکعتوں میں بھی وہی تین پارے پڑھتا ہوں، اس میں سحری کا وقت آجاتا ہے۔ سحری کھا کے فجر کی نماز کے لیے مسجد چلا جاتا ہوں، نماز سے فارغ ہوکر گھر آجاتا ہوں

اور دو ڈھائی گھنٹے سولیتا ہوں، پھر اٹھ کر اور ضروریات سے فارغ ہو کر
چاشت کی رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان میں بھی پھر وہی تین پارے پڑھتا
ہوں۔ اس کے بعد انہی تینوں پاروں کی قرآن مجید دیکھ کر تلاوت کرتا
ہوں۔ اس کے بعد چار رکعتیں پڑھتا ہوں اور ان میں بھی یہی تین پارے
پڑھتا ہوں۔ اس کے بعد ظہر کا وقت آجاتا ہے تو ظہر سے پہلی 'و' بعد کی
سنتوں، نفلوں میں پھر وہی تین پارے پڑھتا ہوں، اس سے فارغ ہونے
کے بعد ان ہی تین پاروں کی قرآن مجید دیکھ کر تلاوت کرتا ہوں۔ اس میں
عصر کا وقت آجاتا ہے۔ عصر کی نماز سے فارغ ہونے کے بعد یہی تین پارے
کسی کو سناتا ہوں ___ اس طرح یہ تین پارے دس دفعہ ہو جاتے ہیں اور
ایک عشرہ میں دس قرآن پاک ہو جاتے ہیں، پھر جب عشرہ اخیرہ شروع
ہو جاتا ہے تو مقدار اس حساب سے بڑھا دیتا ہوں کہ ۹ دن میں ۱۰ قرآن
پورے ہو جائیں تاکہ اگر ۲۹ کو چاند ہو جائے تب بھی میرے معمول پورے
ہو جائیں، پھر جب ۲۹ کا چاند نہیں ہوتا تو آخری دن میں ایک قرآن پاک
مزید ہو جاتا ہے۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حضرت شیخ کا یہ معمول اس وقت تک
تھا جب انھوں نے میرے سوال کے جواب میں یہ بیان فرمایا تھا، لیکن
معلوم ہے کہ بعد میں حالات کی تبدیلی کے ساتھ اس معمول میں بھی تبدیلیاں
ہوتی رہیں اور آخری سالوں میں تو پورے ماہ مبارک کے اعتکاف کا
معمول رہا۔

﴿ ۲ ﴾

۱۳۶۷ھ (۱۹۴۸ء) کا پورا رمضان مبارک حضرت رائے پوری قدس سرہٗ

کی خدمت میں گزارنے کی نیت سے یہ عاجز ماہ مبارک شروع ہونے سے پہلے ہی رائے پور کی خانقاہ میں پہنچ گیا تھا۔ ۴ رمضان مبارک کو چھوٹے بھائی مولوی حکیم محمد احسن کا خط ملا جس میں انھوں نے لکھا تھا کہ کچھ دن پہلے والد ماجد نے خواب میں آفتاب غروب ہوتا دیکھا تھا، ہم لوگوں سے اس خواب کا ذکر کرکے فرمایا تھا کہ اس کی تعبیر یہ ہے کہ ہماری زندگی کا آفتاب جلدی ہی غروب ہونے والا ہے ــــ خواب کی یہ تعبیر واقعہ بن کے سامنے آگئی۔ ۵ رمضان مبارک کو والد ماجد کی زندگی کا آفتاب غروب ہوگیا۔ انا للہ وانا الیہ راجعون

میں نے خاص کر والدہ ماجدہ اور چھوٹی بہن کی تسلی تشفی کے لیے بلاتاخیر وطن پہنچنا ضروری سمجھا اور حضرت قدس سرہٗ کی خدمت میں عرض کرکے اور دعائے مغفرت کی درخواست کرکے رائے پور سے روانہ ہوگیا۔ سہارنپور ایسے وقت پہنچا کہ مغرب کی نماز ہوچکی تھی اور حضرت شیخ مسجد سے گھر تشریف لے جاچکے تھے، چونکہ رمضان مبارک کے شیخ کے نظام اوقات کا کچھ علم تھا اس لیے ارادہ کیا تھا کہ ان کو بس اطلاع دے کے اور دعائے مغفرت کی درخواست کرکے اجازت لے لوں گا اور اسٹیشن چلا جاؤں گا۔ حضرت کو اطلاع دلوائی فوراً تشریف لے آئے۔ میں نے بھائی کے خط کا ذکر کیا اور دعائے مغفرت کی درخواست کی اور اسی وقت جانے کی اجازت چاہی، حضرت نے کچھ تعزیتی کلمات فرمائے اور دعا فرمائی، اور فرمایا کھانا تو ابھی کھایا نہیں ہوگا۔ میں نے عرض کیا کہ اس کی حضرت زحمت نہ فرمائیں۔ فرمایا یہ کیسے ہوسکتا ہے۔ گھر میں تشریف لے گئے اور چند منٹ کے بعد کھانا خود ہاتھ میں لیے ہوئے تشریف لائے

جس میں سالن کے ساتھ صرف تازہ روٹی تھی جو اسی وقت چولھے سے اتر کر آئی تھی، مجھ سے فرمایا مولوی صاحب! کھانا شروع کرو، میں نے شروع کر دیا حضرت پھر تشریف لے گئے اور ویسی ہی تازہ گرم گرم چند روٹیاں اور لے آئے۔ میں نے خیال کیا کہ اس وقت گھر میں پکی پکائی روٹی موجود نہیں تھی میری وجہ سے اسی وقت پکانی پڑی ہے، اس احساس سے مجھے بڑا افسوس اور دکھ ہوا۔ میں نے اپنا یہ احساس حضرت کی خدمت میں عرض کر دیا، حضرت فوراً گھر میں تشریف لے گئے اور روٹیوں سے بھری ہوئی ایک ڈلیا میرے سامنے رکھ دی اور فرمایا کہ مولوی صاحب! پکی ہوئی روٹیاں تو اتنی رکھی ہوئی تھیں، لیکن جب میں نے بچیوں کو تمہارے بارے میں بتلایا کہ وہ رائے پور سے آئے ہیں اور ابھی جانے ہیں تو بچیاں اس پر راضی نہیں ہوئیں کہ شام کی پکائی ہوئی روٹیاں کھلائیں، انھوں نے خود ہی اصرار کر کے تازہ روٹی پکانی شروع کر دی ہے۔[1]

اس کے بعد فرمایا۔ مولوی صاحب! اللہ تعالیٰ کی بے شمار نعمتوں میں سے میری بچیاں بڑی نعمت ہیں، رمضان مبارک کو خوب وصول کرتی ہیں۔ رات اور دن میں بیس بیس، پچیس پچیس پاروں کی تلاوت

---

[1] حضرت شیخ کے اں مہمانوں کے لیے تازہ تازہ گرم گرم روٹیوں کا خاص اہتمام ہوتا تھا ہر چند سکنڈ کے بعد گھر میں سے ایک تازہ روٹی آتی تھی، حضرت اپنے ہاتھ سے اس کے چند ٹکڑے کر کے مہمانوں کو عنایت فرماتے تھے۔ ان کے نزدیک یہ بھی اکرام ضیف کے سلسلہ کا ایک عمل اور من کان یومن باللہ والیوم الاخر فلیکرم ضیفہ کے حکم کی تعمیل تھی۔

کرلیتی ہیں، پھر شام کو تھوڑے سے وقت میں کھانے پکانے کا سارا کام بھی کرلیتی ہیں، مختلف مسجدوں میں بھیجنے کے لیے افطاری بھی تیار کرتی ہیں۔ پھر افطار سے کافی پہلے ان سارے کاموں سے فارغ ہوکر تسبیح اور دعا وغیرہ میں مشغول ہوجاتی ہیں۔ کھانے سے فارغ ہونے کے بعد پھر میں نے دعا کی درخواست کی اور اجازت لے کر رخصت ہوا۔

۳

راقم سطور کی والدہ ماجدہ مرحومہ کا انتقال رمضان مبارک ۱۳۶۹ھ میں ہوا، وہ کئی مہینے سے مریض تھیں، ان کی علالت اور نازک حالت کی اطلاع پاکر یہ عاجز غالباً شروع رمضان مبارک ہی میں ان کی خدمت میں وطن پہنچ گیا تھا۔ ان کو خود بھی اندازہ ہوگیا تھا کہ یہ میرا آخری مرض ہے اور سفر آخرت کا وقت قریب ہی ہے، انتقال سے چند روز پہلے ایک دن مجھ سے فرمایا کہ میں کسی بزرگ سے بیعت نہیں ہوئی، اب چاہتی ہوں کہ دنیا سے جانے سے پہلے کسی بزرگ سے بیعت ہوجاتی۔ میں نے اسی دن حضرت شیخ کی خدمت میں عریضہ لکھا کہ میری والدہ ماجدہ کا یہ حال ہے اور ان کی یہ خواہش اور آرزو ہے، میری درخواست ہے کہ حضرت ان کو غائبانہ بیعت فرمالیں، اس سے ان کو اطمینان ہوجائے گا اور انشاء اللہ آخرت میں ان کے لیے نافع ہوگا ــــ والدہ ماجدہ مرحومہ کی نازک حالت دیکھتے ہوئے اس کی زیادہ امید نہیں تھی کہ حضرت کی طرف سے جواب آنے تک وہ اس دنیا میں رہیں گی لیکن اللہ تعالیٰ کا فضل وکرم کہ حضرت کو میرا عریضہ اور مجھے حضرت کا جواب بہت جلد مل گیا۔ حضرت نے تحریر فرمایا تھا کہ میں ان کی اور تمھاری تطییب خاطر کی نیت

سے اور اپنے لیے اخروی نفع کی امید رکھتے ہوئے ان کو بیعت کرتا ہوں تم میری طرف سے اپنے اکابر کے طریقہ پر ان سے بیعت لے لو اور ان کو بتلا دو کہ میں نے بیعت کر لیا ـــــ میں نے ایسا ہی کیا، والدہ ماجدہ کو بڑی خوشی اور بڑا اطمینان ہوا ـــــ اس عاجز نے غالباً اسی دن خواب میں دیکھا (جس کی پوری تفصیل تو اب یاد نہیں، اتنی بات یاد ہے) کہ والدہ ماجدہ کا انتقال ہو گیا ہے اور ان کا کفن اور جنازہ بہت ہی غیر معمولی قسم کا ہے، اس کی تعبیر یہی سمجھی کہ انشاء اللہ والدہ ماجدہ کے ساتھ اللہ تعالیٰ کا مغفرت و رحمت کا خاص معاملہ ہوگا۔ بس اس کے ایک دو دن بعد ہی ٹھیک مغرب کی اذان کے وقت والدہ مرحومہ کا انتقال ہوا۔ رحمها الله تعالى رحمة واسعة۔

(۴)

۱۳۶۸ھ (۱۹۴۹ء) میں اس عاجز کے ایک مخلص دوست ضلع گونڈہ کے رہنے والے ماسٹر محمود حسین صاحب (مرحوم و مغفور) نے سفر حج کا ارادہ کیا اور مجھ سے اصرار کیا کہ ان کے ساتھ میں بھی چلوں، اس وقت نہ تو حج مجھ پر فرض تھا اور نہ میں اس حال میں تھا کہ سفر حج کے مصارف کا انتظام کر سکتا۔ انھوں نے پورے اخلاص اور اصرار کے ساتھ پیش کش کی کہ سفر کے سارے مصارف وہ ادا کریں گے، اس کے لیے تو میں اپنے آپ کو آمادہ نہیں کر سکا لیکن ان کے اخلاص اور قلبی تعلق کو پیش نظر رکھتے ہوئے میں نے اس کو حرمین شریفین کی حاضری اور حج و زیارت کی سعادت اور برکت حاصل کرنے کے لیے منجانب اللہ ایک انتظام سمجھ کر اس حد تک قبول کر لیا کہ جہاز کا کرایہ وہ ادا کر دیں۔ باقی مصارف کا

میں خود انتظام کروں۔ اس کے لیے میں نے قرض لینا طے کیا، سہارنپور حاضر ہو کر حضرت شیخ الحدیث سے عرض کیا، حضرت نے بڑی مسرت کا اظہار فرمایا اور مطلوبہ رقم عنایت فرمادی، حرمین شریفین کے زمانۂ قیام کی ضروریات زیادہ تر اسی سے پوری ہوئیں (اللہ تعالیٰ حضرت شیخ کو اور میرے ان مخلص دوست کو جو اس سفر کا باعث بنے اپنی شانِ عالی کے مطابق صلہ عطا فرمائے اور رحمت خاص سے نوازے۔)

پھر جب اللہ تعالیٰ نے اس قرض کی ادائیگی میرے لیے آسان فرمائی اور میں نے حضرت کی خدمت میں رقم پیش کی، تو حضرت نے فرمایا کہ ـــ مولوی صاحب! میں بھی اپنی ضروریات کے لیے دوستوں سے قرض لیتا رہتا ہوں لیکن اس کا پورا اہتمام کرتا ہوں کہ اگر کسی وقت تک ادائیگی کا وعدہ کیا ہے تو جس طرح بھی ہو سکے اس وقت ادا کر دوں بسا اوقات ایسا ہوتا ہے کہ میرے پاس ادائیگی کے لیے اس وقت تک انتظام نہیں ہوتا تو میں وعدہ کے دن سے ایک دن پہلے کسی دوسرے دوست سے قرض لے لیتا ہوں اور مقررہ وقت پر اس سے ادا کر دیتا ہوں۔ اس کا نتیجہ یہ ہے کہ مجھے بڑے سے بڑا قرض ملنا بھی بہت آسان ہے کیونکہ دینے والے کو اطمینان ہوتا ہے کہ اس کی رقم مقررہ وقت پر اس کو انشاء اللہ ضرور مل جائے گی ـــ پھر فرمایا کہ اب کچھ دن سے اللہ تعالیٰ کا معاملہ یہ ہے کہ جس دن مجھے کوئی قرض ادا کرنا ہوتا ہے اور میرے پاس ادائیگی کا انتظام نہیں ہوتا تو ایک دو دن پہلے ہی اللہ کا کوئی بندہ آتا ہے اور کہتا ہے کہ میں اتنی رقم آپ کے پاس امانت رکھنا چاہتا ہوں، میں اس سے کہہ دیتا ہوں کہ بھائی امانت نہ رکھو، اس کی

تمھارا تو یہ نقصان ہے کہ اگر بالفرض کوئی ایسا حادثہ پیش آیا کہ رقم ضائع ہوگئی تو تمھارا نقصان ہوگا، اس کی ادائیگی میرے ذمہ نہ ہوگی، اور مجھے یہ تکلیف ہوگی کہ دل ودماغ پر اس کی حفاظت کی فکر سوار رہے گی، تم چاہو تو بطور قرض رکھ سکتا ہوں، تم جب واپس لینا چاہو ایک دن پہلے بتلا دو ان شاء اللہ اگلے دن واپس ہو جائے گی۔ وہ اس پر خوشی سے راضی ہو جاتا ہے اور رقم قرض کے طور پر میرے پاس چھوڑ جاتا ہے میں سمجھتا ہوں کہ یہ اللہ تعالےٰ کی طرف سے میرے لیے قرض کی ادائیگی کا انتظام ہے۔ اب اللہ تعالیٰ کا یہی معاملہ ہے۔

﴿۵﴾

۱۳۶۹ھ (۱۹۵۰ء) میں حضرت رائے پوری قدس سرہٗ نے سفر حج کا ارادہ فرمایا، حضرت کی خواہش بھی کہ اس سفر میں ہمارے رفیق محترم مولانا علی میاں بھی ساتھ ہوں، حضرت شیخ الحدیث کی ایک صاحبزادی کا چند ہی مہینے پہلے انتقال ہوا تھا، یا تو من جانب اللہ حضرت شیخ کے قلب پر وارد ہوا یا حضرت رائے پوری کی خواہش کا ان کو علم ہو گیا تھا، بہرحال انھوں نے مرحومہ صاحبزادی کے حج بدل کے لیے مولانا علی میاں ہی کا انتخاب فرمایا، میں انہی دنوں میں سہارنپور حاضر ہوا، حضرت شیخ نے مجھ سے اس کا تذکرہ فرمایا اور چونکہ میں نے اس سے پہلے ہی سال حج کا سفر کیا تھا اس لیے سفر کے مصارف کے بارے میں مشورہ طلب فرمایا، میں نے جو مناسب سمجھا عرض کیا غالباً اسی کے مطابق حضرت شیخ نے رقم عنایت فرمائی۔

اس زمانے میں مولانا علی میاں اور یہ عاجز بھی حضرت مولانا محمد الیاسؒ

کی طرف منسوب دینی دعوت کے کام میں دلی جوش و جذبہ اور سرگرمی سے حصہ لیتے تھے۔ مشورہ سے یہ طے ہو گیا تھا کہ حضرت رائے پوری تو اپنے پروگرام کے مطابق واپس تشریف لے آئیں گے، مولانا علی میاں ان کے بعد بھی قیام کریں گے اور دینی دعوت کے سلسلہ میں کام کریں گے، مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب کا اس کام ہی کے سلسلہ میں حجاز مقدس میں مستقل قیام تھا۔ مزید برآں مشورہ سے یہ بھی طے ہو گیا تھا کہ اگر حضرت جی[1] کی طرف سے کوئی ایسا انتظام ہو جائے کہ اس دینی دعوت کے اصول[2] کے تحفظ کے ساتھ مصر و شام وغیرہ ممالک عربیہ کا بھی سفر اس دعوت کے سلسلہ میں کیا جا سکے تو کر لیا جائے۔ مولانا علی میاں نے اس کے لیے اپنے کو آمادہ کر لیا تھا۔

حضرت رائے پوری قدس سرہٗ کے ساتھ مولانا روانہ ہو گئے اور حج و زیارت کے سلسلہ میں مکہ مکرمہ اور مدینہ منورہ میں حضرت ہی کے ساتھ رہے ــــ بلاشبہ اس مبارک سفر میں حضرت کی یہ معیت بڑی قابل رشک نعمت تھی ــــ پھر حضرت قدس سرہٗ تو حج و زیارت سے فارغ ہو کر واپس

---

[1] تبلیغی کام کے ساتھ اس عاجز کا تعلق کن مراحل سے گزرا اور اس کا اس کے بارے میں کیا حال و قال ہے، ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ۔ اللہ توفیق دے تو دنیا سے جانے سے پہلے اس کو بھی تفصیل سے بیان کر جاؤں۔

[2] ان اصولوں میں ایک اہم اصول یہ تھا کہ اس سلسلہ میں مالی تعاون صرف انہی مخلصین کا قبول کیا جائے جو اپنے جسم و جان سے بھی دعوت کے اس کام میں لگے ہوئے ہوں۔ جو حضرات صرف مالی تعاون کرنا چاہیں ان سے خوبصورتی کے ساتھ معذرت کر دیا۔

تشریف لے آئے، اور مولانا صاحب مشورہ وہیں رہ گئے ـــ اس زمانے میں مولانا کے خطوط آتے رہے اور ان میں سے بعض "الفرقان" میں اور رسالہ "تعمیر" میں شائع بھی ہوتے رہے۔ (یہ رسالہ "تعمیر" اس زمانے میں مولانا عبدالسلام صاحب قدوائی مرحوم کے قائم کئے ہوئے ادارہ تعلیمات اسلام سے شائع ہوتا تھا۔)

کچھ عرصے کے بعد مولانا کا ایک خط آیا جس میں لکھا تھا کہ باہر کے کسی سفر کے لیے اپنے اصول کے مطابق کوئی ایسا انتظام نہیں ہوا جس پر قلب مطمئن اور منشرح ہوتا اس لئے اب واپسی ہی کا ارادہ ہے، جب واپسی کا پروگرام طے ہوجائے گا تو اطلاع دی جائے گی ـــ اس خط کے ملنے کے ایک دو ہی دن بعد کسی سلسلہ میں رائے پور کا سفر ہوا ـــ حضرت شیخ کی خدمت میں حاضری ہوئی تو دریافت فرمایا کہ علی میاں کی کیا خیر خبر ہے؟ میں نے عرض کیا کہ ابھی ایک ہی دو دن پہلے اُن کا خط آیا تھا اس میں لکھا ہے کہ باہر کے سفر کا کوئی قابل قبول انتظام نہیں ہو سکا اس لیے اب واپسی ہی کا ارادہ ہے۔

حضرت شیخ نے ایک خاص انداز سے فرمایا کہ مولوی صاحب! یہ بات تو تبلیغ والوں کے اصول کے خلاف ہے کہ دین کا کام اس وجہ سے نہ ہو کہ پیسوں کا انتظام نہیں ہو سکا۔ تبلیغ والوں کا اصول تو یہ ہے کہ دین کے کام کے لیے اگر ضرورت ہو تو اللہ کے بھروسہ پر قرض لے لیا جائے، مجھے بھی ضرورت ہوتی ہے تو دوستوں سے قرض لے لیتا ہوں۔ تم بھی اپنی ضرورتوں کے لیے قرض لیتے ہوگے۔ پانچ سو روپے کا میں انتظام کروں اور پانچ سو کا تم انتظام کرو اور بھی انشاء اللہ انتظام ہوجائے گا۔ اگر

تمھاری رائے ہو تو میں بھائی سلیم[1] کو مکہ مکرمہ خط لکھ دوں کہ وہ علی میاں کو رقم دے دیں، یہاں سے ادا کر دی جائے گی۔ اور تم لکھنؤ پہنچ کر ڈاکٹر صاحب[2] سے علی میاں کو تار دلوا دو کہ وہ ابھی آنے کا ارادہ نہ کریں، خط کا انتظار کریں۔ اور ان کو خط لکھ دیا جائے کہ ان شاء اللہ انتظام ہو جائے گا وہ سفر کا پروگرام بنالیں۔

میں اسی دن سہارنپور سے روانہ ہو کر لکھنؤ آگیا اور ڈاکٹر صاحب سے پوری بات عرض کی اور حضرت شیخ کا پیغام پہنچایا۔ ڈاکٹر صاحب نے اسی دن تار دلوا دیا اور خط بھی لکھ دیا گیا۔

اس کے بعد جو ہوا اس سے اللہ کی قدرت، اس کے غیبی نظام اور اہل یقین و توکل کی فکر و دعا کے اثر کا بڑا غیر معمولی اور میرے لیے خارق عادت تجربہ ہوا ــــ صرف ایک دو دن کے اندر تقریباً پندرہ سو روپے کا انتظام اللہ تعالیٰ نے اس طرح سے کرایا کہ اللہ تعالیٰ کے ارشاد ﴿وَيَرْزُقْهُ مِنْ حَيْثُ لَا يَحْتَسِبُ وَمَنْ يَتَوَكَّلْ عَلَى اللّٰهِ فَهُوَ حَسْبُهٗ﴾ کی واقعاتی تفسیر آنکھوں کے سامنے آگئی ــــ بہرحال میں نے اسکو حضرت شیخ کی توجہ الی اللہ اور دعا ہی کا نتیجہ سمجھا۔ اس کے بعد میں نے جلدی ہی سہارنپور کا سفر کیا اور حضرت شیخ کی خدمت میں یہ رقم پہنچائی پھر حضرت نے پوری قدس سرہ کی زیارت و ملاقات کے لیے رائے پور حاضر

---

[1] بھائی سلیم سے مراد ہیں۔ مولانا محمد سلیم صاحب علیہ الرحمہ سابق مہتمم مدرسہ صولتیہ۔ مکہ مکرمہ

[2] ڈاکٹر صاحب سے مراد ہیں مولانا علی میاں کے برادر معظم اور سرپرست مولانا ڈاکٹر عبدالعلی صاحب رحمۃ اللہ علیہ۔

ہوا۔ حضرت نے مولانا علی میاں کے بارے میں دریافت فرمایا تو میں نے مولانا کے آخری خط کا اور اس کے بعد جو کچھ اب تک ہوا تھا اس سب کا تذکرہ کیا، حضرت کو بڑی خوشی ہوئی اور اسی وقت بھائی راؤ فضل الرحمن سے فرمایا۔ (جو خادم خدمت تھے) کہ ہم نے تمہارے پاس نو سو روپے امانت رکھوائے تھے۔ میری طرف اشارہ کر کے فرمایا کہ وہ ان کو دے دیجیو۔ وہ علی میاں کو بھیجنے ہی کی نیت سے رکھوائے تھے۔ بھائی فضل الرحمن صاحب نے سو روپے اپنی طرف سے شامل کر کے پورے ایک ہزار کی رقم میرے حوالے کی وہ بھی میں نے سہارنپور آکر شیخ کی خدمت میں پیش کر دی۔

مجھے خوب یاد ہے کہ میں نے جب اللہ تعالیٰ کی اس غیبی مدد کا واقعہ حضرت رائے پوری کو سنایا تھا، تو میرے لہجہ میں خوشی کے ساتھ تعجب اور حیرت کی بھی آمیزش تھی، حضرت نے اسے محسوس فرمایا تھا اور ایک خاص انداز میں فرمایا تھا۔ "اچھا تو کیا یہ تجربہ آپ کو پہلی بار ہوا ہے؟"

اس کے بعد ہی مولانا علی میاں نے مصر، سوڈان، شام اور اردن کا سفر فرمایا جیسا کہ ذکر کیا جا چکا ہے۔ اس سفر میں مولانا عبید اللہ بلیاوی صاحب بھی مولانا کے ساتھ تھے۔

غالباً ۱۹۵۱ء کے اواخر میں اس عاجز راقم سطور نے ارادہ کیا کہ اپنی مرحومہ اہلیہ کو ساتھ لے کر سہارنپور کا سفر کروں، مجھے معلوم تھا کہ حضرت شیخ کی اہلیہ محترمہ اور صاحبزادیاں پوری شرعی پابندیوں کے ساتھ زندگی گزارتی ہیں۔ اور دینی حیثیت سے اس گھرانہ کی زندگی ایک مثالی زندگی ہے ـــــ میں نے چاہا کہ اہلیہ کا چند روز حضرت شیخ کے گھر پر قیام رہے تاکہ وہ صحیح دینی زندگی کا نقشہ آنکھوں سے دیکھیں اور اللہ تعالیٰ توفیق

ے تو اس سے فائدہ اٹھائیں ــــ میں نے حضرت شیخ کو خط لکھ کر اجازت طلب کی، حضرت کی اجازت آجانے کے بعد یہ سفر ہوا۔ چند روز اہلیہ کا قیام حضرت کے یہاں رہا۔ انھوں نے جو کچھ دیکھا اور بعد میں مجھ کو بتلایا اس میں سے چند باتیں جو یاد رہ گئی ہیں، نذرِ ناظرین کرام ہیں۔

(۱) کوئی عزیز قریب بھی زنان خانہ میں نہیں آتے۔

(۲) کوئی داماد اگر اپنی اہلیہ سے کوئی ضروری بات کرنا چاہتے ہیں تو دروازہ ہی پر ان کو بلا کر بات کر لیتے ہیں۔

(۳) غیر معمولی تعجب کے ساتھ انھوں نے ذکر کیا کہ جو کھانا ہم اپنے گھر گھنٹوں میں پکاتے ہیں، وہ حضرت شیخ کے یہاں منٹوں میں تیار ہو جاتا ہے۔

اس سلسلہ میں انھوں نے ذکر کیا کہ ایک دن جب کہ کھانے کے وقت میں قریباً صرف آدھ گھنٹہ باقی تھا، حضرت شیخ نے بالاخانہ کے اپنے کمرے سے اطلاع دی کہ فلاں مہمان آگئے ہیں، ان کے لیے کچھ اہتمام کر لو، تو صرف آدھ گھنٹہ میں یا اس سے بھی کم وقت میں صاحبزادیوں نے پلاؤ تیار کر لیا اور ایک دو طرح کے سالن بھی ــــ میں حیرت سے دیکھتی رہی وہ پتیلی چولھے پر رکھتی تھیں اور جو کچھ پکانا ہوتا تھا اس میں ڈال دیتی تھیں، تھوڑی دیر کے بعد اتار لیتی تھیں اور کھانا تیار ہوتا تھا۔

اس سفر کی ایک خاص قابلِ ذکر بات یہ بھی ہے کہ اس سفر کا پروگرام میں نے اس طرح بنایا تھا کہ چند روز سہارنپور حضرت شیخ کے ہاں قیام کر کے ہم دونوں دہلی تبلیغی مرکز نظام الدین جائیں گے اور چند روز مرکز میں بھی میرا اور اہلیہ کا قیام رہے گا۔ چنانچہ سہارنپور سے ہم نے دہلی کا

سفر کیا۔ وہاں بھی زنان خانہ کا نقشہ غیر معمولی تھا۔ اماں جی (حضرت مولانا محمد یوسف صاحب رحمۃ اللہ علیہ کی والدہ ماجدہ مرحومہ) حیات تھیں جو زیادہ تر عبادت اور ذکر و تلاوت ہی میں مصروف رہتی تھیں۔ حضرت شیخ الحدیثؒ کی سب سے بڑی صاحبزادی حضرت مولانا محمد یوسفؒ کی اہلیہ محترمہ مرحومہ دق کی مریض تھیں۔ ضعف انتہائی درجہ کو پہنچ چکا تھا، اس کے باوجود صرف نماز ہی کا اہتمام نہیں تھا بلکہ اکثر کچھ نہ کچھ پڑھتی رہتی تھیں۔ ان کا حال دیکھ کر اہلیہ نے بتلایا کہ حیرت ہوتی تھی۔ بالآخر کافی عرصے کے بعد اسی مرض میں نماز پڑھتے ہوئے سجدہ کی حالت میں انتقال فرمایا۔ راقم سطور ان کی اس علالت کے بارہ میں اپنے اس مضمون میں لکھ چکا ہے جو حضرت مولانا محمد یوسف رحمۃ اللہ علیہ کی وفات کے بعد ان سے متعلق الفرقان کی خاص اشاعت میں شائع ہوا تھا اور بعد میں الفرقان کی وہ خاص اشاعت کچھ اضافوں کے ساتھ کتابی شکل میں تذکرہ حضرت مولانا محمد یوسفؒ کے نام سے شائع ہوئی۔

سہارنپور اور دہلی کے اس سفر کے بارہ میں یہ بات بھی خاص طور سے قابل ذکر ہے کہ جب میں سہارنپور سے حضرت شیخ سے رخصت ہو کر دہلی جانے لگا تو حضرت نے ہدیہ کے طور پر مجھے رقم عنایت فرمائی، جس کی مقدار اب یاد نہیں لیکن اتنی بات حافظہ میں ہے کہ وہ اس پورے سفر کے مصارف کے برابر تھی۔

۷

حدیث شریف میں ہے "من کان یؤمن باللہ والیوم الاٰخر فلیکرم ضیفہ" (جو بندہ اللہ پر اور یوم آخرت پر ایمان رکھتا ہو اس کو

یہ حال ہونا چاہیے کہ وہ اپنے مہمان کا اکرام کرے) اس حدیث پاک پر عمل کا اہتمام جیسا حضرت شیخ الحدیثؒ کے ہاں دیکھا۔ دوسری کسی جگہ کہیں دیکھنا یاد نہیں۔ جب سے حضرت سے خاص تعارف اور تعلق ہوا اور آمد و رفت شروع ہوئی۔ کبھی نہیں دیکھا کہ دستر خوان پر دو چار بیرونی مہمان نہ ہوں۔ ان کے لیے کھانے کا خصوصی اہتمام ہوتا۔ اگر معلوم ہوتا کہ فلاں مہمان کو فلاں چیز مرغوب ہے تو اس کے لیے اس کا بھی خاص اہتمام کیا جاتا۔ میرے متعلق حضرت کو معلوم ہو گیا تھا کہ مجھے میٹھے سے رغبت ہے۔ تو جب حاضر ہوتا میرے لیے خاص طور سے میٹھے کا اہتمام ہوتا۔ کبھی بازار سے بہترین قسم کی مٹھائی منگوائی جاتی۔ مجھے بڑی ندامت ہوتی اور دل پر بہت بوجھ پڑتا۔ لیکن معلوم تھا کہ حضرت شیخ کو اسی سے خوشی ہوتی ہے اس لیے تکلف کرنا مناسب نہیں سمجھتا تھا۔

ایک زمانے میں ایک طبیب صاحب کے مشورہ کی بنا پر میں کھانے کے بعد قریباً دو تولے گڑ کھاتا تھا۔ حضرت شیخ کو کسی طرح اس کا علم ہو گیا تھا تو پھر جب حاضر ہوتا تو پھر کھانے میں میرے لیے لازمی طور پر گھر میں سے گڑ بھی آتا اور اس کے ساتھ اعلیٰ درجہ کا دیسی گھی بھی۔

ایک دفعہ جب کہ حضرت شیخ کا قیام مدینہ منورہ میں تھا وہاں حاضری ہوئی۔ مدینہ طیبہ کے پورے زمانۂ قیام میں حضرت کا معمول رہتا تھا کہ صرف رات کو عشاء کے بعد کھانا تناول فرماتے تھے۔ دن میں کچھ نہیں۔ غالباً اس کی وجہ یہ بھی تھی کہ وہاں کے زمانۂ قیام میں روزہ رکھنے کا زیادہ معمول تھا۔ بہرحال ایک دفعہ میں مدینہ منورہ ایسے زمانہ میں حاضر ہوا جب حضرت شیخ کا وہاں قیام تھا۔ پہلی ہی ملاقات میں فرمایا

کہ جب تک یہاں قیام ہے رات کا کھانا تمھیں میرے ہی ساتھ کھانا ہوگا دن میں تمھیں اختیار ہے۔ میں رات کو بعد عشاء حسب الحکم کھانے کے وقت حاضر ہوا۔ ایک خادم خاص کو بلا کر فرمایا دیکھو پاکستان کے ایک صاحب ہدیہ میں گڑ دے گئے تھے وہ میں نے رکھوا دیا تھا۔ میرا نام لیکر فرمایا کہ یہ آ گئے، میں نے انہی کی نیت سے رکھوایا تھا۔ چنانچہ وہ پاکستانی گڑ آیا اور جب تک مدینہ منورہ اس عاجز کا قیام رہا، کھانے میں روزانہ میرے لیے گڑ بھی آتا رہا۔

۸

سہارنپور کے زمانہ قیام میں کھانے کے معاملہ میں مدینہ منورہ کے قیام کے برعکس حضرت کا عمومی معمول یہ رہتا تھا کہ صرف دن کو مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرماتے، رات کو کھانے کا معمول نہیں تھا، کبھی کوئی غیر معمولی اہمیت والے مہمان ہوتے تو ان کے اکرام میں رات کے دسترخوان پر بھی ان کے ساتھ بیٹھ جاتے اور اپنے طرز عمل سے یہ ظاہر کرتے کہ وہ بھی کھانے میں شریک ہیں۔ اب سے قریباً چالیس سال پہلے جب حضرت شیخ کی خدمت میں عقیدتمندانہ اور نیازمندانہ حاضری کا سلسلہ شروع ہوا تھا تو ان کے دسترخوان پر مہمانوں اور روزمرہ ساتھ کھانے والوں کی تعداد جہاں تک اب یاد ہے بیس پچیس کے لگ بھگ ہوتی تھی، اس کے بعد اس میں اضافہ ہوتا رہا، آخری سالوں میں کبھی کبھی مہمانوں کی تعداد سیکڑوں تک پہنچ جاتی تھی۔ حضرت کے خاص خادم (بلکہ کہنا چاہیے کہ مدار المہام) مولوی نصیر الدین صاحب مرحوم و مغفور سب کے کھانے کھلانے کا انتظام کرتے تھے۔ اللہ تعالیٰ نے ان کو اس کا خاص سلیقہ

عطا فرمایا تھا۔۔۔۔ دسترخوان پر ایک تو گوشت کا عام سالن ہوتا تھا، جو بالکل سادہ اور تیلا شوربہ ہونے کے باوجود بہت لذیذ ہوتا تھا۔ کبھی اس کے ساتھ کوئی دال بھی ہوتی تھی۔ یہ دونوں چیزیں سب کے سامنے ہوتی تھیں۔ ان کے علاوہ خاص مہمانوں کے لیے (جن میں ہم جیسے نیازمند بھی شامل تھے) دو چیزیں لازماً ہوتی تھیں۔ ایک بہت عمدہ قسم کا پلاؤ، اور ایک خاص طریقہ پر پکا ہوا گوشت جس کو وہاں کی خاص اصطلاح میں "زبیتیہ" کہا جاتا ہے (اس کو ایک قسم کا اسٹو سمجھنا چاہیے) یہ نہایت ہی لذیذ ہوتا تھا (حضرت شیخ کے دسترخوان کے علاوہ کہیں ایسا لذیذ کھانا یاد نہیں)۔۔۔۔ یہ دونوں چیزیں اکثر خاص مہمانوں ہی کے لیے ہوتی تھیں، ضروری نہیں تھا کہ سب مہمانوں کے سامنے رکھی جائیں۔۔۔ اس طرزِ عمل کے سلسلہ میں شیخ کبھی کبھی ام المومنین حضرت عائشہ صدیقہ رضی اللہ عنہا کا وہ واقعہ بھی بیان فرماتے جو حدیث کی کتابوں میں ذکر کیا گیا ہے کہ۔۔۔ ام المومنین کے ہاں ایک سائل آیا جو کھانے کا طالب تھا تو حضرت عائشہؓ نے روٹی کا ایک ٹکڑا اس کے لیے بھیج دیا، پھر ایک اور شخص آیا جو اپنی ہیئت اور لباس وغیرہ سے شریف آدمی معلوم ہوتا تھا، لیکن کھانے کا طالب اور ضرورت مند تھا۔ تو ام المومنین نے اس کے لیے پورا کھانا بھیجا اور اس کو بٹھا کر کھانا کھلوایا۔ اس پر کسی صاحب نے اس تفریقی طرزِ عمل کے بارے میں حضرت ام المومنین سے سوال کیا، تو آپ نے فرمایا کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ہم کو ہدایت فرمائی ہے کہ ان ننزل الناس منازلهم (یعنی یہ کہ ہم آدمیوں کے ساتھ ان کی حیثیت اور مرتبہ کے مطابق معاملہ کیا کریں۔)

(۹)

مرشدنا حضرت رائے پوری قدس سرہٗ علیل تھے، بسلسلۂ علاج سہارنپور میں شاہ مسعود صاحب مرحوم کی کوٹھی "بہشت ہاؤس" میں حضرت کا قیام تھا، زیارت اور عیادت کے سلسلہ سے روزانہ بڑی تعداد میں مہمان آتے اور جاتے تھے، سب مہمانوں کے کھانے کا انتظام خود حضرت قدس سرہٗ کی طرف سے تھا۔ اس انتظام کے ذمہ دار حضرت کے خاص خادم ہمارے لکھنؤ ہی کے قاری شبیر صاحب مرحوم تھے۔ یہ کھانا بالکل سادہ خانقاہی لنگر کا سا ہی ہوتا تھا ــــ یہ عاجز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی حضرت قدس سرہٗ کی زیارت و عیادت کے لیے سہارنپور گئے ہوئے تھے اور بہشت ہاؤس ہی میں قیام تھا۔ حضرت شیخ نے ہم دونوں کو حکم دے رکھا تھا کہ روزانہ دوپہر کا کھانا میرے ہی ساتھ کھایا کرو، ہم ایسا ہی کرتے تھے ــــ ان ہی دنوں میں ہمارے لکھنؤ کے ایک رئیس جو اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے بڑے دیندار اور صاحب خیر بھی تھے اور ہم دونوں سے بھی ان کا خاص تعلق تھا،[۱] غالباً حضرت رائے پوری قدس سرہٗ اور حضرت شیخ کی بھی زیارت و ملاقات ہی کے مقصد سے سہارنپور تشریف لائے، حضرت شیخ نے ان سے بھی فرما دیا کہ دوپہر کا کھانا آپ میرے ساتھ کھالیں اور کھانے کا وقت بھی بتلا دیا ــــ وہ مقررہ وقت پر شیخ کے ہاں تشریف لے آئے، ہم دونوں بھی موجود تھے حسب معمول دسترخوان بچھا۔ حضرت شیخ نے لکھنؤ کے ان صاحب کو بھی

---

[۱] یہ لکھنؤ کے مشہور و معروف تاجر رئیس مرحوم و مغفور شیخ مستنصر اللہ صاحب تھے۔

ہم دونوں کے ساتھ ہی بٹھایا۔ اب کھانا آنا شروع ہوا۔ معمول کے مطابق پلاؤ اور زردہ بھی آیا (غالباً اس دن اور بھی کئی قسم کے سالن تھے) ان صاحب نے فرمایا کہ میں تو اس امید پر آیا تھا کہ بزرگوں کے دسترخوان پر جو کی روٹی چٹنی یا دال ملے گی ــــ حضرت شیخؒ نے فرمایا یہاں تو اللہ تعالیٰ یہی کھلاتا ہے، اس کو اللہ تعالیٰ کا عطیہ سمجھ کر یہاں کھالو، اللہ کے فضل سے وہ نمونہ بھی موجود ہے، شام کو بہٹ ہاؤس میں مہمانوں کے ساتھ کھائیو ــــ ہم دونوں کی طرف اشارہ کرکے فرمایا کہ یہ دونوں بھی شام کو وہیں ہوں گے۔

۱۰

ان ہی دنوں میں جب حضرت قدس سرہٗ کا قیام بسلسلۂ علاج سہارنپور بہٹ ہاؤس میں تھا اور راقم سطور اور رفیق محترم مولانا علی میاں بھی وہاں مقیم تھے، ایک دن اس عاجز نے حضرت سے اجازت لے کر مہمانوں کی ضیافت کا ارادہ کیا۔ لنگر خانہ کے منتظم اور مہتمم قاری شبیر صاحب مرحوم سے کہہ دیا کہ جہاں تک ہوسکے مہمانوں کے لیے آج اچھا کھانا تیار کرانے کی کوشش کی جائے۔ اللہ تعالیٰ قاری صاحب کی قبر پر بے حساب رحمتیں نازل فرمائے انھوں نے اس دن بہت اچھا کھانا تیار کرایا ــــ ان دنوں حضرت شیخؒ کا مستقل معمول تھا کہ بخاری شریف کا سبق پڑھا کر بہٹ ہاؤس تشریف لے آتے اور اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانے کا جو وقت مقرر تھا اس سے پہلے واپس تشریف لے جاتے اور ان کے ساتھ کھانا تناول فرماتے ــــ اس دن حضرت شیخؒ جب بہٹ ہاؤس تشریف لائے تو کسی نے اس کا ذکر کر دیا کہ آج یہاں کے مہمانوں کے کھانے کی دعوت

میری طرف سے ہے ۔۔۔ میں نے حضرت شیخ سے اس کا ذکر کرنے اور کھانے پر حضرت کو کبھی مدعو کرنے کی جرأت اس لیے نہیں کی تھی کہ حضرت کا معمول اپنے مہمانوں کے ساتھ کھانا تناول فرمانے کا ہے اور حضرت اس کا اہتمام فرماتے ہیں۔ اس کے علاوہ یہ خیال بھی حضرت کو مدعو کرنے سے مانع ہوا کہ حضرت کے کھانے کا (اور ہر کام کا) گھنٹوں، منٹوں کے حساب سے وقت مقرر ہے اور مجھے امید نہیں کہ بہٹ ہاؤس میں کھانا حضرت شیخ کے مقررہ وقت تک تیار ہو سکے گا ۔۔۔ لیکن مجھے بڑی ندامت ہوئی جب حضرت شیخ نے خود ارشاد فرمایا کہ مولوی صاحب! میں تمہاری دعوت کھانے جاؤں گا! ۔۔۔ چنانچہ حضرت نے کھانا تناول فرمایا اور اس کے بعد تشریف لے گئے۔

۱۱

قریباً تیس سال پہلے کی بات ہے، مولانا شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم و مغفور، دارالعلوم ندوۃ العلماء کے شیخ الحدیث تھے، وہ صرف صحیح بخاری اور صحیح مسلم کا درس دیتے تھے اور یہ دونوں کتابیں دو سال میں ختم ہوتی تھیں ۔۔۔ موصوف پر فالج کا حملہ ہوا جس کی وجہ سے درس کا سلسلہ معطل رہا ۔۔۔ دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے کہا گیا کہ جب تک شاہ صاحب صحت یاب ہوں اور درس کے لائق ہو سکیں میں دو گھنٹے کے لیے دارالعلوم آکر یہ دو سبق پڑھا دیا کروں اس کے لیے شاہرہ کی بھی پیش کش کی گئی ۔۔۔ اتفاق سے اس سال ان دونوں کتابوں کی پڑھنے والی جماعت میں بعض ایسے طلبہ بھی تھے جو اس عاجز سے گہرا مخلصانہ تعلق رکھتے تھے، اور میرے دل میں ان کی

قدر تھی، انھوں نے بھی اس کے لیے اصرار کیا اور خود مجھے بھی ان کے تعلیمی نقصان کا احساس تھا ___ میں نے اپنے مستقل ضروری مشاغل اور حالات کو پیش نظر رکھتے ہوئے دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات سے عرض کیا کہ میں روزانہ دو گھنٹے تو نہیں دے سکتا، اتنا کر سکتا ہوں کہ ایک گھنٹے کے لیے آکر صرف صحیح مسلم کا سبق پڑھا دیا کروں. شاہ صاحب جب صحت یاب ہو جائیں گے تو وہ بخاری شریف پڑھا دیں گے، اس طرح اس جماعت کا تعلیمی نصاب بھی پورا ہو جائے گا ___ میں اس ایک گھنٹہ کا کوئی مشاہرہ اور معاوضہ نہیں لوں گا، البتہ میری آمد و رفت رکشے سے ہوگی، اس کا کرایہ دارالعلوم کی طرف سے ادا کر دیا جایا کرے گا ___ یہی طے ہو گیا اور میں ایک گھنٹہ کے لیے دارالعلوم آکر صحیح مسلم کا درس دینے لگا. شاہ صاحب کا علاج جاری تھا، امید تھی کہ ان شاء اللہ کچھ عرصہ میں شفایاب ہو کر وہ درس کا سلسلہ جاری کر سکیں گے. لیکن اللہ تعالیٰ کی مشیت کہ چند مہینے کے بعد مرض کا اختتام اُن کے سفر آخرت پر ہوا. (رحمہ اللہ تعالیٰ رحمۃ الابرار الصالحین.)

میں نے مسلم شریف پڑھا رہا تھا بفضلہ تعالیٰ تعلیمی سال کے اختتام تک وہ ختم ہو گئی.

اس کے بعد جب دوسرا تعلیمی سال شروع ہوا تو دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے پھر مجھ سے کہا گیا کہ اب میں مستقل دو گھنٹے دے دیا کروں اور حدیث کے دو سبق پڑھانے کی ذمہ داری قبول کر لوں. میں اپنے دوسرے مستقل مشاغل کی وجہ سے اس وقت بھی اپنے کو اس کے لیے آمادہ نہیں کر سکا، میں نے عرض کیا کہ جب تک شاہ صاحب مرحوم کی جگہ

کسی استاذ حدیث کا انتظام ہو میں ایک گھنٹہ جس طرح اب تک دیتا رہا ہوں انشاء اللہ دیتا رہوں گا۔ چنانچہ اس کے بعد بھی روزانہ ایک گھنٹہ کے لیے دارالعلوم آتا رہا اور ایک سبق پڑھاتا رہا ـــــ دو تین سال اسی طرح گزر گئے اور شاہ حلیم عطا صاحب مرحوم و مغفور کی جگہ کسی استاذ حدیث کا انتظام نہیں ہو سکا تو پھر دارالعلوم کے ذمہ دار حضرات کی طرف سے مجھ سے اصرار کے ساتھ فرمائش کی گئی کہ میں دارالعلوم کی ضرورت کو پیش نظر رکھتے ہوئے اس ذمہ داری کو بہرحال قبول کر لوں اور روزانہ صرف دو گھنٹے کے لیے دارالعلوم آکر حدیث شریف کے دو سبق پڑھا دیا کروں۔ اور اس کے لیے معقول مشاہرہ کی پیش کش بھی کی گئی۔

میں نے اگرچہ طالب علمی سے رسمی فراغت کے بعد ۳۔۴ سال تک باتنخواہ مدرس کی حیثیت سے تدریس کی خدمت بھی انجام دی تھی لیکن اس کے بعد کسی مدرسے سے ملازمت کا تعلق نہیں رکھا۔ طبیعت آزاد رہ کر ہی حسب توفیق کام کرنے کی عادی ہو گئی اور اسی کو اپنے لیے بہتر سمجھا (بعض تلخ تجربے بھی اس کا سبب بنے تھے) ـــــ اس وجہ سے دارالعلوم ندوۃ العلماء کی اس پیش کش کو قبول کرنے پر بھی طبیعت آمادہ نہیں ہوئی ـــــ دوسری طرف یہ خیال بھی ہوتا تھا کہ حدیث شریف اور صرف حدیث شریف کی مستقل تدریسی خدمت کا موقع مل رہا ہے، اس سے انشاء اللہ خود مجھے بھی علمی اور دینی نفع ہوگا اور مشاہرہ کی شکل میں دنیوی منفعت بھی ہے، وہ بھی اللہ کی نعمت ہے اور طبیعت کا انکار شاید نفس کے استکبار اور استنکاف کی وجہ سے ہے جو باتنخواہ ملازمت کو اپنے لیے گھٹیا درجہ کی بات سمجھنے لگا ہے، اور اگر ایسا ہے تو یہ شیطانی وسوسہ ہے۔

اس مسئلے کے مختلف پہلوؤں پر کافی غور و فکر کے بعد بھی میں کوئی فیصلہ نہیں کر سکا تو مشورہ کے لیے سہارنپور حضرت شیخ الحدیث کی خدمت میں حاضر ہوا اور پوری بات عرض کی ــــ حضرت نے فرمایا مولوی صاحب ضرور قبول کر لو اور مشاہرہ بھی قبول کرو اور نیت کر لو کہ چار چھ مہینے وصول کرنے کے بعد چھوڑ دو گے اور پھر بغیر مشاہرہ ہی کے پڑھاؤ گے، یہ بھی فرمایا کہ اگر شروع ہی سے مشاہرہ نہ لو گے تو طلبہ بھی قدر سے تمہاری بات نہیں سنیں گے اور مدرسہ والے سمجھیں گے کہ ہم نے اس پر احسان کیا ہے کہ درس میں درس حدیث کی مسند پر اس کو بٹھا دیا ہے، اس لیے میری رائے ہے کہ شروع میں چند مہینے مشاہرہ ضرور وصول کرو، بعد میں چھوڑ دو ــــ میں نے عرض کیا کہ حضرت یہ بات میرے بس کی نہیں ہے۔ میں جب دو گھنٹے پڑھانے کی ذمہ داری لے لوں گا تو اس کے لیے ۳-۴ گھنٹے تیاری کرنی ہو گی اور پھر میں اپنے وہ کام پوری طرح نہیں کر سکوں گا جو اب کر لیتا ہوں اور اس عالم اسباب میں انہی سے میری ضروریات پوری ہوتی ہیں۔ اس صورت میں وہ کمی مشاہرہ سے پوری ہوتی رہے گی، اس لیے پھر یہ مشاہرہ میری ضرورت بن جائے گا اور میں اسے چھوڑ نہیں سکوں گا۔

میری یہ بات سن کر حضرت شیخ نے میری اصلاح و تربیت کے لیے خود اپنے کچھ واقعات سنائے جن کا سبق یہ تھا کہ جب بندہ اللہ تعالیٰ پر توکل کر کے اخلاص کے ساتھ دین کا کام کرے تو اللہ تعالیٰ کی طرف سے اس کے ساتھ کیا معاملہ ہوتا ہے اور "ومن یتوکل علی اللہ فھو حسبہ" کا کس کس طرح ظہور ہوتا ہے ــــ یہ واقعات بہت غیر معمولی قسم کے تھے اور ان میں میرے لیے اور میرے جیسوں کے لیے بڑا قیمتی سبق تھا۔

حضرت شیخ سے یہ ساری گفتگو ان کے "کچے گھر" میں تنہائی میں ہوئی، اس کے بعد جب میں حضرت کے پاس سے اٹھ کر قیام گاہ والے کمرے میں آیا تو خیال ہوا کہ حضرت شیخ نے اس وقت اپنے جو واقعات بیان فرمائے ہیں ان کو میں ابھی قلم بند کرلوں اور ایک مضمون کی شکل میں مرتب کرکے "الفرقان" میں شائع کردیا جائے، امید ہے کہ اللہ کے بندوں کو انشاء اللہ ان سے بہت نفع ہوگا اور وہ ان سے وہ سبق حاصل کرسکیں گے جو اپنی کم ہمتی کی وجہ سے خود میں حاصل نہیں کرسکا۔ (حدیث شریف میں ہے رُبَّ مُبَلَّغٍ أوعىٰ من سامعٍ) — اللہ تعالیٰ کے فضل وکرم سے اس وقت تک میرا حافظہ بہت اچھا تھا میں نے اسی وقت وہ واقعات ممکن حد تک حضرت شیخ ہی کے الفاظ میں قلمبند کرلیے — اور لکھنؤ واپس آکر ایک تمہید کے ساتھ مضمون کی شکل میں مرتب کرکے الفرقان کے لیے ان کی کتابت بھی کرالی۔ اس کے بعد بس طباعت کے لیے پریس کو دینے کا مرحلہ ہی باقی تھا کہ مجھے یہ خیال آیا کہ حضرت شیخ نے اپنے یہ واقعات میری اصلاح اور میرے مرض کے علاج کے لیے تنہائی میں رازدارانہ طور پر بیان فرمائے تھے۔ ممکن ہے ان کی اشاعت حضرت کی ناگواری کا باعث ہو — یہ خیال آنے کے بعد میں نے حضرت کی خدمت میں عریضہ لکھا اور اس دن کی گفتگو کا حوالہ دے کر الفرقان میں ان کی اشاعت کی اجازت چاہی — جواب میں حضرت کا مفصل گرامی نامہ آیا جس میں سختی سے منع فرمایا گیا تھا۔ وہ میرے لیے خود اپنے باطن کو دیکھنے کا آئینہ بن گیا۔ اللہ تعالیٰ توفیق عطا فرمائے کہ جو سبق اس سے ملا وہ ہمیشہ یاد رہے۔

آج بڑے ہی رنج و قلق کے ساتھ کہہ رہا ہوں کہ میری بہت بری عادتوں میں سے ایک یہ بھی ہے کہ میں نے اپنے اکابر کے مکاتیب گرامی بھی محفوظ رکھنے کا اہتمام نہیں کیا، نہایت ہی افسوس ہے کہ حضرت شیخ کا یہ مکتوب گرامی بھی محفوظ نہیں رکھا۔ اگر محفوظ ہوتا تو بلفظہٖ نقل کیا جاتا اب اپنی یادداشت سے اس کا مضمون اور حاصل ہی نذر ناظرین کر رہا ہوں (حضرت شیخ نے اس عاجز راقم سطور کو مخاطب کر کے جو کچھ تحریر فرمایا تھا، جہاں تک یاد ہے اس کا حاصل یہ تھا کہ)

تمہارا میرے متعلق زیادہ سے زیادہ یہی تو گمان ہوگا کہ میں بفضل اللہ تعالیٰ معاصی حیوانیہ سے محفوظ ہوں، لیکن تم یہ اندازہ کیسے کر سکتے ہو کہ میں معاصی شیطانیہ سے بھی محفوظ ہوں، معاصی شیطانیہ کبر و ریا اور حسد وغیرہ باطنی کبائر ہیں، اور یہ معاصی حیوانیہ زنا اور چوری وغیرہ سے بھی اشد ہیں ____ میرے والد ماجد (حضرت مولانا محمد یحییٰ صاحبؒ) فرمایا کرتے تھے کہ اس کی دلیل یہ ہے کہ صحیحین میں حضرت ابوذر غفاریؓ کی حدیث ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے ارشاد فرمایا کہ جس بندہ نے صدق دل سے کلمۂ اسلام پڑھ لیا (یعنی دل سے ایمان لے آیا) وہ جنت میں ضرور جائے گا۔ حضرت ابوذر غفاریؓ نے یہ سن کر عرض کیا کہ "وان زنی وان سرق" (اگرچہ اس نے زنا کیا ہو اور چوری کی ہو) حضورؐ نے ارشاد فرمایا کہ ہاں اگرچہ اس نے زنا اور چوری کا گناہ کیا ہو پھر بھی وہ بخش دیا جائے گا، اور (بالآخر) جنت میں چلا جائے گا۔

حضرت ابوذر غفاریؓ نے اس کے بعد بھی تعجب سے اپنا سوال دہرایا۔ حضورؐ نے پھر وہی جواب ارشاد فرمایا پھر حضرت ابوذرؓ کے تیسری دفعہ سوال کرنے پر بھی وہی جواب ارشاد فرمایا اور مزید تاکید کے طور پر ارشاد فرمایا "وان رغم انف ابی ذر"
۔۔۔ تو زنا اور چوری جو معاصی حیوانیہ میں سے ہیں ان کے بارے میں تو حضورؐ نے یہ ارشاد فرمایا اور کبر جو معاصی شیطانیہ میں سے ہے اس کے بارے میں صحیح مسلم میں حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی حدیث ہے کہ جس شخص کے دل میں رائی کے دانے کے برابر اور ذرہ برابر بھی کبر ہوگا وہ ہرگز جنت میں نہ جا سکے گا۔[1]

حضرت شیخؒ نے آخر میں تحریر فرمایا تھا کہ میں اپنا حال جانتا ہوں، اپنے کو میں معاصی شیطانیہ سے محفوظ نہیں سمجھتا، ایسی حالت میں میرے متعلق ہرگز وہ باتیں شائع نہ کی جائیں جو تم شائع کرنا چاہتے ہو۔ میں بھی دعا کرتا ہوں تم بھی دعا کرو کہ اللہ تعالیٰ ہر طرح کے معاصی سے پاک فرمائے۔

حضرت شیخ کا یہ مکتوب گرامی خاصا طویل اور مفصل تھا، یہاں جو کچھ لکھا گیا ہے جیسا کہ عرض کیا جا چکا وہ صرف اس کا ماحصل اور خلاصہ

---

[1] شارحین نے اس کا مطلب یہ بیان کیا ہے کہ جس شخص کے دل میں کبر ہوگا وہ کبر کی سزا پائے بغیر جنت میں نہ جا سکے گا۔ واللہ اعلم۔

ہے جو یاد رہ گیا ہے۔

یہاں راقم سطور اللہ تعالیٰ کے اس انعام اور حضرت شیخ کے اس احسان کا ذکر بھی ضروری سمجھتا ہے کہ اس مکتوب گرامی کے مطالعہ سے اپنی حقیقت معلوم ہوگئی، اپنے اندر کے وہ شیطانی معاصی گویا آنکھوں کے سامنے آگئے جن سے غفلت تھی اور ان کے بارے میں فکر نصیب ہوگئی۔

اللہ تعالیٰ سے دعا اور التجا ہے کہ جن ظاہری و باطنی اور حیوانی و شیطانی معاصی میں اب تک ابتلا رہا ان کو وہ اپنے کرم سے معاف فرمائے اور اپنی خاص رحمت سے ظاہر و باطن کو پاک فرمائے۔

ربنا تقبل منا انك انت السميع العليم وتب علينا

انك انت التواب الرحيم

اللہ کا ایک بندہ

حضرت حاجی عبدالغفور جودھپوری

۲۵-۲۶ سال پہلے کی بات[1] ہے۔ الفرقان کی عمر کا غالباً دوسرا سال تھا، ریاست جودھپور کے بعض حضرات کی دعوت پر وہاں میرا جانا ہوا۔ اس وقت ان داعیوں سے اس ناچیز کا تعلق بس اتنا ہی تھا کہ وہ الفرقان کے خریدار اور اس کے قدردان تھے اور ہمارے علمی اور دینی اکابر خصوصاً حکیم الامت حضرت تھانوی (نور اللہ مرقدہ) سے عقیدت و محبت رکھتے تھے۔

جہاں تک یاد ہے جودھپور میں میرے خاص داعی حکیم محمد صدیق صاحب غوری تھے، خط و کتابت سے میں انہی کو جانتا تھا، انہی کے مکان پر میرا قیام ہوا تھا۔ اسی قیام کے دوران حکیم صاحب موصوف کے والد ماجد حضرت حاجی عبدالغفور صاحب مدظلہ سے واقفیت ہوئی، اس وقت وہ ٹھیکیداری کا کام کرتے تھے اور اپنے کام میں کافی مشغول رہتے تھے۔ دو ہی چار دن کے اس

---

[1] ملحوظ رہے کہ حضرت حاجی عبدالغفور صاحب رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق یہ مقالہ ذیقعدہ ۱۳۸۹ھ میں لکھا گیا تھا۔

قیام میں اُن کی جو باتیں سنیں اور زندگی کا جو طرز دیکھا اس سے اندازہ ہوا کہ ان کا یہ بندہ اگرچہ بقول خود "بے پڑھا" ہے، اردو کی بس کچھ شُد بُد ہے ایک خط بھی اپنے ہاتھ سے نہیں لکھ سکتا ہے، لیکن دین کا فہم سیکڑوں پڑھے لکھوں بلکہ بہت سے فارغ التحصیل عالموں سے بھی اچھا ہے اور عملی زندگی بھی ہم جیسوں کے لیے بڑی سبق آموز ہے۔ بہرحال جودھپور کے اس پہلے سفر ہی میں حضرت حاجی صاحب سے میں واقف ہوا، لیکن یہ واقفیت بہت سرسری اور بالکل اجمالی تھی۔ اس کے ایک دو سال بعد پھر ایک دفعہ جودھپور جانا ہوا، حضرت حاجی صاحب ہی کے دولت کدہ پر اس مرتبہ بھی دو تین دن قیام رہا اور حضرت موصوف سے عقیدت اور تاثر میں اور کچھ اضافہ ہوا۔

پھر اب سے کوئی دو ڈھائی برس پہلے حضرت حاجی صاحب ہی کے ارشاد پر چند ہی مہینوں کے فاصلے سے پی پاڑ[1] اور جودھپور کے دو سفر ہوئے جن میں سے ایک میں رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی بھی ساتھ تھے، ان دونوں سفروں میں قریباً ایک ایک ہفتہ حضرت حاجی صاحب کا برابر ساتھ رہا اور یہ اندازہ ہوا کہ حضرت موصوف کے بارہ میں جو کچھ ۸ برس پہلے جانا اور سمجھا تھا وہ اصلیت کے لحاظ سے بہت کم تھا۔ ان دونوں سفروں میں ایں سوالات کر کر کے زندگی کے واقعات اور حالات حضرت حاجی سے پوچھتا بھی رہا اور وہ بڑی شفقت اور بڑے نشاط کے ساتھ بیان فرماتے رہے، کچھ عرصہ کے بعد مجھے خیال آیا کہ یہ چیزیں کم از کم اپنی ہی تذکیر کے لیے قلم بند کر لینی چاہئیں چنانچہ کاغذ کے ایک ورق پر مختصر اشاروں میں حافظہ کی مدد سے وہ چیزیں

---

(۱) پی پاڑ، جودھپور کا گویا ایک قصبہ ہے، وہل یا اگر سے جودھپور جاتے ہوئے قریباً ہم پہلے پڑتا ہے

نوٹ کرلیں ـــــ پھر حضرت حاجی صاحب ازراہِ شفقت وعنایت دوبار لکھنؤ بھی تشریف لائے اور دونوں دفعہ قریباً ایک ایک ہفتہ قیام فرمایا آخری تشریف آوری اسی مہینہ ذیقعدہ (مطابق مئی [illegible]) میں ہوئی تھی، حضرت موصوف کے جو حالات میں نے پہلے حافظہ سے نوٹ کئے تھے اس دفعہ میں نے ایک صحبت میں سوالات کرکرکے ان کے بارہ میں مزید اطمینان حاصل کیا اور کچھ اضافہ بھی ہوا۔

غور وفکر کے بعد میری یہ رائے قائم ہوئی ہے کہ ان حالات کو ترتیب دے کے اللہ کے بندوں کی سبق آموزی اور نصیحت پذیری کے لیے شائع کردیا جائے۔ میں اپنے اس عمل سے اللہ کے بندوں کے دینی نفع کی اور اپنے لیے اجرِ اُخروی کی قوی امید رکھتا ہوں۔

یہ حضرت موصوف کی کوئی سوانح عمری نہیں ہے بلکہ زندگی کے جستہ جستہ کچھ حالات اور واقعات ہیں جو مختلف صحبتوں میں سنے گئے تھے اور کچھ اپنے مشاہدات اور تاثرات ہیں۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ پہلے مختصر لفظوں میں ناظرین سے حضرت حاجی صاحب کا کچھ تعارف کرادیا جائے۔

حضرت حاجی صاحب کی عمر اس وقت ۸۱ سال ہے، خاص شہر جودھپور کے ایک نہایت غریب تیلی گھرانے میں پیدا ہوئے جس میں دین یا علمِ دین کا کوئی ذکر بھی نہ تھا، ایسے غریب اور پست گھرانوں کے بچے جس طرح پلتے بڑھتے ہیں اسی طرح حاجی صاحب بھی پلے بڑھے۔ جب مزدوری کے قابل ہوئے مزدوری کرنے لگے، اسی زمانہ میں اللہ کی توفیق سے کچھ دینی باتیں کان میں پڑیں اور دین سے لگاؤ پیدا ہوا۔ اب دین ودنیا کی دونوں ترقیاں ساتھ ساتھ شروع

ہوئیں۔ مزدوری کرتے کرتے ٹھیکیداری تک پہنچے اور اس لائن میں اللہ نے ایسا کامیاب اور نیک نام کیا کہ لوگ اپنی بلڈنگیں بنوانے کے لئے انکی فرصت اور فراغت کا انتظار کرتے۔ اللہ تعالیٰ نے کمائی میں ایسی برکت دی کہ لاکھوں کمائے اور بے دریغ مصارف خیر میں صرف بھی کرتے رہے۔ آخر میں شہر کے ایک مناسب مقام پر ایک بڑا پلاٹ خرید کے قطعہ سا گویا ایک چھوٹا سا محلہ بنایا جو "اشرف منزل" کے نام سے موسوم ہے جس میں ایک مسجد اور ایک مدرسہ کے علاوہ، مکانات اور چند دوکانیں ہیں ـــــ پھر اس سب کو ٹھکانے لگا کے (جس کی تفصیل آگے معلوم ہوگی) ایسے بے نوا ہوگئے جیسے ماں کے پیٹ سے پیدا ہوئے تھے۔

دینی ترقی کرتے ہوئے اس مقام پر پہنچے کہ حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ نے مجازِ تلقین بنایا۔ لکھنے پڑھنے میں حال یہ ہے کہ اُردو پڑھ لیتے اور سمجھ لیتے ہیں، لیکن غالباً خط نہیں لکھ سکتے ہیں، تعلیم کی اس کمی کی وجہ سے تلفظ بھی پورا صحیح نہیں ہے، لیکن دینی فہم جس کو قرآن مجید میں "حکمت" کہا گیا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے اس سے ایسا وافر حصہ عطا فرمایا ہے کہ بعض باتیں سُن کے ہم جیسے کتاب خوانوں کو حیرت ہوتی ہے ـــــ اپنے مرشد علیہ الرحمۃ سے بے انتہا تعلق ہے، لیکن غلو کا نام و نشان نہیں۔ دعا ان کا ہر وقت کا وظیفہ اور حال ہے، سنت و شریعت کا اتباع گویا ان کا مزاج بن گیا ہے، دیکھنے میں ایسے سادے اور لباس اتنا معمولی کہ اگر کوئی ناواقف ان کو "اشرف منزل" کے بڑے دروازے کے پاس بیٹھا دیکھے، جہاں وہ کبھی کبھی بیٹھتے ہیں، تو زیادہ سے زیادہ ان کو وہاں کا دربان سمجھے۔ اور اگر کوئی ان کو اشرف منزل کی مسجد میں دیکھے جس کا چھوٹا سا ایک حجرہ ان کی اب قیام گاہ ہے تو مسجد کا خادم

اور جاذب کشش تصور کرے۔ لباس کے علاوہ بھی ان کے کسی ڈھنگ سے کوئی آدمی یہ نہیں سمجھ سکتا کہ دنیا یا دین کسی لحاظ سے بھی یہ شخص کوئی بڑا آدمی ہے۔

اس مختصر تعارف کے بعد میں ممدوح کے وہ حالات لکھتا ہوں، جو میں نے مختلف صحبتوں میں سُن سُن کے نوٹ کیے تھے یا ذاتی مشاہدے سے مجھے معلوم ہوئے ہیں۔

جو حالات حضرت ممدوح سے سنے ہوئے ہیں میں کوشش کروں گا کہ حضرت کے جو الفاظ یاد ہیں حتی الوسع ان ہی الفاظ میں قلمبند کروں۔

بچپن

ناچیز راقم سطور کے ایک سوال کے جواب میں حضرت حاجی صاحب نے اپنے بچپن کا حال بیان فرماتے ہوئے بتلایا۔

گھر میں گھانی کا (یعنی کولھو سے تیل نکالنے کا) کام ہوتا تھا، چونکہ غربت بہت تھی اس لیے جب میں کولھو کے بیل کے پیچھے چلنے کے لائق ہوا، اسی وقت سے گھر کے اس کام میں لگ گیا ـــــ جب کچھ اور بڑا ہوا تو گوبر بیننے کا کام بھی کرنے لگا، دادی میرے سر پر ٹوکری رکھ دیتی تھیں اور میں چرائی کے لیے جنگل جانے والے جانوروں کے پیچھے پیچھے اُن کا گوبر بیننے کے لیے چلا جاتا تھا، جب وہ ٹوکری بھر جاتی تو میں گھر واپس آجاتا، اور دادی کے ساتھ اُپلے بھی پاتھتا۔

بچپن میں مجھے سیپارہ پڑھنے کے لیے ایک مکتب میں بٹھایا گیا تھا، بس عم تبارک کی چند سورتیں پڑھی تھیں کہ پڑھانے والے صاحب نے

ایک دن استاد صاحب کو میرا پاجامہ خراب ہوگیا، گھر آیا، دادی نے نہلایا دُھلایا اور بس اسی پر پڑھائی ختم ہوگئی۔

یتیمی

میری عمر کا گیارھواں سال تھا کہ میرے والد صاحب کا انتقال ہوگیا انھوں نے گھر میں دو پیسے بھی نہیں چھوڑے بلکہ کچھ قرض چھوڑا جو اللہ تعالیٰ نے مجھ سے ہی ادا کرایا۔

مزدوری کا آغاز

چونکہ گھر کے کام کھانے میں پورا نہیں پڑتا تھا بڑی تنگی سے گزارہ ہوتا تھا اس لیے جب میں باہر محل کے مزدوری کرنے کے لائق ہوا تو مکانوں کی تعمیر میں مزدوری کرنے لگا۔ مجھے یاد ہے کہ پانچ پیسے یومیہ مجھے ملا کرتے تھے۔

دین سے لگاؤ کا آغاز

شہر میں کچھ اہل حدیث حضرات تھے ان میں بعض بڑے نیک اور صالح تھے، اُن کے ہاں مزدوری کرنے کا اتفاق ہوا، ان کی دینی باتیں سن سن کے دین سے لگاؤ پیدا ہوا اور اللہ تعالیٰ کی توفیق سے وہ برابر بڑھتا رہا۔ شہر میں ایک دو صاحب حضرت گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ سے تعلق رکھنے والے بھی تھے اور تھانہ بھون کے کچھ باشندے بھی ریاست میں ملازم تھے، دینی رجحان پیدا ہونے کے بعد ان حضرات سے بھی رابطہ قائم ہوگیا۔

میں ان دنوں میں مزدوری سے پیسے بچا بچا کے ان حضرات کے

مشورے سے دینی کتابیں منگواتا تھا اور پڑھوا کر سنا کرتا تھا۔ اس اثنا میں میں نے خود بھی اردو کی کچھ شدبد حاصل کرلی اور مناسبت کی وجہ سے چند ہی روز میں دینی کتابیں پڑھنے اور سمجھنے لگا۔

اللہ تعالیٰ نے چونکہ دیانت دی تھی اور ذہانت بھی، اس لئے مزدوری کی لائن میں بھی برابر ترقی کرتا رہا اور بات یہاں تک پہنچی کہ عمارتی کاموں والے خود مجھے تلاش کرنے لگے اور مزدوری کے ساتھ اپنے کاموں کی نگرانی کا کام بھی مجھ سے لینے لگے، اور اس سے میری آمدنی بھی بڑھ گئی اس کے علاوہ ٹھکیداری کا کام بھی کچھ چالو رہا۔

حضرت تھانویؒ کی زیارت اور بیعت

حضرتؒ کی کتابوں کے ذریعہ اور تھانہ بھون کے حضرات سے حالات سُن سُن کے حضرتؒ سے عقیدت ہو چکی تھی، ایک دفعہ سنا کہ فلاں دن حضرت پی پاڑ[1] تشریف لائے ہیں، وہاں وعظ بھی ہوگا۔ میں زیارت اور وعظ سننے کے شوق میں پیدل چل کے پی پاڑ پہنچا۔ حضرت کی زیارت پہلی بار وہیں ہوئی، وعظ بھی سنا اور الحمد للہ دل پر بہت اثر ہوا۔ موقع پاکر میں نے حضرت کے قریب جاکر عرض کیا میں جودھپور کا رہنے والا ہوں، محنت مزدوری کرتا ہوں، حضرت سے بیعت ہونا چاہتا ہوں، حضرت نے میری طرف دیکھا اور فرمایا کہ اچھا فلاں وقت میرے پاس آجانا، میں اس وقت حاضر ہوا حضرت نے میرے کچھ حالات دریافت فرمائے اور بیعت فرمالیا، اور اس کے بعد سے

---

[1] پی پاڑ جودھپور سے قریبا ۳۰ میل کی مسافت پر ایک قصبہ ہے۔

حضرت سے تعلق قائم ہو گیا ـــــ مجھے سب سے زیادہ مناسبت "مناجات مقبول" کی دعاؤں سے تھی، اس کے اردو اشعار کا کافی حصہ حفظ ہو گیا تھا، گھاس کرتے ہوئے بھی خوب مزے سے پڑھا کرتا تھا۔ (فرمایا) ـــ مجھے تو جو کچھ ملا ہے اسی سے ملا ہے۔

"تارک الدنیا" بننے کا غلط شوق اور داعیہ

فرمایا ـــ کچھ عرصہ کے بعد شدت سے یہ داعیہ طبیعت میں پیدا ہوا کہ دنیا اور اس کے سارے بکھیڑوں کو چھوڑ چھاڑ کے بس "فقیر" بن جائیں، بیوی تھی، کئی بچے بھی پیدا ہو چکے تھے، دادی اور ماں بھی موجود تھیں، اس لیے دل میں خود سوال پیدا ہوتا تھا ان سب کا کیا ہوگا؟ ایک دن یہ جواب دل میں آیا کہ روزی دینے والا اور پرورش کرنے والا تو تھوڑا ہی ہے اللہ تعالیٰ ہے وہی اب پرورش کر رہا ہے، وہی ان کی روزی کا کوئی انتظام کریگا، اگر آج تو مر جائے تو کیا ہوگا۔ یہ بات دل میں جم گئی اور سب کو چھوڑ چھاڑ کے تھانہ بھون بھاگ جانے کا ارادہ کر لیا۔

ایک دن سحر کے وقت گھاس کرتے کرتے (یعنی کولھو چلاتے چلاتے) سب کو سوتا چھوڑ کے بس ایک چادر اور ایک دو کتابیں ساتھ میں لے کے چل دیا، گھر میں چالیس روپے رکھے تھے، کرایہ وغیرہ کے لیے ان میں سے بس ۵ یا ۶ روپے لئے، اور دلی کا راستہ لیا، اس خیال سے کہ جودھپور میں اگر کسی نے ریل پر سوار ہوتا دیکھ لیا تو گھر والوں کو پتہ چل جائے گا اور تعاقب کیا جائے گا، ہم میل پیدل چل کر پالی یا باڑمیر سے ریل میں بیٹھا یاد ہے کہ دلی تک راستہ میں (گویا ۲۴ گھنٹہ یا اس سے بھی کچھ زیادہ میں) بس ایک

پیسہ کی مولی خرید کے کھائی تھی ـــــ دہلی پہنچ کر رات کو پہاڑ گنج میں ٹھہرا صبح کو شاہدرہ آیا جہاں سے تھانہ بھون کو ٹرین چلتی تھی، معلوم ہوا کہ اب شام کو ٹرین ملے گی، دن گزارنے کے لیے وہاں ایک مسجد میں پڑ گیا اور حضرت حاجی امداد اللہ صاحب نور اللہ مرقدہٗ کی "کلیات امدادیہ" جو ساتھ میں تھی اُسی کا مطالعہ کرنے لگا۔ اس میں ایک "تارک الدنیا" درویش کا یہ قصہ پڑھا کہ میرے ہی جیسے کسی صاحب کو "ترک دنیا" کا شوق ہوا، بیچاری بیوی کو طلاق دے کے اور بچوں کو چھوڑ کے نکل گئے اور درویشی اختیار کرلی بیوی نے مجبور ہو کر کہیں نکاح کر لیا۔ عرصہ کے بعد یہ درویش صاحب کہیں گھومتے پھرتے اس کے گھر کی طرف سے نکلے اور اپنی کسی ضرورت سے گھر پر صدا دی۔ گھر والی (جو ان کی مطلقہ بیوی تھی) نکلی۔ انھوں نے تو اس کو نہیں پہچانا لیکن اس نے ان کو پہچان لیا اور کہا میاں صاحب یہیں ٹھہر جاؤ آرام کرلو۔ انھوں نے قبول کر لیا اور اپنی جھولی وہیں رکھ کے بیٹھ گئے۔ اس نے ان سے اجازت لے کے ان کی جھولی کھولی، اس میں عام ضرورت کی کچھ چیزیں تھیں، مثلاً سوئی، دھاگہ، قینچی، نمک مرچ، آٹا، کچھ پیسے ـــــ اس نے ایک ایک کو پوچھا کہ یہ کیا ہے اور کس لیے ہے یہ میاں صاحب بتاتے رہے کہ یہ یہ ہے اور اس لیے ہے۔ آخر میں اس نے ایک دھول رسید کی اور کہا کہ بس دنیا اسی کا نام تھا اور یہ سب جو جھولی میں لیے پھرتے ہو یہ دنیا نہیں ہے ـــــ (حاجی صاحب نے فرمایا) یہ قصہ پڑھ کے عقل کام کرنے لگی۔ پھر یہ بھی سوچا کہ جب کل کو تھانہ بھون پہنچوں گا تو سب سے پہلا سوال وہاں یہ ہوگا کہ کیوں آئے ہو؟ اور اگر گھر سے کوئی تار وار پہنچا تو یہ بھی ممکن ہے کہ خوب ڈانٹ پڑے اور

کل ہی واپسی کا حکم ہو ـــــ بس یہ سوچ سمجھ کے واپسی کا فیصلہ کرلیا اور وہیں سے سیدھے جود چھپور چلے آئے۔ یہاں آ کے معلوم ہوا کہ بیوی نے تین دن سے کچھ کھایا ہے نہ پیا ہے۔ بس رونا ہے اور اللہ سے دعا ہے؛ اس وقت اندازہ ہوا کہ سب اس کی دعاؤں کا کرشمہ تھا۔

بیٹی کی شادی میں رسوم سے انکار اور اس کی وجہ سے مقاطعہ اور برادری سے اخراج

ـــــ فرمایا ـــ میری بڑی بیٹی زینب کا رشتہ ایک جگہ طے ہوگیا تھا۔ میں نے اس کے نکاح کا ارادہ کیا۔ اور یہ بھی فیصلہ کیا کہ برادری کی رسموں کی پابندی بالکل نہیں کروں گا۔ بس شریعت و سنت کے مطابق سیدھا سادہ نکاح کروں گا اور بچی کو رخصت کردوں گا۔ جو لوگ برادری میں بڑے تھے پہلے ان سے بات چیت کی تاکہ کوئی ہنگامہ اور ناگواری پیش نہ آئے۔ انھوں نے کہا کہ ناچ باجے کے لیے تو ہم تجھے مجبور نہیں کرتے لیکن برادری کی فلاں فلاں رسمیں تو تجھے ضرور ہی کرنی پڑیں گی۔ میں نے بہت سمجھایا، لیکن وہ کسی طرح نہ مانے۔ اب میں نے لڑکے والوں سے بات چیت کی کہ میرا ایسا ارادہ ہے۔ اگر تم خوشی سے اس کے لیے تیار ہو تو فلاں دن بعد مغرب نکاح ہوگا اور اگر تم بھی اس کے لیے تیار نہ ہو تو پھر خوشی سے اپنے لڑکے کے لیے کوئی دوسری لڑکی تجویز کرلو مجھے کوئی شکایت نہ ہوگی۔ انھوں نے آمادگی اور استقامت ظاہر کی۔ اور میں نے دن مقرر کردیا۔ یہ بھی کہہ دیا کہ آپ حضرات مغرب کی نماز اپنی مسجد میں پڑھ کے

آئیں اور نکاح اور رخصتی سے فارغ ہو کے عشاء اپنی مسجد میں جا کے پڑھ لیں۔ بس اتنا ہی وقت نکاح اور رخصتی میں لگے گا۔

برادری والوں نے پنچایت بلائی اور خود میرے بھائی کی زبان سے میرے مقاطعہ کا اور برادری سے خارج کئے جانے کا اعلان کرایا۔

مقررہ دن آجانے پر میں نے اپنی والدہ سے کہا کہ آج بعد مغرب زینب کا نکاح اور رخصتی ہے۔ جو کچھ ضرورت ہو بتا دو اور ضروری سامان کر دو۔ والدہ کو میری اس بات سے تعجب بھی ہوا اور اس وقت رنج بھی ہوا لیکن پھر میرے کہنے سننے سے وہ راضی اور آمادہ ہو گئیں۔ بعد مغرب لڑکے والے آئے اور میں نے نکاح کر کے اسی وقت بچی کو رخصت کر دیا۔

پھر اللہ نے برادری والوں کا وہ سارا مقاطعہ بھی ختم کرا دیا اور سب سیدھے ہو گئے۔

پہلا حج

فرمایا — سنہ ۱۳۴۱ھ میں میں نے والدہ کو ساتھ لے کر حج کا ارادہ کیا۔ کئی بچے چھوٹے چھوٹے تھے اور ان کی وجہ سے گھر پر کسی کا رہنا ضروری تھا۔ اس لیے اہلیہ کے متعلق طے کیا کہ وہ ساتھ نہ چلیں، بلکہ گھر پر رہیں۔ محمد عمر کی بیوی صرف ۸-۱۰ دن پہلے آئی تھی۔ اس لیے گھر اس بیچاری پر چھوڑا نہیں جا سکتا تھا، لیکن اہلیہ نے (جو دین میں بھی حضرت حاجی صاحب

لے حاجی صاحب مدظلہ کے بڑے صاحبزادے ہیں اور اللہ تعالیٰ نے اپنے والد ماجد کی بہت سی خوبیوں کا وارث بنایا ہے۔ ۱۲

کی رفیقہ اور بڑی صالحہ عابدہ تھیں) ساتھ چلنے کے لیے اتنا سخت اصرار کیا کہ مجبوراً میں نے طے کرلیا کہ اچھا اب اس سال نہیں جاتے، انشاءاللہ اگلے سال جب محمد عمر کی بیوی گھر سنبھالنے کے قابل ہوجائے گی تو والدہ اور اہلیہ دونوں کو ساتھ لے چلیں گے۔ بندھا بندھایا سامان بھی کھل گیا، شہر کے کئی آدمی جو ساتھ جانے والے تھے جب میں نے انھیں اپنی مجبوری بتائی تو ان اللہ کے بندوں نے بھی ارادہ فسخ کردیا۔ میں نے ہرچند سمجھایا لیکن وہ تیار نہیں ہوئے۔ میں نے بیوی سے کہا کہ دیکھو تمہاری وجہ سے یہ سب بھی رہے جاتے ہیں، اس نیک بندی کے دل پر اس کا بہت اثر پڑا اور وہ اس پر راضی ہوگئی کہ میں والدہ کو ساتھ لے کے چلا جاؤں، اب شہر کے وہ سب ساتھی بھی تیار ہوگئے۔ اور ہم روانہ ہوگئے ــــ

مناسک حج کے متعلق حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحبؒ کی کتاب "زیارۃ الحرمین" میں نے بہت پہلے سے دیکھنی شروع کردی تھی، اس کی باتیں خوب یاد ہوگئی تھیں۔ اس کے مطالعہ سے اور تجربہ کاروں کے بتانے سے یہ بات دل میں بیٹھ گئی تھی کہ اس سفر میں دو چیزیں مشکل ہیں۔ ایک نفس پر ایسا قابو کہ کسی سے لڑائی جھگڑا نہ ہو اور دوسرے یہ کہ ہر نماز وقت پر اور جماعت سے ادا ہو۔ لڑائی جھگڑے کے بارے میں تو مجھے اطمینان تھا کہ انشاءاللہ میں اس سے محفوظ رہوں گا۔ اللہ تعالیٰ نے طبیعت ہی ایسی بنائی ہے کہ ساری عمر میں کسی سے لڑائی بلکہ تکرار کی بھی نوبت نہیں آئی اور نماز کے بارے میں میں نے عزم کیا اور اللہ تعالیٰ سے دعا کی، اس مالک کا فضل ہے کہ اس دن سے آج تک بغیر عذر شرعی کے جماعت بلکہ تکبیر تحریمہ بھی فوت نہیں ہوئی ہے۔

دوسرا حج اور اہلیہ کی نہایت دردناک موت

سنہ ۴۹ھ میں اللہ تعالیٰ نے حضرت حاجی صاحب کو اتنی وسعت عطا فرمادی کہ اہلیہ محترمہ سے انھوں نے فرمایا کہ تم اپنے سب بچوں کو ساتھ لے جاکر حج کرآؤ، انھوں نے اس پر سخت اصرار کیا کہ حاجی صاحب خود بھی ساتھ چلیں چنانچہ کراچی تک حضرت موصوف کو ساتھ جانا پڑا، وہاں پہنچ کر بڑی مشکل سے وہ اہلیہ کو اس پر راضی کر سکے کہ وہ ان کے بغیر اپنے بچوں کے ساتھ ہی چلی جائیں۔ جہاز کے ساڑھے چھ ٹکٹ خرید ے گئے، اور حاجی صاحب اپنے گھر کے اس قافلہ کو رخصت کرکے کراچی ہی سے واپس تشریف لے آئے۔ یہ پورا قافلہ حج ادا کرکے بخیر وعافیت واپس آگیا۔

اگلے سال سنہ ۵۰ھ میں حضرت حاجی صاحب نے تنہا حج کرنے کا ارادہ ظاہر فرمایا۔ اہلیہ نے اب پھر ساتھ چلنے کے لیے شدید اصرار کیا، ان کو حجاز مقدس سے ایسا عشق ہوگیا تھا کہ وہ حاجی صاحب سے اصرار کرتی تھیں کہ ہجرت کرکے وہیں جا پڑیں، بہرحال جب سنہ ۵۰ھ میں حاجی صاحب نے حج کا ارادہ فرمایا تو انھوں نے بھی ساتھ چلنے کے لیے بے انتہا اصرار کیا بلکہ کراچی تک ساتھ گئیں بھی، لیکن حاجی صاحب چونکہ حج تنہا ہی کرنا چاہتے تھے اس لیے کسی طرح سمجھا بجھا کر انھیں واپسی پر راضی کرلیا اور وہ کراچی ہی سے واپس آگئیں، اور حضرت حاجی صاحب اپنے پروگرام کے مطابق تنہا ہی تشریف لے گئے۔ ماہ محرم میں حاجی صاحب کی واپسی ہونے والی تھی، اہلیہ محترمہ نے صاحبزادوں سے تقاضا کرکے مکان کے بالائی حصہ میں ایک عمارت حاجی صاحب ہی کے آرام کی نیت سے بنوائی اور اس کی

پوری کوشش کی کہ حضرت موصوف کی تشریف آوری سے پہلے عمارت بن کر تیار ہوجائے۔ نویں محرم کی شام کو عمارت مکمل ہوئی۔ مزدوروں کے جانے کے بعد اہلیہ محترمہ نے خود بھی لگ لپٹ کے اسی وقت اس کی صفائی کرائی تاکہ آج کی مبارک رات (شب عاشورا) میں نمازیں اسی نئی عمارت میں پڑھی جائیں، چنانچہ مغرب کی نماز اسی نئی چھت کے نیچے مصلیٰ بچھا کر پڑھی جسے مزدوروں نے آج ہی پاٹا تھا۔ پھر وہیں اوابین کے نوافل پڑھے، وہیں عشاء پڑھی، نماز عشاء سے فارغ ہوکر وہیں معمول کے مطابق تسبیح پڑھتی رہیں۔ اسی حال میں مصلے پر لیٹ گئیں۔ ہزار دانہ تسبیح ہاتھ میں تھی اور ہاتھ سینے پر تھا، رات کو سخت آندھی چلی چھت کا ایک پتھر جو مزدوروں نے غالباً صحیح نہیں لگایا تھا اس آندھی سے گرا اور حضرت حاجی صاحب کی اہلیہ محترمہ کے ٹھیک سر پر پڑا اور وہ وہیں اپنے مصلے پر جاں بحق ہوگئیں۔ (یہ عاشورا ۱۳۰۵ھ کی رات تھی)۔۔۔

انا للہ وانا الیہ راجعون۔ اللھم اغفر لھا وارحمھا وابلغھا منازل الشھداء۔

چند ہی دن کے بعد حاجی صاحب پہنچے اور اس سانحہ کی تفصیل معلوم ہوئی، دل پر جو گزرنی چاہیے وہ سب گزری اور خوب گزری۔ لیکن حضرت موصوف کو یہ سن کر اور دیکھ کر بڑی خوشی ہوئی کہ سب گھر والوں نے (یعنی صاحبزادوں اور صاحبزادیوں نے) اتنے عظیم سانحہ کو اپنے پیچھے بھی صبر سے برداشت کیا، سب کے دل روئے، سب کی آنکھوں نے آنسو گرائے لیکن زبان کسی کی نہیں بہکی۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اہلیہ محترمہ کی شہادت کا یہ واقعہ میں نے

حضرت حاجی صاحب کی زبان سے مختلف صحبتوں میں کئی بار سنا ہے اس کے سناتے وقت حضرت کی جو خاص کیفیت ہوتی ہے اور چہرہ پر قلبی حزن و سرور کے جو ملے جلے آثار ہوتے ہیں ان سے میرا اندازہ ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی دینی ترقیات میں اس واقعہ کو بھی خاص دخل ہے ——— اب سے کوئی تین سال پہلے حضرت موصوف کے ایک صاحبزادہ محمد عثمان مرحوم کی موت بھی بڑے دردناک طریقہ پر واقع ہوئی اور اتفاق سے اس وقت بھی حضرت موصوف حج ہی کے سفر میں تھے ——— راقم سطور کا اندازہ ہے کہ ان جانگسل حادثوں کو آپ نے جس تسلیم و رضا کی صفت کے ساتھ جھیلا اور "صبر" و "احتساب" کی نبوی ہدایت پر جس طرح عمل کیا اس نے موصوف کو وہاں پہنچا دیا جہاں شاید برسہا برس کے اختیاری مجاہدوں سے بھی نہ پہنچا جا سکتا۔

ناظرین معاف فرمائیں! میں نے حضرت حاجی صاحب کے حالات حتی الوسع انہی کی زبان سے بیان کرنے کا ارادہ کیا تھا، لیکن درمیان میں یہ میں نے اپنا ایک تاثر اور خیال بھی بیان کر دیا ——— اس کے آگے حضرت موصوف کے حالات خود انہی کی زبان سے سنئے!

اہلیہ محترمہ کی شہادت کا مذکورہ بالا واقعہ بیان فرماتے ہوئے ایک دفعہ بیان فرمایا کہ ——— میں نے سوچ سمجھ کے دوسرا نکاح نہ کرنے کا فیصلہ کیا، میرے مخلص دوستوں نے نگاہ اور نفس کی خرابی سے بہت ڈرایا اور نکاح کر لینے کا مشورہ دیا۔ ان حضرات کا مشورہ مخلصانہ تھا، اللہ تعالیٰ ان کو جزائے خیر دے، لیکن مجھے اللہ تعالیٰ کے فضل سے قوی امید تھی کہ انشاء اللہ میں ایسے کسی فتنہ میں مبتلا نہ ہوں گا، اس لیے میں نے اپنا

نصلا نہیں بدلا، میرے مالک نے ایسی حفاظت فرمائی کہ آج تک قلب میں کبھی وسوسہ بھی نہیں آیا۔ کسی اور کا کیا ذکر، جوان ہونے کے بعد اپنی کسی بیٹی، پوتی یا نواسی کو بھی میں نے نظر بھر کے نہیں دیکھا ہے۔

اشرف منزل

ذکر فرمایا ــــ کہ دل میں یہ آرزو پیدا ہوئی کہ اللہ تعالیٰ ایسا کر دیتے کہ سب بچوں کے لیے الگ الگ مکان ہوتا۔ کچھ عرصہ کے بعد معلوم ہوا کہ اتنا طویل وعریض فلاں پلاٹ فروخت ہو رہا ہے، اس کی خرید کیلئے نقد روپیہ اپنے پاس نہیں تھا، سب گھر والے خوشی سے زیور فروخت کرنے پر راضی ہو گئے، بہر حال اللہ تعالیٰ نے وہ پلاٹ دلا دیا۔ اب تعمیر کیلئے کچھ نہیں تھا، میرے ایک عزیز نے کہا کہ میرے پاس اتنی رقم رکھی ہے اسے لے کر تعمیر شروع کروا دیجئے۔ اور جب کبھی واپس کرنا آپ کے لیے آسان ہو میری رقم واپس کر دیجئے گا۔ چنانچہ وہ رقم لے کر تعمیر شروع کر دی گئی، اور ٹھیکیداری میں دوسروں کے کام بھی کراتا رہا، اللہ تعالیٰ نے اس زمانے میں ایسی غیر معمولی برکت دی کہ اپنی ہی آمدنی سے تعمیر بھی مکمل ہو گئی، اور قرضہ والی رقم بھی ادا کر دی گئی۔

راقم سطور عرض کرتا ہے کہ اسی عمارت کا نام "اشرف منزل" ہے۔ یہ پوری عمارت سرخ پتھر سے بنی ہوئی ہے (اس علاقہ میں عام طور سے عمارتیں بجائے اینٹ کے پتھر ہی سے بنتی ہیں) بالکل سادہ مگر بہت مضبوط عمارت ہے اس میں ستّرہ مکانات، چند دوکانیں، ایک مسجد اور ایک مدرسہ ہے

گویا قلعہ نما ایک چھوٹا سا محل ہے۔ حضرت حاجی صاحب کی مہارت فنی کا یہ کرشمہ ہے یا کہئے کہ ان کی کرامت ہے کہ اتنی وسیع اور ایسی مضبوط عمارت جس کے دیکھنے سے اندازہ ہوتا ہے کہ اس کی تعمیر پر کئی لاکھ روپئے صرف ہوئے ہوں گے۔ بہت تھوڑی لاگت سے تیار ہوگئی، اشرف منزل کی مسجد جس کی لاگت کا تخمینہ کوئی دیکھنے والا کسی طرح بھی ۳-۴ ہزار سے کم نہ لگائے گا۔ حضرت حاجی صاحب نے بتایا کہ اس پر صرف پندرہ سو روپے صرف ہوئے ہیں، اور وہ بھی اس لیے کہ زمین پتھریلی ہونے کی وجہ سے قریبا چار سو روپئے صرف کنویں کی تیاری میں لگ گئے گویا کنویں کی رقم الگ کر دی جائے تو مسجد صرف گیارہ سو روپے صرف ہوئے ہیں۔

حضرت حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ "اشرف منزل" تیار ہونے کے کچھ عرصہ کے بعد دل میں یہ داعیہ پیدا ہوا کہ میں ابھی سے اس کی ملکیت ان بچوں کی طرف منتقل کر دوں جن کے خیال سے یہ بنائی گئی ہے اور اپنے کو بے ملک بنا لوں۔ اس کے بارہ میں میں نے اپنے حضرت رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھ کر مشورہ چاہا، حضرت کا جواب آیا جس کا حاصل یہ تھا کہ اگر کوئی شرعی مسئلہ پوچھا جائے اور معلوم ہو تو اس کا بتانا تو ضروری ہے، لیکن ہر معاملے میں مشورہ دینا ضروری نہیں۔ آپ خود ہی غور کر لیں کہ اس زمانہ میں سب کچھ دوسروں کے حوالے کر کے خود خالی ہاتھ ہو جانا کہاں تک مناسب ہوگا۔

حاجی صاحب فرماتے ہیں کہ اس سے میں نے یہی سمجھا کہ حضرت کی رائے نہیں ہے اس لئے میں نے اپنا وہ ارادہ اس وقت فسخ کر دیا۔ کچھ عرصہ کے بعد پھر وہی داعیہ شدت سے دل میں پیدا ہوا، اب میں نے سوچا کہ حضرت نے صاف منع تو فرمایا نہیں ہے، اس لیے مشورہ کے واسطے اپنے

کسی اور بزرگ کی طرف رجوع کرنے میں کوئی حرج نہیں ہے اور اگر وہ انتقالِ ملک کا مشورہ دے دیں تو میں اس پر عمل کرلوں۔ چنانچہ میں نے حضرت مولانا عاشق الٰہی صاحب میرٹھی رحمۃ اللہ علیہ کی خدمت میں عریضہ لکھا اور اپنی بات اس میں زیادہ تفصیل سے لکھی، وہاں سے صاف جواب میری رائے کے خلاف آیا۔ میں نے پھر ارادہ ترک کردیا۔

اس کے کچھ عرصہ بعد ایسا ہوا کہ ایک دن حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ کی سیرت پڑھ رہا تھا، اس کے مطالعہ سے اپنے کو بے ملک بنا لینے کا یہ داعیہ اور زیادہ شدت سے پیدا ہوا۔ اب میں نے سوچا کہ اس میں تو کوئی شبہ نہیں کہ جو کچھ میں سوچ رہا ہوں وہ کوئی گناہ کی بات نہیں ہے، میرے اکابر میرے ضعف کی وجہ سے ازراہِ شفقت و خیر خواہی مجھے اس کا مشورہ نہیں دیتے ہیں، اگر میں توکلاً علی اللہ عزم کرلوں اور ایسا کر گزروں تو ان شاء اللہ میرے حق میں یہ بہتر ہی ہوگا ــــــ یہ سوچ کر میں نے ایک دن فیصلہ کرلیا اور لڑکوں کے سامنے اپنا یہ منصوبہ رکھا کہ میں نے یہ سوچا ہے، ان سب نے بھی یہی کہا کہ جب تک آپ ہیں یہ سب آپ ہی کی ملک میں رہنا چاہیے۔ میں نے ان سے کہا کہ میں خوب سوچ سمجھ کے عزم کرچکا ہوں اور اس کام کو اب کر دینا ہی چاہتا ہوں۔

پھر میں نے انتقالِ ملک کی اس کارروائی کو قانونی طور پر بھی مکمل کردیا اور بحمد اللہ اب میری ملکیت میں کچھ بھی نہیں ہے۔

حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ میں ابتدائی دور میں بکثرت خواب میں اپنے کو برہنہ دیکھا کرتا تھا اور اس سے طبیعت متاثر ہوتی تھی، میں نے حضرت مرحوم کو لکھا کہ میں بکثرت ایسا خواب دیکھتا ہوں، حضرت نے جواب

میں تحریر فرمایا کہ خوابوں کو زیادہ اہمیت نہیں دینی چاہیے اور کیا عجب ہے کہ اللہ تعالیٰ کسی وقت تجرد اور ماسوئی سے انقطاع نصیب فرما دے اور ان خوابوں کی تعبیر اس طرح ظاہر ہو۔

ناچیز راقم سطور عرض کرتا ہے کہ حضرت حاجی صاحب کی موجودہ زندگی ان خوابوں کی ظاہر باہر تعبیر و تفسیر ہے۔

حضرت حاجی صاحب کی موجودہ زندگی

اب حاجی صاحب کی قیام گاہ اشرف منزل کی مسجد کا ایک بہت چھوٹا سا حجرہ ہے جو شاید اسی نیت سے بنایا ہو ــــ اب وہ اس لحاظ سے کہ ان کی ملک میں اب کچھ بھی نہیں ہے گویا "فقیر" ہیں اور دعائے نبوی اللھم احینی مسکینا وامتنی مسکینا واحشرنی فی زمرۃ المساکین (جو ان کی خاص محبوب دعاؤں میں سے ہے) کی قبولیت کا زندہ نمونہ ہیں لیکن ساری اولاد چونکہ اللہ تعالیٰ کے فضل سے سعادت مند بلکہ حضرت حاجی صاحب کی دل سے معتقد بھی ہے اس لیے کچھ نہ ہونے کے باوجود گویا سب کچھ ہے۔ خیر کے مصارف میں حسب سابق اب بھی وہ خوب صرف فرماتے ہیں لیکن ہر پیسہ سوچ سمجھ کے بہتر سے بہتر مصرف میں صرف فرمانے کا اہتمام کرتے ہیں۔ اپنی ذات پر بہت ہی کم خرچ کرتے ہیں۔ فرماتے تھے کہ ۷۰ سال کی عمر ہے اب تو خدا کے فضل سے تینوں لڑکوں کے دواخانے ہیں اور وہ طرح طرح کی دوائیں بنا کر مجھے خود ہی دیتے رہتے ہیں۔ لیکن اس کے علاوہ اپنی دوا دارو میں میں نے کبھی ایک روپیہ بھی صرف نہیں کیا ہے۔ کسی حکیم ڈاکٹر کو اپنے حساب میں کبھی فیس نہیں دی۔ چونکہ ہمیشہ سے کم کھانے کی عادت

ڈال ہے اس لیے خدا کے فضل سے بیمار ہی بہت کم ہوتا ہوں، اور اگر کبھی کچھ طبیعت خراب ہوئی تو بس ۲-۳ دن لوٹ پوٹ کے کھڑا ہو جاتا ہوں ــــ لباس اتنا معمولی اور کم قیمت پہنتے ہیں کہ کپڑے کی اس شدید گرانی کے زمانہ میں پورے لباس (کرتے، پاجامے اور ٹوپی) کی لاگت غالباً ۲-۳ روپئے سے زیادہ نہیں ہوتی۔ اسی طرح کھانا بھی نہایت سادہ اور معمولی کھاتے ہیں ــــ جفاکشی اور کفایت شعاری زندگی کا مستقل اصول ہے، اور دوسروں کو بھی اس کی تاکید و تلقین فرماتے رہتے ہیں کہ جہاں تک ہو سکے جفاکشی اور کفایت شعاری کو اپنا اصول بنائیں اور اپنے ذاتی مصارف سے پیسے بچا بچا کر دینی ضرورتوں میں لگائیں اور اللہ کے حاجت مند بندوں کی ضرورتیں پوری کریں۔

چند ایمانی صفات

اخلاص وللّٰہیت

کسی انسان کی نیت اور اس کے باطن کا صحیح علم تو بس اللہ ہی کو ہوتا ہے لیکن آثار اور علامات سے کسی حد تک اندازہ بندوں کو بھی ہو جاتا ہے۔ حضرت حاجی صاحب سے بے تکلف تعلق کے بعد یہ اندازہ ہوا کہ غالباً ان کا ہر کام اور کسی کے ساتھ ان کا ہر معاملہ اور ہر برتاؤ۔ کھانا، کھلانا، پینا، پلانا، لینا، دینا، حتیٰ کہ بات کرنا سب صرف اللہ کے لیے اور ثواب ہی کی نیت سے ہوتا ہے۔ ظاہر ہے کہ یہ کتنی قابلِ رشک نعمت

ہے۔ وفی ذالک فلیتنافس المتنافسون ۰

دعا اور شکر کا غلبہ

حدیثوں سے معلوم ہوتا ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اپنے تمام احوال و اوقات میں اللہ تعالیٰ کو یاد کرتے تھے اور آپ کی یہ یاد زیادہ تر دعا اور شکر کی شکل میں ہوتی تھی۔ حضرت حاجی صاحب پر بھی ان دو چیزوں کا خاص غلبہ ہے۔ اکثر اوقات زبان دعا اور شکر میں معروف رہتی ہے اور جو کچھ اللہ تعالیٰ سے عرض کرتے ہیں، ایسی ہی سیدھی سادی زبان میں عرض کرتے ہیں اور اس طرح عرض کرتے ہیں کہ معلوم ہوتا ہے ہر کلمہ قلب کی گہرائی سے نکل رہا ہے۔ اندازہ ہوتا ہے کہ اللہ کا یہ بندہ زندگی کے کسی بھی شعبہ میں رسوم کا پابند نہیں ہے بلکہ بس مغز اور حقیقت ہی سے واسطہ ہے۔

بے نفسی

حاجی صاحب کی زندگی میں جو ایمانی صفت میری نگاہ میں بہت ہی زیادہ نمایاں ہے وہ ان کی بے نفسی ہے۔ اگر ان کو کسی ایسے کام میں جو عرف عام میں بہت ہی پست اور گھٹیا سمجھا جاتا ہو اور جس کے کرنے سے لوگوں کی نظروں میں آدمی بے وقعت ہو جاتا ہو اجر اخروی اور دینی نفع کا کوئی پہلو نظر آئے تو وہ اس کو بڑی بے تکلفی بلکہ ذوق و شوق سے کرتے ہیں اور اس کی بالکل پروا نہیں کرتے کہ کوئی کیا سمجھے گا اور کیا کہے گا۔ اس سلسلہ میں ایک واقعہ جس سے مجھے بڑا سبق ملا اور جس کا

میرے دل پر آج تک اثر ہے۔ یہاں بھی ذکر کرتا ہوں۔

یہ بات مجھے پہلے سے معلوم تھی کہ حاجی صاحبؒ نے خیر کے جو مختلف سلسلے قائم کر رکھے ہیں ان میں ایک یہ بھی ہے کہ وہ مفید دینی اور اصلاحی کتابیں کافی مقدار میں کتب خانوں سے منگوا کر اپنے پاس رکھ لیتے ہیں اور پڑھے لکھے لوگوں کو پڑھنے کے لیے دیتے ہیں۔ پھر جب اندازہ ہوتا ہے کہ یہ شخص اس کتاب سے فائدہ اٹھائے گا تو اگر مناسب سمجھتے ہیں تو اسکو وہ کتاب بلاقیمت ہدیہ کر دیتے ہیں ورنہ اس کو خریدنے کی ترغیب دے کر اس اصل قیمت پر دے دیتے ہیں جس پر وہ کتب خانہ سے آئی ہوئی ہے اور کبھی مزید نقصان برداشت کر کے اس سے بھی کم قیمت پر دے دیتے ہیں یہ سلسلہ حضرت حاجی صاحب کے ہاں غالباً ۳۰-۳۵ سال سے قائم ہے۔ میرے نزدیک تو یہی بڑی بے نفسی کی بات ہے کہ کسی شخص کو کتاب خریدنے کی ترغیب دے کر خود ہی اس کے ہاتھ کتاب فروخت کی جائے، لیکن اس سلسلہ میں اب سے ۲ سال پہلے مجھے ایک بڑا ہی حیرت انگیز اور بہت ہی سبق آموز تجربہ ہوا، حاجی صاحب نے مجھے جودھپور آنے کے لیے لکھا۔ میں نے ارادہ کر لیا اور ان ہی کے مشورے سے سفر کا پروگرام اس طرح بنا کر پہلے میں پی پارٹ اتروں اور دو دن وہاں قیام کر کے جودھپور جاؤں، حاجی صاحب نے مجھے لکھا کہ میں ان کے لیے ڈیڑھ دو سو روپے تک کی مفید اور عام فہم دینی اور اصلاحی کتابیں بھی کتب خانۂ الفرقان سے لیتا آؤں۔ چنانچہ میں نے یہ کتابیں ساتھ لے لیں۔ پروگرام کے مطابق میں پی پارٹ پہنچا تو دیکھا کہ حاجی صاحبؒ وہیں تشریف فرما ہیں۔ انھوں نے مجھ سے دریافت فرمایا کیا کتابیں ساتھ آئی ہیں؟ میں نے عرض کیا جی ہاں لایا ہوں، فرمایا تو مجھے

ابھی لے دیکھئے ! میں نے عرض کیا کہ کتابیں جو د چھوڑ دی تو جاتی ہیں ۔ اسی طرح میرے بکس میں چلی جائیں گی ۔ فرمایا نہیں مجھے یہاں ہی دے دیجئے میں نے ساری کتابیں حوالے کر دیں ۔ فرمایا جو کمیشن دیا گیا ہو وہ منہا کر کے ہر کتاب کی قیمت مجھے بتا دی جائے ۔ میرے ایک رفیق سفر نے حساب لگا کر ہر ایک کتاب کی قیمت بعد منہائی کمیشن لکھ دی ۔ یہ جمعہ کا دن تھا اس کے بعد جب میں جمعہ کی نماز کے لیے مسجد گیا تو دیکھا کہ مسجد کے احاطہ ہی میں ایک درخت کے نیچے بچھی ہوئی چادر پر وہی کتابیں اس طرح لگی ہوئی ہیں جس طرح بعض غریب کتب فروش زمین پر چادر بچھا کر اپنا کتب خانہ لگا کر بیٹھ جاتے ہیں ۔ میں نے سمجھا کہ حاجی صاحب نے یہ کتابیں کسی صاحب کے سپرد کر دی ہیں ۔ اور وہ بیچارے اس طرح ان کو فروخت کر رہے ہیں ۔۔۔ اگلے دن حاجی صاحب نے دریافت فرمایا کیا ان کے علاوہ اور کتابیں بھی ساتھ ہیں ؟ میں نے عرض کیا جی بس یہی تھیں ، فرمایا وہ تو یہیں ختم ہو گئیں ۔۔۔ بعد میں معلوم ہوا کہ وہ دوکان حاجی صاحب نے خود ہی لگائی تھی اور خود ہی بیٹھ کر "کتب فروشی" فرمائی اور طریقہ یہ اختیار کیا کہ ہر شریف لکھے شخص کو خود بلاتے اور ایک دو کتابیں اس کو دے کر فرماتے کہ ان کو دیکھو ، جی چاہے گھر لے جاؤ ، اگر مفید سمجھو اور خرید سکو تو قیمت ادا کر دینا اور اگر خریدنے کی استطاعت نہ ہو اور رکھنا چاہو تو یوں ہی رکھ لینا ، مگر مجھے آ کر بتا جانا ۔۔۔ جب مجھے یہ بات معلوم ہوئی کہ حاجی صاحب نے خود ہی بیٹھ کے کتب فروشی کی ہے اور اس طرح کی ہے تو میری طبیعت پر ایک تو اس کا بوجھ پڑا کہ میری کتابوں کی وجہ سے انھوں نے اتنی زیر باری اٹھائی اور دوسرا وسوسہ دل میں یہ آیا کہ شاید بہت سے لوگوں نے سمجھا ہو کہ بیچنے کے لیے میں اپنی کتابیں موقع

میں بھی ساتھ لیے پھرتا ہوں اور یہاں میں نے حضرت حاجی صاحب سے یہی کام لیا ہے ـــــ اب مجھے یاد نہیں کہ اس بارے میں میں نے حاجی صاحب سے کچھ عرض کیا اور موصوف نے اس کے جواب میں فرمایا یا از خود مجھ سے فرمایا ـــــ کہ حضرت! میرے پاس اتنا علم تو ہے نہیں کہ میں ایسی کتابیں لکھ کر اللہ کے بندوں کو نفع پہنچا سکوں اور اس کا ثواب حاصل کر سکوں، لیکن یہ کر سکتا ہوں کہ جہاں تک مجھ سے ہو سکے ان کی اشاعت میں اور اللہ کے زیادہ سے زیادہ بندوں تک ان کے پہنچانے میں کوشش کروں اور اس طرح اس کے ثواب میں شریک ہو جاؤں، میں بس اس لالچ میں ایسا کرتا ہوں۔

یہ بھی محفوظ ہے کہ حضرت حاجی صاحب نے جس پل پاڑ میں اس شان سے یہ "کتب فروشی" کا عمل کیا، وہاں کے لوگ عموماً حضرت موصوف کو ایک شیخ و مرشد اور جودھ پور کی ایک معزز اور باوقار شخصیت کی حیثیت سے جانتے پہچانتے ہیں، در اصل ایسا نفس کش عمل وہی شخص کر سکتا ہے جس کا نفس بالکل کٹ چکا ہو اور جس کی نظر ہر طرف سے ہٹ کے بس اللہ تعالیٰ کی رضا اور اجر آخرت پر جم گئی ہو۔

اللہ تعالیٰ اس دولت کا کوئی حصہ اس ناچیز کو بھی عطا فرمائے۔

دین کا صحیح فہم اور اعتدال

یہ پہلے ذکر کیا جا چکا ہے کہ حاجی صاحب "تعلیم یافتہ" نہیں ہیں، دینی ذوق اور دینی شعور پیدا ہونے کے بعد بس قرآن مجید پڑھ لیا ہے اور اردو کتابیں پڑھنے اور سمجھنے کی صلاحیت پیدا کر لی ہے، خط و کتابت کا

دائرہ اگرچہ بہت وسیع ہے لیکن اپنے خطوط عموماً دوسروں سے لکھاتے ہیں خود غالباً دو سطریں بھی نہیں لکھ سکتے ہیں لیکن اس ناتعلیم یافتگی کے باوجود اللہ تعالیٰ نے فہم دین کی ایسی دولت نصیب فرمائی ہے کہ بس اللہ کی شان نظر آتی ہے۔ ایک دفعہ ایک علمی اور دینی موضوع پر ناچیز راقم سطور اور رفیق محترم مولانا سید ابوالحسن علی نے ایک عرصہ تک غور کیا اور ایک نتیجہ پر پہنچے کچھ دنوں بعد میرا جودھپور جانا ہوا۔ میں نے ایک سلسلۂ گفتگو میں حاجی صاحب سے اس موضوع کا ذکر کیا۔ حاجی صاحب نے اپنی سیدھی سادی بالکل غیر علمی زبان میں وہی بات فرمائی جس پر ہم دونوں کافی غور کے بعد پہنچ سکے تھے۔ ایسے ہی حضرات کے بارہ میں عارف رومی نے فرمایا ہے ؎

بینی اندر خود علوم انبیاء   بے کتاب و بے معید و اوستا

اس صحیح فہم دین ہی کا یہ نتیجہ ہے کہ اپنے مرشد حکیم الامت حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کے صادق عشق اور نہایت گہری عقیدت کے باوجود اس طرح کا غلو بالکل نہیں ہے کہ جو اس تعلق میں اکثر پیدا ہو جاتا ہے۔ بلکہ اس طرح کے غلو کی اصلاح ان کا خاص موضوع ہے، حاجی صاحب کی گفتگو کا خاصا حصہ حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ سے متعلق ہوتا ہے لیکن بڑے سادے انداز میں بس مرحوم یا زیادہ سے زیادہ حضرت مرحوم کا لفظ استعمال کرتے ہیں اور ذکر کے ساتھ برابر دعائے مغفرت کرتے جاتے ہیں۔ — خود ہی سنایا کہ ایک دفعہ حضرت سے تعلق رکھنے والے ایک صاحب نے میری زبان سے حضرت کے لیے بار بار دعائے مغفرت سن کر فرمایا کہ مغفرت میں کیا شبہ ہے۔ میں نے ان سے کہا کہ خدا کے بندے اللہ تعالیٰ مالک الملک

اور احکم الحاکمین ہے، جس کے لیے جو چاہے فیصلہ کرے، ہم تک اسکے جلال کے سامنے لرزتے اور اس سے مغفرت کی دعا کرتے تھے۔ ہم سب اور ہمارے سب بڑے بھی دعائے مغفرت کے محتاج ہیں۔

اسی طرح سنایا کہ ایک دفعہ حجاز مقدس میں ہمارے فلاں پیر بھائی نے بڑی ناگواری کے ساتھ میرے سامنے شکایت کی کہ فلاں بزرگ کے مریدین و متعلقین اپنے شیخ کو ہمارے حضرت سے بھی بڑا سمجھتے ہیں ——— میرا جی چاہا کہ اسی وقت ان سے اس بارہ میں کچھ کہوں، لیکن میں نے سمجھا کہ اس وقت یہ بحث کرنے لگیں گے اس لیے اس وقت میں نے ان سے کچھ عرض نہیں کیا، دوسرے کسی وقت میں نے ان سے کہا کہ آپ نے مجھ سے فلاں وقت یہ بات کہی تھی، آپ نے سوچا ہے کہ اس بات سے آپ کی ناگواری اور غصہ کی وجہ اور اس کا منشا کیا ہے؟ میرے نزدیک صرف یہ ہے کہ یہ بات آپ کے جذبات کے خلاف ہے، میرا حال تو یہ ہے کہ اگر اللہ تعالیٰ امت کے ایک ایک کلمہ گو کا درجہ ایمان و عمل میں اور دین میں ہمارے حضرت سے بڑھا دے اور سب کو حضرت سے اونچے درجہ کا بلکہ شیخ عبدالقادر جیلانی سے بھی اونچے درجہ کا ولی بنا دے تو مجھے بڑی خوشی ہوگی۔ پھر فرمایا کہ میرے اس کہنے سے حضرت کا درجہ گھٹ نہیں جاتا ہے حضرت کا جو مقام اللہ کے یہاں ہے وہ ہے۔

یہ بھی خود ہی سنایا کہ تحریک خلافت کے زمانہ میں جب ہمارے اکابر میں اختلاف ہو گیا تھا تو میں حضرت مرحوم (یعنی حضرت تھانوی) کے قلب کی طرف متوجہ ہو کر دعا کیا کرتا تھا کہ اللہ تعالیٰ اس کی حفاظت فرمائے اور اس زمانہ میں کچھ پر اس چیز کا اتنا غلبہ تھا کہ میں یہ دعا گویا مضطر

ہو کر کیا کرتا تھا ـــــ ایک صحبت میں حاجی صاحب جس وقت یہ بیان فرما رہے تھے اتفاق سے اس وقت حضرت حکیم الامتؒ کے ایک مجاز بزرگ بھی تشریف فرما تھے ـــ ان کی طرف مخاطب ہو کر فرمایا ـــــ حضرت میرا یہ دعا کرنا ادب کے خلاف تو نہیں تھا؟ پھر خود ہی فرمایا کہ انشاء اللہ بالکل نہیں یہ دعا تو اس وقت میرے قلب پر وارد کی جاتی تھی۔

حضرت حکیم الامتؒ کی طرف سے اجازت

حاجی صاحب نے بیان فرمایا کہ بالکل اچانک حضرت کا والا نامہ آیا جس میں مجھے تلقین بلا بیعت کی اجازت دی گئی تھی۔ مجھ پر اس کا ایسا اثر پڑا کہ خلاف عادت چیخ نکل گئی، پھر میں نے حضرت کو لکھا کہ میرا حال یہ ہے کہ میں پڑھا لکھا کچھ نہیں ہوں، میں نے ذکر شغل بھی نہیں کیا ہے پھر میں ایک چھوٹی ذات کا آدمی ہوں یعنی تیلی، البتہ ظاہر صوم و صلوٰۃ کی پابندی اللہ تعالیٰ نے نصیب فرمائی ہے، ریا، عجب، کبر، حسد وغیرہ کے بارہ میں بھی کچھ موٹی موٹی معلومات ہیں ـــ ایسی حالت میں بھی اگر یہی مناسب خیال فرمادیں تو خدمت کے لیے حاضر ہوں۔

حضرت نے حسب معمول اسی پر جواب دیا، پڑھا لکھا نہ ہونے کے بارہ میں اور ذکر شغل نہ کرنے کے بارہ میں میں نے جو لکھا تھا اس کے متعلق حضرت نے کچھ تحریر نہیں فرمایا، اور اپنے تیلی ہونے کا میں نے جو ذکر کیا تھا اس پر تحریر فرمایا "کیا حرج ہے بعضے تیل گھی سے بھی زیادہ قیمت کے ہوتے ہیں۔"

ظاہر صوم وصلوٰۃ کی پابندی نصیب ہونے کا میں نے جو ذکر کیا تھا اس پر حضرت نے تحریر فرمایا کہ "کیا یہ تھوڑی نعمت ہے" ریا اور عجب وغیرہ کے بارہ میں جو میں نے لکھا تھا کہ اس کے متعلق کبھی موٹی موٹی معلومات ہیں، اس پر تحریر فرمایا "پھر تو نورٌ علیٰ نور"۔

اور آخر میں جو میں نے لکھا تھا کہ ایسی حالت میں بھی اگر یہی مناسب خیال فرمادیں تو خدمت کے لیے حاضر ہوں ـــــ اس پر تحریر فرمایا کہ "ہاں ضرور انشاء اللہ برکت ہوگی"۔

حضرت حاجی صاحبؒ رحمۃ اللہ علیہ کی وفات

جیسا کہ ناظرین کرام کو معلوم ہو چکا ہے کہ حضرت حاجی صاحبؒ سے متعلق یہ مقالہ اواخر ۱۳۷۹ھ میں لکھا گیا تھا۔ اس کے بعد پورے دس سال حضرتؒ ہماری اس دنیا میں رہے۔ اور جہاں تک اپنا بشری اندازہ ہے کہ اس پوری مدت میں دینی مدارج میں انتہائی تیز رفتاری سے ترقی فرماتے رہے ـــــ یہاں تک کہ ۱۳۹۰ھ مطابق جولائی ۱۹۷۰ء میں واصل بحق ہوئے۔

اللھم اغفر لہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ واکرم نزلہ ووسع مدخلہ واجعل الجنۃ مثواہ

حضرت مولانا محمد عبدالشکور صاحب فاروقی مجددی[1]

اپنے وقت کے ایک مشہور صاحب لسان اور صاحب قلم عالم اور ہفتہ وار النجم لکھنؤ کے ایڈیٹر کی حیثیت سے حضرت مولانا کا تذکرہ تو میں اپنے بچپن سے سنتا تھا لیکن زیارت کا اتفاق سب سے پہلے اب سے تقریباً ۳۸ - ۳۹ سال قبل (غالباً ۱۹۳۳ء یا ۱۹۳۵ء) جمیۃ علماء ہند کے اجلاس منعقدہ مرادآباد میں ہوا تھا، چونکہ مولانا کی شہرت ایک مقرر و مناظر اور ایک ہفت روزہ اخبار کے ایڈیٹر کی حیثیت سے تھی، اسلئے دیکھنے سے پہلے ان کے بارے میں میرا تصور یہ تھا کہ اپنی وضع قطع کے لحاظ سے وہ روشن خیال اور فیشن ایبل قسم کے مولانا ہوں گے۔ مثلاً شیروانی وغیرہ پہنتے ہوں گے، شوخ قسم کی ٹوپی اور عینک وغیرہ لگاتے ہوں گے وغیرہ وغیرہ، لیکن مرادآباد کی ایک سڑک پر راستہ چلتے ہوئے کسی واقف نے جب مجھے بتایا کہ یہ مولانا صاحب جو پیدل چلے جارہے ہیں یہی النجم کے ایڈیٹر مولانا عبدالشکور صاحب لکھنوی ہیں، تو اپنے تصور کے بالکل خلاف مولانا کی ہیئت اور وضع قطع دیکھ کر مجھے بڑی حیرت

---

[1] حضرت مولانا بھی ان بزرگوں میں تھے جن کا تذکرہ تحریث نعمت کے ذیل میں حضرت مصنف مدظلہ کے پیش نظر تھا مگر نہیں لکھا جا سکا۔ تاہم حضرت مولانا کی وفات (۱۳۸۱ھ) پر حضرت مصنف مدظلہ نے جو تاثرات ظاہر فرمائے تھے وہ بھی اس سلسلے میں شامل کئے جانے کیلئے موزوں تھے۔ یہی اہنی تاثرات کو آپ کے ارشاد پر اس سلسلے میں شامل کیا جارہا ہے۔ (مرتب)

ہوئی، بالکل پرانے قسم کے سیدھے سادے علما کی وضع تھی، سر پر وہی پرانے علما کا سا عمامہ، جسم پر جبا، ہاتھ میں لاٹھی ناعصا ـــــــ جمعیۃ کے اجلاس عام میں مولانا کی بھی تقریر کا وقت رکھا گیا تھا، آپ نے بجائے اس کے کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم کا لحاظ فرماتے ہوئے اس کے مناسب کوئی سیاسی یا نیم سیاسی یا کم از کم متکلمانہ و فلسفیانہ قسم کی کوئی علمی تقریر فرماتے، بس وعظ فرمایا، جس کا بڑا حصہ نماز سے متعلق تھا، قدرتی طور پر بہت سوں کو تعجب ہوا کہ جمعیۃ کے پلیٹ فارم پر ایسے وعظ کا کیا موقع تھا، لیکن بعد میں مجھے معلوم ہوا کہ عرصہ سے مولانا کا یہ التزام ہے کہ وہ ہر تقریر میں نماز کی خاص طور سے تلقین و تاکید فرماتے ہیں اور گویا یہ اُن پر طاری ہے ـــــــ پھر اسی سال کچھ عرصہ کے بعد ایک ضرورت سے امروہہ میرا جانا ہوا، میں ان دنوں منطق و فلسفہ اور اصول فقہ و علم کلام کی آخری کتابیں پڑھ رہا تھا اور مجھے معلوم تھا کہ مولانا آجکل مدرسہ اسلامیہ جلیلہ (امروہہ) میں صدر مدرس ہیں، میں مولانا کی زیارت کے ارادے سے، نیز اس نیت سے کہ موقع ملے گا تو کسی سبق میں بھی شریک ہو کر استفادہ کروں گا۔ مدرسہ گیا لیکن اس وقت اتفاق سے طب کی مشہور کتاب نفیسی کا آپ کے یہاں درس ہو رہا تھا، میں بیٹھا تو پورے سبق میں رہا، لیکن وہ میری دلچسپی کی چیز نہیں تھی، البتہ یہ بات اسی دن معلوم ہوئی کہ مولانا فن طب کے بھی فاضل ہیں۔ بعد میں جب حالات سے زیادہ واقف ہونے کا موقع ملا تو یہ بھی معلوم ہوا کہ آپ نے شروع میں کچھ عرصہ مطب بھی کیا تھا لیکن بعد میں اس سے بالکل ہی کنارہ کش ہو کر ان خالص علمی اور دینی کاموں میں مشغول ہو گئے جو اللہ کو آپ سے لینے تھے۔

رسمی طالب علمی سے فراغت کے بعد اتفاق سے تین سال میں اسی مدرسۂ اسلامیہ میں مدرس رہا جس سے مولانا کا تعلق رہا تھا، اس مدرسہ کے اکثر کارپرداز اور ارباب انتظام چونکہ حضرت مولانا سے عقیدت وارادت کا خاص تعلق رکھتے تھے اور اسی تعلق کی وجہ سے مولانا نے اپنے منجھلے صاحبزادے مولانا عبدالمومن صاحب فاروقی کو تعلیم کے لئے وہاں بھیج دیا تھا، اس لئے سال میں دو چار مرتبہ ضرور مولانا کی تشریف آوری امروہہ میں ہوتی تھی، اور میری طبیعت کو چونکہ مولانا سے خاص مناسبت تھی اور مذاہب باطلہ اور فرقہائے ضالہ کی تردید سے اس زمانہ میں راقم سطور کو بھی گہری دلچسپی تھی اور مولانا بھی انھیں وجوہ سے ناچیز پر خاص الخاص عنایت وشفقت فرماتے تھے اس لئے ہر ملاقات میں ربط وتعلق بڑھتا اور گہرا ہوتا رہا ——— کچھ عرصہ کے بعد غالباً سنہ ۱۳۵۰ھ میں حضرت مولانا کے ساتھ رنگون اور برما کے بعض دوسرے مقامات کا ایک طویل سفر کرنے کا بھی اتفاق ہوا۔ یہ سفر اہل رنگون کی دعوت پر وہاں ایک مذہبی فتنہ کے سر اٹھانے کی وجہ سے کرنا پڑا تھا، اس سفر میں قریباً ایک مہینہ شب وروز مولانا کے ساتھ رہنے کا اتفاق ہوا، اور ممدوح کو اب تک جو کچھ جانا اور سمجھا تھا، اسی سفر میں اس سے بہت زیادہ جانا اور سمجھا، پھر برما کے اس سفر کے غالباً ایک ہی سال بعد مولانا نے دارالمبلغین قائم فرمایا اور اس میں کام کرنے کے لئے اس عاجز کو بھی بلایا، اس موقع پر بھی چند مہینے ایک نیاز مند رفیق کی حیثیت سے حضرت مولانا کے ساتھ رہنے اور کام کرنے کا اتفاق ہوا ——— اس کے بعد بھی بار بار سفر و حضر میں مولانا کے قریب بلکہ ساتھ رہنے کا اس قدر اتفاق ہوا کہ دورِ طالب علمی کے بعد اپنے مخصوص اساتذہ کے ساتھ بھی اتنا رہنے کا اتفاق

غالباً نہ ہوا ہوگا۔

قریباً ۲۵ سال کے اس تعلق میں مولانا کی زندگی کے جن علمی عملی اور اخلاقی پہلوؤں سے میں واقف اور متأثر ہوا، کسی ترتیب کا لحاظ کئے بغیر ان میں سے چند حوالۂ قلم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا کے بارے میں اپنی معلومات اور تأثرات کو میں دو حصوں میں تقسیم کرسکتا ہوں، ایک وہ جن کا تعلق علم و تحقیق، اور تصنیف و مناظرہ کی لائن کے امتیازات سے ہے، اور دوسرے وہ جن کا تعلق عبادت گذاری اور پرہیزگاری جیسی درویشانہ صفات سے ہے۔

علمی رسوخ

ہمارے علمی اور دینی حلقوں میں بھی حضرت مولانا کی شہرت مسلک اہلسنت کے ایک لائق وکیل اور کامیاب مناظر و متکلم کی حیثیت سے رہی ہے اور اس کام کے لئے یہ واقعہ ہے کہ ہمارے اس زمانہ میں کسی خاص درجہ کے رسوخ علمی کی ضرورت نہیں رہی، اس لئے جن لوگوں کو مولانا کے قریب رہنے کا زیادہ اتفاق نہیں ہوا ان کو غالباً بالکل اندازہ نہیں ہوگا کہ ممدوح صرف مناظر و مصنف ہی نہیں بلکہ علمائے راسخین میں سے تھے، نامور اصحاب درس کی سی ٹھوس علمی استعداد اور اپنے دائرہ میں مطالعہ بہت وسیع تھا، اسی کے ساتھ قدرت نے حافظہ بے نظیر دیا تھا۔ راقم سطور نے اپنی [illegible] بہت کم حضرا

ایسے قوی الحافظہ دیکھے ہیں؎۱۔ سلامتیٔ فہم کے ساتھ ذہانت و ذکاوت سے
بھی اللہ تعالیٰ نے حصۂ وافر عطا فرمایا تھا، ان سب چیزوں کے جمع ہوجانے
کی وجہ سے خالص علمی حیثیت سے بھی مولانا کا مقام بہت بلند تھا۔

؎۱ جن لوگوں نے حضرت مولانا کی تقریریں سنی ہیں انھیں یاد ہوگا کہ صرف قرآنی آیات واحادیث ہی نہیں بلکہ شیعوں کی کتب حدیث و اسماء الرجال اور بعد کے انکے مصنفین کی کتابوں کی لمبی لمبی عبارتیں حتیٰ کہ شاہنامہ اور حملۂ حیدری کے صفحے کے صفحے مولانا بالکل حافظوں کی طرح پڑھتے تھے۔ مولانا کی اس آخری بیماری؎۲ ہی کا واقعہ ہے مجھے یہ معلوم کرنے کی ضرورت پیش آئی کہ فردوسی نے شاہنامہ میں اپنے آتش پرست [illegible] کا بڑا تذکرہ جس فخریہ انداز میں کیا ہے اور انکے مقابلہ میں صحابہ کرام کو جس طرح اس نے حقیر بے حیثیت دکھانے کی کوشش کی ہے اسکے خلاف ایرانی مسلمانوں کی طرف سے کوئی آواز اس وقت اٹھی تھی یا نہیں، مجھے یقین تھا کہ اگر کوئی آواز اٹھی ہوگی تو مولانا کو اسکا ضرور علم ہوگا، میں مولانا کی خدمت میں حاضر ہوا، بیماری اور اسکے پیدا کردہ ضعف و نقاہت کے [illegible] دونوں پہلے سے مولانا کیلئے بڑا مرحلہ تھا، وہ وقت آپکا تھا جسکے متعلق قرآن [illegible] فرمایا گیا ہے لکیلا یعلم بعد علم شیئاً؎۳ ضعف کی وجہ سے مولانا کیلئے اس وقت بات کرنا بھی مشکل تھا لیکن جب میں نے یہ بات دریافت کی تو فرمایا کہ تاریخ القصیدۃ ایرانی مسلمانوں کی طرف سے شاہنامہ کے خلاف بڑے [illegible] ساتھ آواز اٹھی تھی بصورت [illegible] ایک مستقل کتاب لکھی گئی جس کا نام ہے اور گویا شاہنامہ کا جواب ہے، جب چھپ چکی ہے، میں نے اسکا مطبوعہ نسخہ بھی دیکھا تھا، پہلے تو اسکا خاصہ حصہ یاد تھا اب کچھ یاد نہیں رہا، پھر فرمایا ہاں ایک شعر یاد آگیا اور شاید وہی آپکے مقصد کیلئے کافی ہوگا، وہ شعر ہے فردوسی کے بارے میں مصنف لکھتا ہے۔ ؎

ولش گبر و جاں گبر و گبری زباں　　زگبری بگبری زباں قصہ خواں

بہرحال مولانا اپنے غیر معمولی حافظہ کے لحاظ سے اللہ کی قدرت کی ایک نشانی تھے۔

؎ مطلب یہ ہے کہ انسان جب زیادہ بوڑھا ہو جاتا ہے تو سارا علم بھی غائب ہو جاتا ہے۔

—— علوم دین کے مختلف شعبوں میں سے علم قرآن سے خاص شغف تھا، آپ کا سلسلۂ تفسیر آیات آپ کے تدبر فی القرآن کی زندہ اور باقی رہنے والی شہادت ہے۔

تحریر و تقریر کا امتیاز

تحریر و تقریر بہت سادہ، ہر قسم کے تکلف و تصنع سے بری، حشو و زوائد سے پاک اور عبارت آرائی سے خالی مگر نہایت دلنشین ہوتی تھی میں نے کسی صاحب قلم عالم کو نہیں دیکھا جس کی تحریر و تقریر میں اتنی یکسانی اور مطابقت ہو، اگر کوئی شخص مولانا کی تقریر لفظاً بلفظاً لکھتا تو اس کو کتابی شکل میں چھاپنے کے لئے کسی لفظی ترمیم کی بھی غالباً ضرورت نہ ہوتی، تقریر میں اثر و زور پیدا کرنے کیلئے مولانا اس مبالغہ کے بھی روادار اور عادی نہیں تھے، جس کو کوئی عیب نہیں سمجھا جاتا، اسی طرح کمزور روایتیں (اگرچہ وہ علمی حلقوں میں بھی کتنی ہی مشہور ہو گئی ہوں) مولانا ان کے ذکر سے احتیاط فرماتے تھے ہماری اسی صدی کے بہت بڑے حقانی عالم حضرت مولانا حافظ عبدالرحمٰن امروہوی (جن کو حضرت مولانا محمد قاسم نانوتوی رحمۃ اللہ علیہ سے تلمذ کا شرف بھی حاصل تھا) میں نے ایک مجلس میں اُن سے خود سنا حضرت مولانا عبدالشکور صاحبؒ کے بارے میں فرماتے تھے کہ میں اُن کی اس بات کا بہت ہی معتقد ہوں اور اس کو ان کی کرامت سمجھتا ہوں کہ وعظ میں بھی کوئی بات غیر تحقیقی بیان نہیں فرماتے۔

مناظرہ کا امتیاز

قوت استدلال اور متانت و سنجیدگی آپ کے مناظرہ کا خاص

امتیاز تھا، آپ کے متعدد مناظرے چھپے ہوئے ہیں، جن لوگوں نے کبھی آپ کا مناظرہ سنا ہے، وہ ان کتابی مناظروں کے مطالعہ کے وقت بالکل ایسا محسوس کریں گے کہ حضرت مولانا بول رہے ہیں۔ محقق مناظر کبھی خلط بحث نہیں کرتا بلکہ اپنی پوری قوت اس پر صرف کرتا ہے کہ زیر بحث مسئلہ روشنی میں آجائے مولانا کا بالکل یہی طرز تھا، اسی لئے وہ فریق مخالف کی خلط کی کوششوں کو چلنے بھی نہیں دیتے تھے، اور وہ ہزار کوششوں کے باوجود خلط بحث میں کامیاب نہیں ہو سکتا تھا، بحث کے مرکزی نقطہ کو مولانا ہر تقریر میں ضرور دہرا دیتے تھے جس کا نتیجہ یہ ہوتا تھا کہ عام سامعین کو بھی وہ خاص بات حفظ ہو جاتی تھی، فن کے لحاظ سے یہ مناظر کا کمال ہے اور احقاق حق کے مقصد کیلئے بھی یہ ضروری اور ناگزیر ہے۔

خاص موضوع

اگرچہ حسب ضرورت مولانا نے مناظرے عیسائیوں سے بھی کئے آریہ سماجیوں اور قادیانیوں سے بھی، اور ان کے علاوہ دوسرے فرقہائے ضالہ سے بھی، لیکن مولانا کا خاص موضوع شیعی حملوں سے صحابۂ کرام اور مسلک اہلسنت کی حفاظت اور ان کا دفاع اور مذہب تشیع کی ضلالتوں کو واضح کر کے حجت حق قائم کرنا تھا، اور یہ وہ موضوع ہے جو ہندوستان کے خاص تاریخی حالات کی وجہ سے اس ملک کے اکابر علماء و مصلحین کی علمی اور دینی کوششوں کا صدیوں سے خاص موضوع رہا ہے ـــــ اب سے تقریباً ساڑھے تین سو سال پہلے گیارہویں صدی ہجری میں تاریخ اسلام کے عظیم ترین مجدد امام ربانی شیخ احمد فاروقی مجدد الف ثانی رحمۃ اللہ علیہ اور انکے

بعد بارہویں صدی میں حضرت شاہ ولی اللہؒ اور ان کے معاصر بیہقیٔ وقت قاضی ثناء اللہ پانی پتی رحمۃ اللہ علیہ اور ان کے بعد استاذ الہند شاہ عبد العزیز محدث دہلویؒ اور ان کے تلامذہ، اور ان کے بعد حضرت مولانا محمد قاسم نانوتویؒ اور حضرت مولانا رشید احمد محدث گنگوہی رحمۃ اللہ علیہ، الغرض اپنے اپنے زمانہ میں اُن سب ہی حضرات کی دینی اور اصلاحی کوششوں کا خاص موضوع اور ہدف (اُن خاص تاریخی اسباب کی وجہ سے جن کی تفصیل کا یہ موقع نہیں) یہی مسئلہ رہا ہے ـــــ جس شخص نے اس موضوع سے متعلق ان اکابر کی کتابیں دیکھی ہیں اور حضرت مولانا عبد الشکور صاحبؒ نے اس سلسلے میں جو کام کیا ہے، اس سے بھی وہ واقف ہے، اس کو اعتراف کرنا پڑے گا کہ مولانا نے اس موضوع کو اپنے ان پیش رَو اکابر سے کئی گنا زیادہ نکھارا، اور ایک سعادتمند بیرو کار کی طرح ان کے کام کی تکمیل کر کے ان کی روحوں کو شاد اور مطمئن کیا ـــــ اس ناچیز کا ذاتی تأثر یہ ہے کہ مولانا کی تحقیق و تنقیح نے اس دائرے کے کئی بنیادی مسئلوں کو جو علمی اور نظری تھے اور ان کو صرف اہل علم ہی سمجھ سکتے تھے ایسا بدیہی بنا دیا کہ عامیوں کیلئے بھی ان کا سمجھنا آسان ہوگیا۔

ردِ شیعہ کے مشغلہ میں مولانا کی نیت اور اس موضوع سے انکے غیر معمولی شغف کا اصل باعث

مولانا نے ایک صحبت میں مجھ سے خود فرمایا کہ صحابہ کرامؓ کے ناموس کی حفاظت اور ان کے خلاف کئے جانیوالے پروپیگنڈے کی تردید بجائے خود

بھی عبادت بلکہ فریضہ ہے لیکن میں جو اس کام کو درجۂ اول کی اہمیت دیتا ہوں اور اس میں اس طرح مشغول ہوں، خدا گواہ ہے کہ اسکی وجہ یہ ہے کہ صحابہ کرامؓ کے مجروح ہو جانے کے بعد قرآن مجید اور نبوت محمدی سب مشکوک ہو جاتے ہیں۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور قرآن کے بارے میں جو کچھ ہم جانتے ہیں وہ صحابہ کرامؓ ہی کے واسطے سے جانتے ہیں، اگر اس سلسلے کی پہلی کڑی اور روایت کے ناقلوں کی پہلی صف ہی ناقابل اعتبار ہو گئی تو قرآن اور سارا دین مشکوک ہو جائے گا۔ اور ہمارے پاس اُن کے بارے میں یقین کی کوئی علمی بنیاد نہیں رہے گی۔ بہر حال میں صحابہ کرامؓ کی یہ حمایت اور مدافعت اور اُن کے دشمنوں کا یہ مقابلہ قرآن مجید اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی حفاظت کی نسبت ہی سے کرتا ہوں اور مجھے اپنی مغفرت کی سب سے زیادہ امید اپنے اسی عمل سے ہے۔

غیر معمولی اعتدال

مناظرہ کے میدان میں رہنے کے بعد راہ اعتدال پر قائم رہنا بڑی مشکل بات ہے، اللہ ہی اگر توفیق دے اور دستگیری فرمائے تو آدمی اعتدال پر قائم رہ سکتا ہے ورنہ اس میدان میں قدم رکھنے والے کا افراط یا تفریط میں مبتلا ہو جانا ایک عام بات اور اکثری تجربہ ہے، ناچیز نے اس پہلو سے حضرت مولانا کو بہت ہی ممتاز اور باتوفیق پایا۔ صرف ایک مقولہ نقل کرتا ہوں جو مولانا سے میں نے خود اپنے کانوں سے سنا ہے۔ ایک موقع پر حضرت علی مرتضیٰؓ اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہما کے درجات کا فرق بیان کرتے ہوئے ارشاد فرمایا۔

حضرت علی مرتضیٰ رضی اللہ عنہ سابقین اولین کی پہلی صف کے بھی اکابر میں ہیں اور حضرت معاویہ رضی اللہ عنہ اگرچہ صحابی ہونے کی حیثیت سے ہمارے سرتاج ہیں لیکن حضرت علی مرتضیٰؓ سے ان کو کیا نسبت ؟ ان کی مجلس میں اگر صف نعال میں بھی حضرت معاویہؓ کو جگہ مل جائے تو ان کے لئے سعادت اور باعث فخر ہے۔

یہاں تک جن خصوصیات کا میں نے ذکر کیا ان کا براہ راست تعلق مولانا کی عالمانہ یا مناظرانہ حیثیت سے ہے، اگرچہ ان کی عارفانہ اور درویشانہ حیثیت کا بھی اُن میں خاصا حصہ ہے، اب دو چار باتیں میں وہ عرض کرتا ہوں جن کا تعلق خاص طور سے اس دوسری حیثیت سے ہے۔

نماز کے ساتھ قلبی تعلق اور نسبت نبویؐ

نماز اس حیثیت سے کہ ہر مسلمان پر فرض ہے اور اس گئی گذری حالت میں بھی ہر وہ مسلمان اس کا پابند ہے جس کو خوف خدا اور فکر آخرت کا کوئی ذرہ بھی نصیب ہے۔ بہر حال اس حیثیت سے نماز ایک عوامی چیز ہے لیکن نماز کے ساتھ دل کا لگاؤ، اس کا حد درجہ اہتمام اور فکرمندی اور لوگوں میں نماز کی طرف سے بے اعتنائی اور بے پروائی دیکھ کر دل کڑھنا اور بے چین ہونا بلاشبہ یہ کیفیات رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم اور آپ سے بھی پہلے کے جد امجد سیدنا خلیل اللہ علیہ الصلوٰۃ والسلام کی خاص نسبت اور وراثت ہے انھوں نے اپنے بیوی بچوں کو وادیٔ غیر ذی زرع میں بسا کر اللہ تعالیٰ سے عرض کیا تھا۔

رَبَّنَا إِنِّي أَسْكَنْتُ مِنْ	اے میرے پروردگار میں نے اپنی
ذُرِّيَّتِي بِوَادٍ غَيْرِ ذِي	نسل کو تیرے مقدس ومحترم گھر کے
زَرْعٍ عِنْدَ بَيْتِكَ الْمُحَرَّمِ	پاس بن کھیتی والی وادی میں بسا
رَبَّنَا لِيُقِيمُوا الصَّلٰوةَ	دیا ہے اے میرے رب تاکہ وہ نماز قائم کریں۔

اور عرض ومعروض اور مناجات کے اسی سلسلے کے آخر میں دعا کی تھی۔

رَبِّ اجْعَلْنِي مُقِيمَ الصَّلٰوةِ	میرے رب مجھے بنالے نماز کا قائم
وَمِنْ ذُرِّيَّتِي رَبَّنَا وَ	کرنیوالا اور میری نسل کو بھی یہ چیز
تَقَبَّلْ دُعَاءِ۔	نصیب فرما پروردگار میری دعا قبول فرما۔

اور خاتم النبیین صلی اللہ علیہ وسلم نے اس دنیا سے رخصت ہوتے وقت جو آخری وصیت امت کو فرمائی تھی اس میں سب سے پہلے نماز ہی کی تاکید تھی۔ بہرحال نماز کے ساتھ فکرمندی کا یہ تعلق اللہ کے خلیل حضرت ابراہیم اور اس کے حبیب پاک حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی خاص وراثت ہے اور اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو اس سے حصہ وافر عطا فرمایا تھا، اوپر ذکر کر چکا ہوں کہ ایک مدت تک مولانا کا یہ التزام رہا کہ ہر وعظ میں نماز کی تلقین وتاکید ضرور فرماتے تھے، بلکہ اس دور میں نماز ہی ان کے مواعظ کا خاص موضوع ہوتا تھا۔ اس عاجز نے خود بھی نماز کے بارے میں مولانا کا وعظ سنا ہے صاف محسوس ہوتا تھا کہ جو کچھ فرمارہے ہیں بے چین دل کی گہرائی سے فرمارہے ہیں۔ حضرت مولانا نے غالباً اسی زمانہ میں نماز کے موضوع پر ایک بڑی موثر مستقل کتاب بھی "کتاب الصلوٰۃ" کے نام سے لکھی تھی اس

میں مولانا نے قرآن مجید کی ایک سو ایک آیات نماز سے متعلق جمع فرمائی ہیں، اس عاجز کو اعتراف ہے کہ مولانا کی اسی کتاب کے مطالعہ سے معلوم ہوا کہ قرآن مجید میں کن کن عنوانات سے نماز کی طرف دعوت دی گئی ہے، اس کتاب میں آیات کے علاوہ نماز سے متعلق تاکیدی اور ترغیبی و ترہیبی حدیثیں بھی اور آخر میں ائمہ امت کے ارشادات بھی ذکر فرمائے ہیں جیسا کہ میں نے عرض کیا یہ کتاب نہایت موثر ہے اور علمی حیثیت سے بھی اس کا پایہ بلند ہے، مجھے کچھ ایسا یاد آتا ہے کہ حضرت مولانا نے اپنی اس کتاب کی یا اُس کے کسی حصہ کی کتابت بھی خود فرمائی تھی (حضرت مولانا نہایت جمیل الخط تھے اور بدخط تحریر سے گرانی ہوتی تھی) _____ لکھنؤ کے متعدد واقف حضرات سے میں نے سُنا ہے کہ یہاں نماز کا رواج بہت کم تھا بہت سی مسجدیں غیر آباد تھیں، الحمدللہ اب یہ بات نہیں ہے، ان حضرات نے بتایا کہ اس میں سب سے بڑا دخل حضرت مولانا مرحوم کے مواعظ کا ہے۔

قرآن مجید کے ساتھ خاص تعلق

اس سے ملتی جلتی دوسری قابل ذکر خصوصیت قرآن مجید کے ساتھ حضرت مولانا کا خاص شغف اور تعلق ہے، اللہ تعالیٰ نے چھ صاحبزادے عطا فرمائے تھے (جن میں سے دو کا سانحۂ انتقال ہو چکا ہے) مولانا نے اُن سب کو قرآن مجید حفظ کرایا[۱]۔ ہر شخص سمجھ سکتا ہے کہ اس زمانہ میں ایسا دل

---

[۱] بعد میں تحقیق کرنے پر معلوم ہوا کہ ان میں سے دو بھائی اپنی بیماری وغیرہ کی وجہ سے پورا قرآن مجید حفظ نہیں کر سکے تھے، اگرچہ مولانا نے اس کے لئے پوری کوشش فرمائی۔ ۱۲

کریگا جس کو اللہ کی کتاب پاک کے ساتھ غیر معمولی شغف ہو، مولانا پہلے خود حافظ قرآن نہیں تھے، لیکن اب سے چند ہی سال قبل بالکل بڑھاپے کے دور میں خود محنت کر کے حفظ کیا اور زندگی کے ان چند آخر سالوں میں تو بس تلاوت قرآن ہی ان کا دن رات کا شغل اور وظیفہ تھا، گذشتہ آٹھ دس سال میں صبح یا شام جس وقت بھی حاضری کا اتفاق ہوا یہی دیکھا کہ قرآن مجید سامنے ہے اور اس کی تلاوت میں مشغول ہیں حالت یہ ہوگئی تھی کہ اپنے خاص اہل محبت اور نیاز مندوں تک کا زیادہ آنا اور دو چار منٹ سے زیادہ بیٹھنا باعث گرانی ہونے لگا تھا، اس گرانی کا اظہار زبان سے تو میں نے کبھی نہیں سنا لیکن دو تین ہی منٹ کے بعد چہرے سے محسوس ہونے لگتا تھا کہ انھیں شغل تلاوت کا یہ انقطاع شاق ہو رہا ہے اور وہ منتظر ہیں کہ آنے والا رخصت ہو تو وہ اپنے شغل میں مشغول ہوں۔

اہل وعیال سے محبت اور انکی جدائی پر صبر والی نبوی وراثت

اپنے اہل وعیال سے محبت بھی انسانی فطرت کا تقاضہ اور رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وراثت ہے۔ حدیث و سیرت پر جن لوگوں کی نظر ہے وہ جانتے ہیں کہ اس بارے میں رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کا کیا حال اور مقام تھا کتب حدیث میں مذکور ہے کہ نواسوں اور نواسیوں میں سے کوئی بچہ منبر پر خطبہ دیتے وقت قریب آگیا تو آپ نے اسی حالت میں اسے گود میں اٹھا لیا بلکہ کبھی کبھی تو انھیں گود میں لے کر آپ نے نماز بھی پڑھی ہے اسی طرح ازواج مطہرات کے ساتھ آپ کی ملاطفت اور حسن معاشرت مثالی تھی، اللہ تعالیٰ نے حضرت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی

اس وراثت سے بھی وافر حصہ عطا فرمایا تھا، اولاد اور اولاد کی اولاد کے ساتھ آپ کے دل کا لگاؤ بھی شامل تھا لیکن دو جوان صاحبزادوں (مولانا حافظ عبدالغفور صاحب مرحوم اور مولانا حافظ عبدالعزیز صاحب مرحوم) اور جوان العمر اکلوتی چہیتی صاحبزادی اور ان سے پہلے ان کی والدہ مرحومہ کے انتقال کے وقت مولانا کو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کے اس حال اور ارشاد کا کامل نمونہ دیکھا گیا جو عہد نبوت کے اکلوتے صاحبزادے سیدنا ابراہیم (علی ابیہ علیہ الصلوٰۃ والسلام) کی وفات کے وقت آپ کا حال اور قال دیکھا اور سنا گیا تھا، حدیث شریف میں ہے کہ ان کے انتقال پر آپ نے فرمایا۔

العین تدمع والقلب	آنکھ آنسو بہا رہی ہے اور دل کو رنج
یحزن ولا نقول الا ما	اور صدمہ ہے اور زبان وہی بولیگی
یرضی بہ ربنا انا للہ وانا	جس سے میرا مالک راضی ہو انا للہ وانا
الیہ راجعون	الیہ راجعون۔

ایک عارف کامل کی شہادت

آخر میں اس دور کے ایک مسلم عارف بلکہ یقین و معرفت کے امام حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ایک ارشاد پر تاثرات کے اس سلسلہ کو ختم کرتا ہوں۔

حضرت مولانا اپنے وصال سے ٹھیک ایک سال پہلے رجب ۱۳۶۲ھ میں ایک بڑی جماعت کے ساتھ لکھنؤ تشریف لائے تھے اور قریباً ایک ہفتہ دارالعلوم ندوۃ العلماء میں قیام فرمایا تھا، ایک روز دارالعلوم کی مسجد کے وضو خانہ میں وضو فرما رہے تھے، دارالعلوم کے دو تین اساتذہ بھی ساتھ

بیٹھے وضو کر رہے تھے، مولانا معین اللہ صاحب ندوی، موجودہ ناظم شعبۂ تعمیر و ترقی دارالعلوم ندوۃ العلماء) مولانا کے بالکل سامنے بیٹھے وضو کر رہے تھے۔ حضرت مولانا کی ان پر شفقت و عنایت کی خاص نظر تھی، ان سے مخاطب ہو کر فرمایا" میاں مولوی معین اللہ! حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کو جانتے ہو؟ انھوں نے عرض کیا، ہاں حضرت جانتا ہوں، زیارت بھی کی ہے فرمایا: نہیں تم نہیں جانتے" پھر فرمایا" وہ امام وقت ہیں"۔ ______

لکھنؤ کے اسی سفر میں ناچیز راقم سطور بھی حضرت مولانا محمد الیاس رحمۃ اللہ علیہ کے ہمرکاب تھا، ایک صحبت میں (اب یاد نہیں کس سلسلہ میں) خود مجھ سے فرمایا کہ ان مشرقی دیار میں حضرت مولانا عبدالشکور صاحب کا وہی مقام ہے جو ہمارے مغربی دیار میں ہمارے حضرت تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا تھا۔ (حکیم الامۃ حضرت مولانا تھانوی رحمۃ اللہ علیہ کا وصال چند ہی روز پہلے ہو چکا تھا) آخر میں ناچیز راقم سطور اپنے ناظرین سے خصوصیت کے ساتھ درخواست کرتا ہے کہ حضرت مولانا کے لئے مغفرت و رحمت اور رفع درجات کی اور تمام محبین و متعلقین کے لئے صبر و اجر اور ان کے نقش قدم پر چلنے کی خاص طور پر دعا فرمائیں، یہ اُن کا اس ناچیز پر ذاتی احسان ہوگا۔